انکارِ حدیث سے انکارِ قرآن تک

تالیف: مفسرِ قرآن فضیلۃ الشیخ عبدالسلام رستمی

نظرِ ثانی: مولانا مفتی عبدالولی خان

دارالسلام
DARUSSALAM

انکارِ حدیث سے انکارِ قرآن تک

تالیف: مفسرِ قرآن فضیلۃ الشیخ عبدالسلام رستمی

نظرثانی: مولانا مفتی عبدالولی خان

پوسٹ بکس:22743 الریاض:11416 سعودی عرب فون:4043432-4033962 1 00966 فیکس:4021659
E-mail: darussalam@awalnet.net.sa - riyadh@dar-us-salam.com
Website: www.darussalam.com

● الریاض۔العلیا۔ فون:4614483 01 فیکس:4644945 ● الملز فون:4735220 01 فیکس:4735221 ● سویلم فون:2860422 01
● مندوب الریاض: موبائل:0505196736-0503459695 ● قصیم (بریدہ): فون/فیکس:3696124 06 موبائل:0503417156
● مکہ مکرمہ: موبائل:0506640175-0502839948 ● مدینہ منورہ فون:8234446 04 فیکس:8151121 موبائل:0503417155
● جدہ فون:6879254 02 فیکس: 6336270 ● الخبر فون:8692900 03 فیکس:8691551
● ینبع البحر فون/فیکس:3908027 04 موبائل:0500887341 ● خمیس مشیط فون/فیکس:2207055 07 موبائل:0500710328

شارجہ فون:5632623 6 00971 امریکہ ● ہوسٹن فون:7220419 713 001 ● نیویارک فون:6255925 718 001
لندن فون:4885 539 208 0044 آسٹریلیا فون:4040 9758 2 0061

لاہور 36- لوئر مال، سیکرٹریٹ سٹاپ
فون:37110081-37111023-37232400-37240024 42 0092 فیکس:37354072 موبائل:0322-8484569
Website: www.darussalampk.com E-mail: info@darussalampk.com
● غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور فون:37120054 فیکس:37320703 موبائل:0321-4439150
● موں مارکیٹ اقبال ٹاؤن فون:37846714 موبائل: 0321-4156390
● Y-260 بلاک کمرشل ایریا، فیز III ڈیفنس، لاہور فون: 35692610 موبائل:0321-4212174
اسلام آباد F-8 مرکز، فون/فیکس: 2281513 موبائل:0321-5370378
کراچی مین طارق روڈ، (D.C.HS / 110,111-Z) ڈالمن مال سے (بہادر آباد کی طرف) دوسری گلی، کراچی
فون:34393936 فیکس:34393937 موبائل:0321-2441843

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اللہ کے نام سے (شروع) جو نہایت مہربان، بہت رحم کرنے والا ہے۔

مضامین

باب 4

باب 5

عرض ناشر

جب اللہ تعالیٰ نے خاتم النبیین جناب محمد ﷺ کو منصب نبوت پر فائز کر کے عالمِ انسانیت کی رہنمائی کی ذمہ داری سونپی تو آپ نے کوہ صفا کی بلندیوں سے انسانوں کو پکارا اور قولُوا لا إلٰه إلا اللّٰه کی صدا بلند کر کے وہ صراطِ مستقیم اُجاگر کر دی جس کی تلاش میں انسان صدیوں سے بھٹک رہا تھا۔

آپ نے مخاطبین کو یاد دلایا کہ میں کہیں باہر سے نہیں آیا۔ اسی مکہ مکرمہ میں پیدا ہوا ہوں۔ تمھی میں سے ہوں۔ تمھاری ہی بستی میں رہتا ہوں۔ میں تم سے کبھی چھپ کر نہیں رہا۔ تم نے میرا بچپن بھی دیکھا ہے، میری جوانی کے دن بھی تمھاری آنکھوں کے سامنے گزرے ہیں۔ میری زندگی کھلی کتاب ہے۔ تم میں سے کون ہے جو میری بے داغ زندگی کا شاہد نہیں ہے؟ بتاؤ کیا میں نے اپنی چالیس سالہ زندگی میں کبھی کوئی جھوٹ بولا ہے؟ سامعین نے بیک آواز بلند آہنگی سے جواب دیا کہ آپ صادق ہیں، آپ امین ہیں، ہم نے آپ کو کبھی جھوٹا نہیں پایا۔

یہ تھی محمد ﷺ کی وہ صداقت مآب شخصیت جس کی سچائی پر کفار و مشرکین نے بھی تصدیق کی مہر لگا دی...... یہاں پہنچ کر ہم پوری طرح مطمئن ہو جاتے ہیں کہ جس معظم انسان نے زندگی بھر کبھی انسانی معاملات میں جھوٹ نہیں بولا یقیناً وہ یگانہ انسان اللہ کی ذاتِ عالی اور عالمِ آخرت کے بارے میں بھی غلط بیانی نہیں کر سکتا، پس حضرت محمد ﷺ کا ہر قول اور ہر عمل سچائی کا ابدی سرچشمہ اور ہمارے ایمان کی بنیاد ہے۔

پس دین حنیف کی اصل بنیاد ہی یہ ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی ہر بات حجت ہے۔ ان کا ہر عمل ہمارے لیے واجب العمل ہے۔ حدیث کی روشنی کے بغیر قرآن کریم کے صحیح مطالب ومفاہیم کبھی سمجھ میں نہیں آسکتے۔ جولوگ قرآن کو ماننے کا دعویٰ کرتے ہیں اور حدیث کا انکار کرتے ہیں، وہ اپنے دعوے میں جھوٹے ہیں۔ قرآن کریم میں محمد ﷺ کے جو فرائض عظیمہ بتائے گئے ہیں ان میں یعلمھم الکتاب والحکمۃ کا فرض بھی شامل ہے۔ علمائے حق متفق ہیں کہ اس آیت میں ''حکمت'' کا مطلب سنت رسول ﷺ ہے۔ اس لیے اتباعِ حدیث کے بغیر اتباعِ قرآن کی جستجو دیوانے کا خواب ہے۔

قرآن وحدیث کے نور حقیقت سے دور ہوکر تاویلات میں بھٹکنے کا راستہ خارجیوں نے اپنی سرکشی کی وجہ سے اختیار کیا۔ بعد ازاں جہم بن صفوان کا فرقہ جہمیہ اور واصل بن عطا کے پیروکار معتزلہ یونانی علوم کی نُدرت سے متاثر ہوکر انکار حدیث کے فتنے میں مبتلا ہوئے۔ مگر عالم اسلام کے سواد اعظم نے ان لوگوں کے افکار وعقائد کبھی قبول نہیں کیے۔

انگریزوں نے ہندوستان پر غلبہ پایا تو انھوں نے اپنے سامراجی مقاصد کی کامیابی کے لیے ہندوؤں اور مسلمانوں کے افکار وعقائد مسخ کرنے کا پروگرام بنایا۔ ہندو دھرم انھیں بے ضرر نظر آیا اس لیے اس سے انھوں نے کوئی تعرض نہ کیا مگر مسلمانوں کی دینی سپرٹ (Spirit) غیرت وحمیت اور جذبۂ جہاد سے وہ خوف محسوس کرنے لگے۔ انھوں نے اسلام سے مسلمانوں کا تعلق کمزور کرنے کے لیے اپنے آلہ کار ڈھونڈے تو انھیں سر سید اور مرزا غلام احمد قادیانی جیسے لوگ مل گئے۔ مرزا غلام احمد قادیانی نے نبوت کا دعویٰ کرکے اسلام میں نقب لگانے کی کوشش کی لیکن برصغیر کے مسلمانوں نے اسے حقارت سے مسترد کردیا۔ سر سید نے قرآن اور حدیث کے مسلمہ حقائق کو اپنی عجیب وغریب تاویلات سے مسخ کرنے کی مہم شروع کی تو علامہ شبلی، مولانا حالی، ڈپٹی نذیر احمد اور دیگر علمائے حق ان سے متفق

نہیں ہوئے اور سواد اعظم نے ان کے گمراہ کن افکار کو کبھی قبول نہیں کیا۔ مگر سرسید کی تحریروں کے نتیجے میں مولوی چراغ علی، نیاز فتح پوری، اسلم جیراج پوری، علامہ مشرقی اور غلام احمد پرویز جیسے خودسر اور گمراہ قلمکار پیدا ہو گئے۔ ان لوگوں نے حسبنا کتاب اللّٰہ کے نعرے کی آڑ پکڑی۔ عقل کی غلامی کا سبق دیا۔ حدیث کی صداقت کو جھٹلایا اور اپنے گمراہ کن نظریات پھیلانے کے لیے زور دیا کہ حدیث کو عقل کی روشنی میں پرکھا جائے۔ جو حدیث عقل کی کسوٹی پر پوری نہ اترے اسے ترک کر دیا جائے۔ افسوس! ان لوگوں نے کسی حقیقت کے ماورائے عقل ہونے یا خلافِ عقل ہونے کے لطیف فرق کا ادراک و امتیاز بھی نہیں کیا۔ آج امریکہ میں ایک واقعہ ظہور میں آتا ہے تو ہم ٹیلی ویژن پر گیارہ ہزار میل دور بیٹھے بیٹھے اپنے ہی وطن میں اس واقعے کے سارے مناظر دیکھ لیتے ہیں۔ سائنسی رموز سے بے خبر لوگوں کے لیے یہ واقعہ ماورائے عقل ہو تو ہو مگر کیا یہ خلافِ عقل بھی ہے؟ ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ پس کوئی حقیقت محض اس لیے معدوم نہیں ہو سکتی کہ وہ ہماری عقل سے بالا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں اکثر منکرینِ حدیث نے ٹھوکر کھائی اور گمراہی کے گڑھے میں گر پڑے۔

علمائے حق نے فتنۂ انکار حدیث کے تباہ کن نتائج کا فوراً اندازہ کر لیا اور زمانے اور زندگی کے ہر موڑ پر منکرینِ حدیث کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ انھوں نے ناقابل تردید دلائل و براہین سے ثابت کیا کہ جو لوگ صرف قرآن کریم کی اتباع کرنے اور حدیث کو نظر انداز کرنے کے علمبردار ہیں وہ فی الحقیقت خود قرآن کریم ہی کے منکر ہیں۔ ایسے جلیل القدر علماء کی کہکشاں میں زیر نظر کتاب کے مصنف مولانا سید عبدالسلام رستمی ﷾ کا نام ایک نادر اضافہ ہے۔ انھوں نے ساڑھے پانچ سو صفحات کی اس مدلل کتاب میں چار سو سے زیادہ عنوانات کے تحت منکرین حدیث کے موقف کے ایک ایک جُز کا جائزہ لیا ہے اور قرآن کریم، احادیث

اور تعاملِ صحابہ رضی اللہ عنہم کی روشنی میں منکرین حدیث کے سارے حربے بے کار کر دیے ہیں۔

محترم مصنف نے سر سید کی تفسیر قرآن، اسلم جیراجپوری اور غلام احمد پرویز کی کتابوں کی اچھوتی بانگیاں بیان کی ہیں ...... مثلاً سر سید کہتے ہیں کہ اصحاب فیل کنکریوں سے ہلاک نہیں ہوئے بلکہ وہ اس لیے مر گئے کہ ابرہہ کے لشکر میں چیچک کی وبا پھوٹ پڑی تھی۔ اسی طرح عصائے موسیٰ علیہ السلام کا بھی کوئی معجزہ ظہور میں آیا نہ دریائے نیل کا پانی پھٹا بلکہ دریا مدوجزر کی حالت میں تھا۔ پانی اُترا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم پار اُتر گئی۔ اسلم جیراجپوری کا پاکھنڈ یہ ہے کہ جب قرآن نے الیوم اکملت لکم دینکم کا اعلان کر دیا تو اس کے بعد حدیث کو ماننے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا...... غلام احمد پرویز اپنے معنوی استادوں سے بھی آگے نکل گئے۔ وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ جبرئیل علیہ السلام کا کوئی وجود نہیں۔ محض آگہی کی ایک روشنی تھی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے روبرو جھلملاتی تھی اور آپ خبردار ہو جاتے تھے کہ اب وحی اترنے والی ہے۔ بقول پرویز بس اسی کیفیت کا نام جبرئیل ہے۔

جلیل القدر مصنف نے پرویز کی تفسیر، سلیم کے نام خطوط اور دیگر تصنیفات کے نظریات و خیالات کے حوالے دے کر ان کی ذہنی آوارگی کا مکمل پوسٹ مارٹم کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ منکرین حدیث کے موقف کی بنیاد یہ ہے کہ عقل ہی ہماری سب سے بڑی رہبر ہے۔ عقل کی کسوٹی پر جو حدیث پوری نہیں اُترے گی، ہم اُسے تسلیم نہیں کریں گے۔ فاضل مصنف نے ان لوگوں کو مسلمہ دلائل و براہین کے آہنگ میں مخاطب کر کے ان پر واضح کیا ہے کہ آپ محض اپنی عقل کے چراغ ہی کو معیارِ حق مانتے ہیں تو آپ کا اتباعِ قرآن کا دعویٰ بھی غلط ثابت ہوتا ہے۔ یہاں مصنف نے سورۂ آل عمران کی آیت نمبر 37 اور 47، پھر سورۂ طٰہٰ کی آیت نمبر 21،20 اور 22 اور سورۂ قمر کی پہلی آیت یکے بعد دیگرے درج کی ہے۔ ان آیات کے مفاہیم علی الترتیب یہ ہیں:

❁ مریم علیہا السلام کو ان کے ٹھکانے پر کسی خارجی رسد کے بغیر ہی کھانے پینے کی نعمتیں میسر آتی تھیں۔ ❁ عیسیٰ علیہ السلام بغیر باپ کے پیدا ہوئے۔ ❁ موسیٰ علیہ السلام کا عصا سانپ بنا، سانپ بننے کے بعد دوبارہ عصا بن گیا اور آپ کا ہاتھ ''ید بیضا'' بن کر جگمگا اُٹھا۔
❁ چاند کے دو ٹکڑے ہو گئے۔

فاضل مصنف نے منکرین حدیث سے سوال کیا ہے کہ آپ حدیث کو عقل کی روشنی میں جانچنے کے دعویدار ہیں تو کیا متذکرہ بالا قرآنی آیات آپ کی عقل پر پوری اُترتی ہیں؟ اگر پوری نہیں اُترتیں تو پھر آپ کو کیا کہا جائے گا؟

آج کل کے تجدد پسند حضرات کو یہ چشم کُشا کتاب ضرور پڑھنی چاہیے۔ ان شاء اللہ! اس کے مطالعے سے اُن پر قرآن و حدیث کی صراطِ مستقیم اُجاگر ہوگی۔ اور ان کا دل گواہی دے گا کہ اپنے قول اور عمل سے قرآن کریم کی احسن و اکمل تشریح اُسی انسانِ کامل صلی اللہ علیہ وسلم نے کی ہے جس پر یہ آخری آسمانی کتاب اُتری تھی۔

اس کتاب کی نظر ثانی، تہذیب اور استدلال کی تصحیح کا فریضہ مولانا عبدالولی خان نے انجام دیا جبکہ معیاری تصحیح و تزئین اور حُسنِ طباعت تک کے درجہ بدرجہ مرحلوں پر مدیر دارالسلام لاہور جناب حافظ عبدالعظیم اسد کے آثارِ توجہ صاف محسوس کیے جاسکتے ہیں۔ ان کے ساتھ ادارے کے شعبۂ فقہ و متفرقات کے انچارج حافظ محمد ندیم، پروفیسر عبدالرحمٰن ناصر، مولانا مشتاق احمد، زاہد سلیم چودھری، ابومصعب اور خرم شہزاد نے بھی بھرپور تعاون کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ انھیں اجر عظیم عطا فرمائے۔

خادم کتاب وسنت

عبدالمالک مجاہد

منیجنگ ڈائریکٹر دارالسلام الریاض، لاہور

اگست 2009ء

مقدمہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي نَزَّلَ الْكِتَابَ عَلٰى عَبْدِهِ لِيَكُونَ لِلْعَالَمِينَ نَذِيرًا وَّبَشِيرًا ۔ وَسُبْحَانَ الَّذِي أَوْحٰى إِلٰى عَبْدِهِ فَجَعَلَهُ دَاعِيًا وَّسِرَاجًا مُّنِيرًا، وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى ذٰلِكَ الْعَبْدِ وَسَلَّمَ الَّذِي أَرْسَلَهُ تَالِيًا وَّشَارِحًا، وَهَادِيًا مُّهْتَدِيًا، وَاجِبَ الْاِتِّبَاعِ قَاضِيًا وَّحَاكِمًا رَءُوفًا رَّحِيمًا، وَعَلٰى آلِهِ وَأَصْحَابِهِ الَّذِينَ بَلَّغُوا عَنْهُ مَا رَأَوْا وَعَلَّمُوا وَمَا بَدَّلُوا تَبْدِيلًا، أَمَّا بَعْدُ:

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ ﴾

"بے شک اسلام ہی اللہ کے نزدیک دین حق ہے۔" ①

اور فرمایا:

﴿ وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ﴾

"اور جو شخص اسلام کے سوا کسی دوسرے دین کا متلاشی ہو تو وہ اس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا۔" ②

اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقبول اور پسندیدہ دین، دینِ اسلام ہے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے

① آل عمرٰن 19:3. ② آل عمرٰن 85:3.

اس کی دعوت اور اشاعت کے لیے ہر دور میں اپنے پسندیدہ بندے انبیاء علیہم السلام مبعوث فرمائے۔ انھوں نے مشترکہ طور پر دو باتیں اپنی امت کے سامنے پیش کیں۔ پہلی یہ کہ ﴿ فَاتَّقُوا اللّٰهَ ﴾ ''اللہ سے ڈر جاؤ۔'' دوسری ﴿ وَاَطِيْعُوْنِ ﴾ ''اور میری اطاعت کرو۔'' جیسا کہ سورۂ شعراء میں نوح، ہود، صالح، لوط اور شعیب علیہم السلام کے واقعات میں اور سورۂ آل عمران میں عیسیٰ علیہ السلام کے بیان میں یہ دونوں باتیں موجود ہیں۔ ﴿ فَاتَّقُوا اللّٰهَ ﴾ میں اللہ تعالیٰ اور عقیدۂ توحید کی طرف دعوت، تمام اقسامِ کفر و شرک سے اجتناب اور تمام اعمال میں ظاہری و باطنی تقویٰ اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے جبکہ ﴿ وَاَطِيْعُوْنِ ﴾ میں رسول کے وصف رسالت اور وصف نبوت کی حیثیت سے ان کی مکمل اطاعت کرنا فرض قرار دیا گیا ہے۔ اس سلسلۂ نبوت کی آخری کڑی اور قلعۂ نبوت کی آخری اینٹ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کو بنایا اور انھیں مکمل دین اسلام کے ساتھ مبعوث فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے دین اسلام کو بذریعۂ وحی دو اصولوں کے اندر منضبط فرمایا، جس کا ذکر قرآنِ کریم میں بار بار ﴿ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ ﴾ کے الفاظ سے فرمایا گیا ہے اور ان دونوں کا محسوس نقشہ قرآن کریم اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت میں رکھا گیا ہے، جس کا نام وحی جلی اور وحی خفی، یا وحیِ متلو اور وحیِ غیر متلو ہے۔ صحابۂ کرام سے لے کر آج تک سلف صالحین، ائمۂ محدثین، مفسرین، مجتہدین اور علمائے حق نے مختلف انداز سے قرآن کریم اور سنت کی دعوت و اشاعت کا کام کیا۔ انھوں نے خطابت، تالیف وتصنیف، الفاظ و معانی اور لغوی و عرفی شرعی تشریحات کے ذریعے سے انھی دونوں چیزوں کو امت تک پہنچایا۔ ان کے ہاں اصولی طور پر ان دونوں کے درمیان کوئی اختلاف نہیں رہا۔ ایمانیات اور اصول ادیان، یعنی نماز، روزہ، حج اور زکاۃ، نیز اصول محرمات میں مکمل موافقت موجود ہے۔ صرف چند کیفیات میں اختلاف ہے جس کو فرعی اختلاف کہا جاتا ہے جو حقیقت میں اختلاف نہیں، البتہ تعصب اور جہالت

کی وجہ سے بعض لوگوں نے اسے اصولی اختلاف کا رنگ دے دیا ہے جس سے قرآن و حدیث کی صداقت وحقانیت اور فرضیتِ اطاعت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

قرآن وسنت کی مخالفت ہر دور میں کی گئی۔ اجنبی اقوام تو درکنار کچھ اپنوں نے بھی شیطان کے راستے پر چل کر ان کے مطابق عمل کرنے کے سلسلے میں رکاوٹیں پیدا کیں۔ کسی نے قرآن میں لفظی تحریف کرنے کی کوشش کی، جس کی مثالیں روافض کی کتابوں اور مرزا قادیانی کی تلبیسات میں موجود ہیں لیکن ان کی یہ حیلہ گری کارآمد نہ ہوسکی۔ کسی نے معنوی تحریفات اور تاویلات کے ذریعے سے اسلام کی اصلی صورت تبدیل کرنے کی پوری کوشش کی جس میں مرزا قادیانی اور تحریک طلوع اسلام کے رئیس پرویز احمد سرفہرست ہیں۔ ان کی تحریک صرف معنوی تحریفات پر مبنی ہے جس کے ذریعے سے وہ جاہل اور کم علم اشخاص کو گمراہ کررہے ہیں۔ اسی طرح اکثر مبتدعین (بدعتی) مثلاً: معتزلہ، جہمیہ، اباضیہ، خوارج اور دیگر علمی خرافات پھیلانے والے فرقے اس کام میں ملوث ہیں۔ ان سب کا مسلک تاویلات پر مبنی ہے۔ یہ لوگ حقیقت کو چھوڑ کر بلاضرورت تاویل اور مجاز کو اختیار کرتے ہیں۔ ان میں سے بعض نے رسول اللہ ﷺ کی سنت کو اسلام سے عملی طور پر ختم کرنے کے لیے احادیث کی حجیت سے انکار کیا اور اپنی عقل وخواہش ہی کو صحت حدیث کے پرکھنے کے لیے حاکم وفیصل قرار دیا۔ اس فطرت کے لوگ زمانۂ قریب میں فرقۂ نیچریہ، چکڑالویہ، سرسید احمد اور علامہ مشرقی کے ناموں اور نسبتوں سے رونما ہوئے لیکن اس تحریک کی ترقی میں پرویز احمد سب سے آگے ہے۔ دور حاضر میں یہ فتنہ زیادہ تر سرمایہ داروں اور دینی علوم سے محروم لوگوں میں پھیل رہا ہے۔ نبی ﷺ نے اس کی پیش گوئی کرتے ہوئے فرمایا:

«أَلَا! إِنِّي أُوتِيتُ الْكِتَابَ وَمِثْلَهُ مَعَهُ أَلَا يُوشِكُ رَجُلٌ

شَبْعَانُ عَلٰى أَرِيكَتِهِ يَقُولُ: عَلَيْكُمْ بِهٰذَا الْقُرْآنِ فَمَا وَجَدْتُّمْ فِيهِ مِنْ حَلَالٍ فَأَحِلُّوهُ وَمَا وَجَدْتُّمْ فِيهِ مِنْ حَرَامٍ فَحَرِّمُوهُ وَإِنَّ مَا حَرَّمَ رَسُولُ اللهِ ﷺ كَمَا حَرَّمَ اللهُ»

''سن لو! بے شک مجھے قرآن اوراس کی مثل اس کے ساتھ دیا گیا ہے، سن لو، قریب ہے کہ پیٹ بھر کے کھانے والا کوئی شخص اپنی آراستہ تکیہ دار چوکی (صوفے وغیرہ) پر بیٹھ کر کہے کہ تمھارے لیے بس یہ قرآن کافی ہے، لہٰذا تم اس میں جو حلال پاؤ، اسے حلال سمجھو اور تم اس میں جو حرام پاؤ، اسے حرام سمجھو، حالانکہ بے شک رسول اللہ ﷺ نے جو حرام قرار دیا ہے وہ ایسے ہی ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے۔''[1]

بسا اوقات کوئی بات، بیان کرنے والے کے بیان کے مطابق واقع ہو تو وہ اس کی صداقت کی دلیل بن جاتی ہے کیونکہ اب بھی انکار حدیث کا عقیدہ زیادہ تر انھی لوگوں میں ہے جو کرسیوں اور صوفوں پر براجمان ہوتے ہیں۔ ہمارے ایک دوست ایک دفعہ لاہور میں پرویز صاحب کے لیکچر میں شریک ہوئے۔ انھوں نے بتایا کہ وہ (پرویز) اور ان کے تمام رفقاء کرسیوں پر براجمان تھے جبکہ خواتین کو اگلی سیٹوں پر بٹھایا گیا تھا۔ میرے اس دوست نے رُقعے کے ذریعے سے ان خواتین کے بارے میں پرویز صاحب سے سوال کیا تو وہ ناراض ہو گئے اور حکم دیا کہ ان لوگوں کو یہاں سے نکال دو۔

جو لوگ مساجد و مدارس میں چٹائیوں پر بیٹھ کر دینی علوم حاصل کرتے ہیں ان میں یہ چیز نہیں پائی جاتی اِلاّ ماشاء اللہ۔ یہ فی الواقع اس حدیث کی صداقت کے لیے صریح دلیل ہے اور یہ ہمارے نبی ﷺ کے معجزات میں سے ہے۔ اسی طرح جو لوگ کسی مفسر اور

[1] سنن أبي داود، السنة، باب في لزوم السنة، حديث:4604، وجامع الترمذي، العلم، باب مانهي عنه أن يقال عند حديث رسول الله ﷺ، حديث:2664.

محدث سے قرآن وحدیث کا علم حاصل نہیں کرتے بلکہ محض اپنے مطالعے پر اکتفا کرتے ہیں وہ بھی زیادہ تر حدیث کے مفہوم اور مقصد کو نہیں سمجھتے اور احادیث کو اپنی عقل ناقص کی میزان پر جانچتے ہیں، اس لیے وہ حدیث کا انکار کرتے ہیں اور اس وجہ سے کبھی وہ کسی صحابی پر اور کبھی کسی محدث اور مؤلف پر دشنام طرازی کا رویہ اختیار کرتے ہیں جبکہ وہ اپنے آپ کو منکرینِ حدیث کے کسی خاص فرقے میں شمار کرنا برا سمجھتے ہیں۔ ایسے طرزِ فکر کا یہ نتیجہ نکلے گا کہ لوگ اس فتنے کی وجہ سے نماز، روزہ، زکاۃ اور حج وغیرہ، اصل عبادات چھوڑ کر طلوعِ اسلام والوں کے طریقے پر چلیں گے جو صحابۂ کرام سے لے کر آج تک کے تمام مسلمانوں کے منہج کو خیر باد کہہ کر نیا طریقہ اپنا چکے ہیں۔ طلوعِ اسلام کے نام کا مقصد بھی یہی ہے کہ جو اسلام نبی ﷺ نے پیش کیا تھا اور صحابۂ کرام، سلف صالحین نے جس پر عمل کیا تھا وہ اسلام غروب ہو چکا اور اب اسلام نئی روشنی کے ساتھ طلوع ہوگا کیونکہ طلوع کا معنی کسی نئی چیز کا ظاہر ہونا ہے، لہٰذا یہ نام (طلوعِ اسلام) بھی ان کی ضلالت بلکہ ان کے کفر پر واضح دلیل ہے۔ اس گمراہی کے پھیلاؤ کے خطرے سے بچنے کے لیے مجھ سے پہلے بہت سے علمائے کرام نے مسلمانوں کے مفاد میں پرویزیت اور انکار حدیث کی تردید میں بہت سی کتب لکھی ہیں۔ میرے چند ساتھیوں کا مدت سے یہ مطالبہ تھا کہ اس موضوع پر ایک کتاب تالیف کرنی چاہیے لیکن میں عدم فرصت اور کمزوریٔ صحت کی بنا پر معذرت کرتا رہا، تاہم ان کے پر اصرار مطالبے کو پیش نظر رکھتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے توفیق وتائید طلب کرتے ہوئے اس موضوع پر مختصر اور جامع کتاب مرتب کرنے کا ارادہ کیا۔ اگرچہ یہ مسئلہ منکرین کے شبہات اور تلبیسات کی وجہ سے تفصیل طلب ہے جس کے لیے ضخیم کتاب کی ضرورت ہے لیکن ان شاء اللہ تعالیٰ قرآنی طرز پر مشتمل یہ کتاب ضروری پہلوؤں سے کفایت کر سکے گی، وباللہ التوفیق۔

قرآن کریم پر ایمان

تمام اہلِ اسلام کا متفقہ اور مسلّمہ عقیدہ ہے کہ قرآن کریم پر ایمان لانا اصول ایمانیات میں سے ایک ضروری اصل اور اہم بنیاد ہے جس کے بغیر کوئی شخص مسلمان نہیں ہوسکتا۔ قرآن کریم میں بہت سی آیات ایسی ہیں جن میں قرآن کریم پر ایمان لانے کے لیے امر کا صیغہ موجود ہے، مثلاً: اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۭ بِهٖ ۠ وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِىْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۡ وَّاِيَّاىَ فَاتَّقُوْنِ ۝ ﴾

''اور اس (کتاب) پر ایمان لاؤ جو میں نے نازل کی جبکہ وہ اس کتاب کی تصدیق کرنے والی ہے جو تمھارے پاس ہے اور تم اس کا سب سے پہلے انکار کرنے والے نہ بنو اور تم میری آیتوں کو تھوڑی قیمت میں نہ بیچو اور مجھ ہی سے ڈرو۔''[1]

اور فرمایا:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اٰمِنُوْا بِمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّطْمِسَ وُجُوْهًا فَنَرُدَّهَا عَلٰٓى اَدْبَارِهَآ اَوْ نَلْعَنَهُمْ كَمَا لَعَنَّآ اَصْحٰبَ السَّبْتِ ۭ وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا ۝ ﴾

[1] البقرة 2:41.

”اے لوگو جنھیں کتاب دی گئی! اس (قرآن) پر ایمان لاؤ جو ہم نے نازل کیا، وہ اس کی تصدیق کرنے والا ہے جو تمھارے پاس ہے، (تم ایمان لاؤ) اس سے پہلے کہ ہم چہرے بگاڑ دیں اور انھیں پیچھے کی طرف پھیر دیں یا ان پر اسی طرح لعنت بھیجیں جس طرح ہم نے سبت والوں پر لعنت بھیجی تھی اور (یاد رکھو!) اللہ کا حکم اٹل ہے۔“ [1]

اور فرمایا:

﴿ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓاْ ءَامِنُواْ بِٱللَّهِ وَرَسُولِهِۦ وَٱلْكِتَٰبِ ٱلَّذِى نَزَّلَ عَلَىٰ رَسُولِهِۦ وَٱلْكِتَٰبِ ٱلَّذِىٓ أَنزَلَ مِن قَبْلُ ۚ وَمَن يَكْفُرْ بِٱللَّهِ وَمَلَٰٓئِكَتِهِۦ وَكُتُبِهِۦ وَرُسُلِهِۦ وَٱلْيَوْمِ ٱلْءَاخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَٰلًۢا بَعِيدًا ۝ ﴾

”اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ، اس کے رسول اور اس کتاب پر ایمان لاؤ جو اللہ نے اپنے رسول پر نازل کی اور اس کتاب پر بھی جو اس نے پہلے نازل کی۔ اور جو شخص اللہ، اس کے فرشتوں، اس کی کتابوں، اس کے رسولوں اور آخرت کے دن کا انکار کرے تو وہ یقیناً بہت دور کی گمراہی میں جا پڑا۔“ [2]

صرف اتنا ایمان لانا کہ یہ کتاب الٰہی ہے یا اللہ تعالیٰ نے اسے محمد ﷺ پر نازل فرمایا ہے۔ یہ اجمالی ایمان کافی نہیں کیونکہ سابقہ الہامی کتابوں (تورات، انجیل اور زبور وغیرہ) پر تو مجمل ایمان لانا کافی ہے لیکن قرآن کریم پر مجمل ایمان کے ساتھ ساتھ ایمان مفصل بھی ضروری ہے۔ قرآن کریم سے مندرجہ ذیل تفصیلات وعقائد ثابت ہیں:

قرآن وحیِ الٰہی ہے

قرآن وحیِ الٰہی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں 27 مرتبہ اپنی طرف اس بات کی نسبت کی ہے کہ یہ کتاب اللہ تعالیٰ کی وحی کردہ ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

[1] النسآء 4:47. [2] النسآء 4:136.

﴿ وَاتْلُ مَآ اُوْحِیَ اِلَیْكَ مِنْ كِتَابِ رَبِّكَ ﴾

''اور آپ کے رب کی کتاب میں سے جو آپ کی طرف وحی کیا گیا ہے اسے تلاوت کیجیے۔''[1]

نیز فرمایا:

﴿ ذٰلِكَ مِمَّآ اَوْحٰٓی اِلَیْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ ﴾

''یہ وہ حکمت کی باتیں ہیں جو آپ کے رب نے آپ کی طرف وحی کی ہیں۔''[2]

نیز فرمایا:

﴿ اِنَّآ اَوْحَیْنَآ اِلَیْكَ كَمَآ اَوْحَیْنَآ اِلٰی نُوْحٍ وَّالنَّبِیّٖنَ مِنْۢ بَعْدِهٖ ﴾

''(اے نبی!) بے شک ہم نے آپ کی طرف وحی کی جیسے ہم نے نوح اور ان کے بعد دوسرے نبیوں کی طرف وحی کی۔''[3]

اس قسم کی اور بھی آیات ہیں۔ وحی نازل کرنے کے تین طریقے بیان فرمائے ہیں، چنانچہ ارشاد فرمایا:

﴿ وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ یُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْیًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوْ یُرْسِلَ رَسُوْلًا فَیُوْحِیَ بِاِذْنِهٖ مَا یَشَآءُ ﴾

''اور یہ کسی انسان کے لائق نہیں کہ اللہ اس سے کلام کرے مگر وحی کے ذریعے سے یا پردے کے پیچھے سے یا اللہ تعالیٰ کسی فرشتے کو بھیج دے جو اس کے حکم سے جو کچھ چاہے اسے پہنچا دے۔''[4]

اور فرشتے سے مراد جبریل علیہ السلام ہیں جیسا کہ فرمایا:

﴿ قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِیْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰی قَلْبِكَ ﴾

[1] الکهف 27:18. [2] بنیٓ إسرآءیل 39:17. [3] النسآء 163:4. [4] الشورٰی 51:42.

"آپ فرما دیں کہ جو کوئی جبریل علیہ السلام کا دشمن ہے، تو اسی نے اسے آپ کے دل پر اتارا ہے۔"[1]

نیز فرمایا:

﴿ وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ ۝ ﴾

"اور بلاشبہ یہ (قرآن) رب العالمین کا اتارا ہوا ہے، اسے روح الامین (جبریل علیہ السلام) لے کر نازل ہوا ہے۔"[2]

سورۂ شوریٰ کی آیت میں مذکور تیسرا طریقۂ وحی (بذریعہ فرشتے) کا تذکرہ کتب احادیث میں مذکور ہے کہ جبریل علیہ السلام کبھی گھنٹی بجنے کی آواز کی طرح وحی لے کر آتے جس کا اخذ کرنا سخت تھا، پھر بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم اسے مکمل طور پر اخذ فرماتے اور کبھی جبریل علیہ السلام دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ وغیرہ کی صورت میں نمودار ہو کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی سنایا کرتے تھے، یہ آسان طریقہ تھا۔[3]

لہٰذا نزول وحی کے چار طریقے ثابت ہوئے۔

وحی عربی زبان کا لفظ ہے، لغت کے اعتبار سے اس میں بڑی وسعت ہے یہ لفظ قرآن کریم میں مختلف معانی کے لیے استعمال کیا گیا ہے:

① فطری تعلیم: جیسا کہ فرمایا:

﴿ وَاَوْحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِيْ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا وَّمِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا يَعْرِشُوْنَ ۝ ﴾

"اور تیرے رب نے شہد کی مکھی کو الہام کیا کہ تو پہاڑوں میں گھر (چھتے) بنا،

① البقرة 2:97. ② الشعرآء 26:192,193. ③ صحيح البخاري، بدء الوحي، باب كيف كان بدء الوحي، حديث: 2، دحیہ رضی اللہ عنہ کے نام کی وضاحت کے لیے دیکھیے: سنن النسائي، الإيمان، باب صفة الإيمان والإسلام، حديث:4994.

درختوں میں اوران (چھپروں) میں جن پر لوگ (بیلیں) چڑھاتے ہیں۔“[1]

2 شیطانی وسوسہ: فرمایا:

﴿ يُوحِي بَعْضُهُمْ إِلَىٰ بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُورًا ﴾

”وہ ایک دوسرے کے دل میں ملمع کی ہوئی باتیں دھوکا دینے کے لیے ڈالتے رہتے ہیں۔“[2]

3 دل میں الہام کرنا: فرمایا:

﴿ وَأَوْحَيْنَا إِلَىٰ أُمِّ مُوسَىٰ أَنْ أَرْضِعِيهِ ﴾

”اور ہم نے موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کے دل میں یہ الہام کیا کہ وہ اسے دودھ پلاتی رہیں۔“[3]

اس وقت کوئی اور نبی نہیں تھا جس کے ذریعے سے موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو وحی سنائی گئی ہو بلکہ صرف ان کے دل میں یہ بات ڈال دی گئی کہ وہ موسیٰ علیہ السلام کو دودھ پلائیں اور اگر کوئی بات نبی کے دل میں ڈال دی جائے تو وہ وحیِ نبوت ہے لیکن پرویز صاحب نے وحی صرف وحیِ نبوت کے ساتھ مخصوص کردی ہے اور جبریل کے ذریعے سے نازل شدہ وحی کے علاوہ کا انکار کیا ہے اور یہ قرآن سے اس کی لاعلمی کا ثبوت ہے۔ یہ غلط نظریہ انھوں نے اپنی کتاب قرآنی فیصلے،ص:231 پر بیان کیا ہے۔

قرآن منزل من اللہ ہے

قرآن کریم کے متعلق الفاظ إنزال، تنزیل اور نزول کے استعمال سے یہ چیز واضح ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم اوپر سے نیچے اتارا ہے۔ اہل زمین میں سے کسی کا اس میں کوئی دخل نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

1 النحل 68:16. 2 الأنعام 112:6. 3 القصص 7:28.

﴿ وَبِالْحَقِّ اَنْزَلْنٰهُ وَبِالْحَقِّ نَزَلَ ﴾

''اور ہم نے حق کے ساتھ اسے اتارا ہے اور وہ حق کے ساتھ اترا ہے۔''[1]

یعنی راستے میں بھی اس میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔

قرآن کریم کی بہت سی آیات میں ﴿ نَزَلَ ﴾ کا مادہ استعمال کیا گیا ہے اور اسی طرح مصدر ''إِنْزَال'' سے ستاون (57) مرتبہ یہ لفظ آیا ہے۔ فرمایا:

﴿ هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ ﴾

''وہی ذات ہے جس نے آپ پر کتاب اتاری۔''[2]

عربی لغت میں إنزال کا معنی ''اتارنا'' اور نزول کا معنی ''اترنا'' ہے، البتہ إنزال کبھی انسانی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے پیدا کردہ چیزوں کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے جیسا کہ فرمایا:

﴿ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا ﴾

''ہم نے تم پر لباس نازل کیا۔''[3]

نیز فرمایا:

﴿ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ ﴾

''اور ہم نے لوہا پیدا کیا۔''[4]

نیز فرمایا:

﴿ اَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ الْاَنْعَامِ ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ ﴾

''اور اس نے تمھارے لیے چوپایوں میں سے آٹھ جوڑے (نر اور مادہ) پیدا کیے۔''[5]

لیکن پیدائش کے معانی میں مادۂ نزول بالکل مستعمل نہیں جیسا کہ نزول عیسیٰ علیہ السلام، جو

[1] بنیٓ إسرآءیل105:17. [2] آل عمرٰن 7:3. [3] الأعراف 26:7. [4] الحدید25:57. [5] الزمر 6:39.

صحیح حدیث میں وارد ہے، کا معنی پیدائش سے کرنا غلط ہے بلکہ وہاں اترنے کے معنی میں ہے لیکن مرزا غلام احمد قادیانی نے تحریف کر کے یَنْزِلُ فِیکُمُ ابْنُ مَرْیَمَ کا معنی کیا ہے: ''پیدا ہوگا تمھارے درمیان (مثیل) ابن مریم۔'' یہ سراسر جھوٹ اور باطل تاویل ہے۔ وحی کے انزال اور نزول میں عربی لغت کا حقیقی معنی مراد ہے، یعنی اوپر سے اتارنا اور اترنا اور یہی حق بات ہے کیونکہ انزال اور نزولِ وحی اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہے۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ اپنی ذات کے لحاظ سے ہر جگہ موجود نہیں بلکہ وہ ساتوں آسمانوں کے اوپر عرش عظیم پر مستوی ہے جیسا کہ قرآن کریم میں سورۂ اعراف، یونس، رعد، طٰہٰ، فرقان، سجدہ اور حدید میں یہ بات نص صریح سے ثابت ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے لیے صفت علو (بلند ہونے کی صفت)، تَعَالٰی کے صیغے سے چودہ مرتبہ، عَلِيٌّ کے صیغے سے آٹھ مرتبہ، أَعْلٰی کے صیغے سے دو مرتبہ، عُلُوّ اور مُتَعَال کے صیغے سے ایک ایک مرتبہ مذکور ہے جبکہ فوق کا لفظ تین مرتبہ استعمال ہوا ہے، لہٰذا تینوں صیغے استواء عَلَی الْعَرْش، عُلُوّ اور فوق عربی لغت کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ کے اوپر اور بلند ہونے کی صریح دلیل ہیں۔

نبی ﷺ نے صحابۂ کرام کو اس کا کوئی مجازی معنی نہیں بتایا جیسا کہ تمام سلف صالحین کا یہی مسلک ہے کہ یہ صفات اللہ تعالیٰ کے لیے حقیقی طور پر مراد ہیں جن میں مخلوق کے ساتھ تشبیہ و تمثیل نہیں، نیز تاویل کرنا بھی تحریف ہے، پس ہر ذی شعور اور مسلمان شخص کے نزدیک انزال کا حقیقی معنی مراد ہے۔ صرف ایک پرویز احمد ایسے ہیں، جنھوں نے یہاں بھی اپنی کج ذہنی اور کج روی کا مظاہرہ کرتے ہوئے انزال اور نزول کی تاویل کی ہے۔ لکھتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ کی ذات جہت اور سمت کی تمام نسبتوں سے پاک ہے، اس لیے نزول وحی سے یہ مراد نہیں کہ کوئی چیز سچ مچ اوپر کی سمت سے نیچے آتی ہے۔ خدا تو رگِ جاں سے

بھی زیادہ قریب ہے، اس لیے وحی کی خارجیت سے اصل مقصد یہ بتایا ہے کہ یہ وحی ذہن انسانی کی پیداوار نہیں اور نہ ہی اس میں صاحب وحی کے کسب و ہنر کو کوئی دخل ہے۔ اس بات کے متعلق ہر ذی عقل یہ کہہ سکتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ رگ جاں سے بھی زیادہ قریب ہے تو رگِ جاں انسان سے خارج نہیں تو وحی کی خارجیت کہاں سے ثابت ہوتی ہے۔''[1]

اتباع قرآن فرض ہے

اتباع قرآن فرض ہے اور اس کے لیے چھ مرتبہ امر کا صیغہ استعمال ہوا ہے۔ فرمایا:

﴿ وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِىۡ مُسۡتَقِيۡمًا فَاتَّبِعُوۡهُ ﴾

''اور یقیناً یہ میرا راستہ سیدھا ہے، لہٰذا تم اسی کی پیروی کرو۔''[2]

نیز فرمایا:

﴿ وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنۡزَلۡنٰهُ مُبٰرَكٌ فَاتَّبِعُوۡهُ ﴾

''اور یہ ایک بابرکت کتاب ہے جس کو ہم نے اتارا (کتاب) ہے، لہٰذا اس کی اتباع کرو۔''[3]

اسی طرح سورۂ زمر، آیت: 55، سورۂ یونس، آیت: 109 اور سورۂ قیامہ، آیت: 18 میں بھی امر کا صیغہ استعمال ہوا ہے۔

''اتباع کرو'' کے الفاظ زیادہ تر ''عمل'' کے معنی میں استعمال کیے جاتے ہیں، جس کی تفصیل ان شاء اللہ دوسرے باب میں آئے گی۔ پس ان آیات میں مقصد یہ ہے کہ قرآن کریم میں جتنے اوامر، نواہی یا احکامات موجود ہیں ان پر عمل کرنا فرض ہے۔ اللہ کے اوامر میں یہ آیت بھی موجود ہے:

[1] کتاب آدم و ابلیس، ص: 261. [2] الأنعام 153:6. [3] الأنعام 155:6.

﴿ قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ ﴾

''آپ فرما دیں اگر تمھیں اللہ سے محبت ہے تو پھر میری اتباع کرو۔''[1]

یعنی اللہ تعالیٰ نے قرآن میں نبی ﷺ کے اعمال کی اتباع ہم پر فرض کر دی ہے۔ نماز، روزہ، زکاۃ، حج اور دیگر عبادات میں آپ ﷺ کے طریقے کی اتباع کرنا ہم پر فرض ہے۔ لیکن پرویزی طلوع اسلام اس کی مخالفت کرتا ہے جسے میں ان شاء اللہ دوسرے باب میں ثابت کروں گا۔

قرآن کی زبان عربی ہے

قرآن کریم عربی زبان میں نازل ہوا ہے، جیسا کہ بہت سی آیات میں اس کا ذکر ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا ﴾

''بے شک ہم نے اسے عربی قرآن نازل کیا ہے۔''[2]

نیز فرمایا:

﴿ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ ۝ ﴾

''واضح عربی زبان میں (نازل کیا گیا۔)''[3]

یعنی اس میں کوئی لفظ عجمی اور عجمی محاورہ نہیں جو الفاظ عجمی معلوم ہوتے ہیں وہ بھی اصل میں عربی زبان کے ہی تھے لیکن اہلِ عجم نے انھیں استعمال کر لیا، نیز اس کے عربی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے معانی اور محاورات کو اہلِ عرب کے طور طریقے اور قواعد کے مطابق سمجھنا اور استعمال کرنا ہوگا۔ قرآن کریم چونکہ وحیِ الٰہی اور تشریعی کتاب ہے، لہٰذا

[1] آل عمرٰن 31:3. [2] یوسف 2:12. [3] الشعرآء 195:26.

اس کے معانی کے مصداق کی تعیین میں شرع کا اعتبار ہوگا اور جس لفظ کا معنی شارع نے طے کردیا ہو اسی کو لیا جائے گا، مثلاً: ''صلاۃ'' لغت میں اس کے معنی ''دعا یا اطاعت کرنا'' ہیں لیکن شارع نے جہاں اس کے معنی نماز بتائے ہیں تو وہی مراد لیے جائیں گے۔

زکاۃ کا لغوی معنی پاکیزگی ہے لیکن جہاں شارع نے اس کا خاص شرعی اصطلاحی معنی متعین کیا ہے تو وہاں اسی شرعی معنی کا اعتبار ہوگا، یعنی خاص مالی فریضہ۔ جبکہ انکار حدیث کے فتنے میں ملوث افراد نے قرآن کریم کے لغوی اور شرعی معانی چھوڑ کر اپنی طرف سے دور از کار تاویلات کیں جیسا کہ پرویز نے صلاۃ، زکاۃ اور حج وغیرہ کے ایسے معانی ایجاد کیے ہیں جن سے شریعت کا چہرہ مسخ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اسی طرح سر سید احمد خاں نے جنت، شجر ممنوعہ اور ہبوط آدم کی تاویلات کی ہیں۔ یہ ساری تاویلات باطل تاویلات ہیں۔ آخری ابواب میں ان شاء اللہ تعالیٰ اس کے کچھ نمونے بھی پیش کیے جائیں گے۔

ایمان بالملائکہ قرآن سے ثابت ہے

قرآن کریم میں جن اشیاء پر ایمان لانے کا حکم دیا گیا ہے ان میں فرشتوں پر ایمان لانا بھی شامل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَرُسُلِهٖ وَجِبْرِيْلَ وَمِيْكٰلَ فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ﴾

''جو شخص اللہ کا، اس کے فرشتوں، اس کے رسولوں اور جبریل و میکائیل کا دشمن ہے تو بے شک اللہ بھی کافروں کا دشمن ہے۔''[1]

اور ان کے ساتھ دشمنی کا اول درجہ یہ ہے کہ ان پر اور ان کی صفات پر ایمان نہ لایا جائے، لہٰذا جو شخص فرشتوں اور قرآن کریم میں ان کی مذکورہ صفات کو نہیں مانتا وہ کافر ہے،

[1] البقرۃ 2:98.

نیز فرمایا:

﴿ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ﴾

''لیکن نیکی تو یہ ہے کہ کوئی اللہ پر، یوم آخرت پر، فرشتوں، کتابوں، اور نبیوں پر ایمان لائے۔''[1]

مذکورہ آیت میں اور بھی بہت سی چیزوں کا ذکر ہے اور آیت کے اختتام پر فرمایا:

﴿ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ۝ ﴾

''یہی لوگ سچے ہیں اور یہی لوگ متقی ہیں۔''[2]

یعنی ایسے لوگوں ہی کو حقیقی اور سچے مومن ہونے کا خطاب دیا۔

نیز فرمایا:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْ نَزَّلَ عَلٰي رَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ ؕ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ۝ ﴾

''اے ایمان والو! اللہ پر، اس کے رسول اور اس کی کتاب پر ایمان لاؤ جو اس نے اپنے رسول پر نازل فرمائی اور اس کتاب پر ایمان لاؤ جو اس سے پہلے اس نے نازل کی اور جو شخص اللہ، اس کے فرشتوں، اس کی کتابوں، اس کے رسولوں اور یوم آخرت کا انکار کرے تو وہ یقیناً بہت دور کی گمراہی میں جا پڑا۔''[3]

اور فرشتوں پر ایمان لانے میں یہ بھی شامل ہے کہ ان کے ان اوصاف پر بھی ایمان لایا جائے جو قرآن کریم میں مذکور ہیں۔ ان میں سے بعض اوصاف درج ذیل ہیں:

''فرشتوں نے آدم علیہ السلام کو سجدہ کیا۔''[4]

---

[1] البقرۃ2:177۔ [2] البقرۃ2:177۔ [3] النسآء4:136۔ [4] البقرۃ2:34۔

”وہ حق چھپانے والے پر لعنت کرتے ہیں۔“[1]

”طالوت کے لیے تابوت اٹھا کر لائے تھے۔“[2]

”زکریا علیہ السلام کو آواز دے کر بیٹے کی بشارت دی۔“[3]

”مریم علیہا السلام کے ساتھ مکالمہ کیا۔“[4]

”غزوۂ بدر میں نصرت کے لیے ملائکہ کا نزول ہوا۔“[5]

”روح قبض کرنے کے لیے آتے ہیں۔“[6]

”بعض فرشتے روح اور وحی لانے والے ہیں۔“[7]

”بعض فرشتے اعمال لکھنے والے ہیں۔“[8]

”بعض فرشتے عرش اٹھانے والے ہیں۔“[9]

”آسمان کی طرف چڑھنے والے ہیں۔“[10]

”فرشتے اللہ کے بندے ہیں، بیٹیاں نہیں۔“[11]

ان کے علاوہ بھی ان کے اوصاف و اعمال ہیں، لہٰذا ان تمام اوصاف کے ساتھ فرشتوں پر ایمان لانا، ایمان شرعی ہے۔ اب ذرا منکرین حدیث کی تاویلات کفریہ ملاحظہ فرمائیں:

غلام احمد پرویز لکھتے ہیں:

”فرشتے کائنات کی قوتیں (جن سے رزق پیدا ہوتا ہے) انسان کے تابع ہیں، وہ سب اس کے سامنے سجدہ ریز ہو گئے۔“[12]

انھوں نے اس میں فرشتوں سے مراد زمینی قوتِ پیداوار لیا ہے اور اپنے استاد سر سید کی تقلید میں واقعۂ سجود آدم کو ایک ڈرامے کا تصور دیا ہے اگرچہ دونوں کی تاویلات میں کچھ

① البقرة 2:161۔ ② البقرة 2:248۔ ③ آل عمران 3:39۔ ④ آل عمران 3:42-45۔ ⑤ آل عمران 3:124,125۔ ⑥ النسآء 4:97، والأنعام 6:93۔ ⑦ النحل 16:2۔ ⑧ الانفطار 82: 10,11۔ ⑨ الحآقة 69:17۔ ⑩ المعارج 70:4۔ ⑪ الزخرف 43:19۔ ⑫ کتاب إبلیس وآدم، ص:52۔

فرق ہے۔ اندازہ کریں! ایسی تاویلات تو یہودی بھی نہیں کر سکتے۔ اس سے ثابت ہوا کہ ان لوگوں کا فرشتوں پر ایمان نہیں ہے۔

مسئلۂ تقدیر قرآن سے ثابت ہے

قرآن کریم نے مسئلۂ تقدیر کو مختلف تعبیرات سے پیش کیا ہے چونکہ یہ تعبیرات قرآن کریم کی اخبار ہیں، لہٰذا ان کی تصدیق ہم پر فرض ہے اور تقدیر پر ایمان لانے کا یہی معنی ہے۔ تقدیر اور قضا کیا ہے؟ وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے جو مخلوق پیدا فرمائی یا مستقبل میں جو پیدا فرمائے گا، خواہ وہ اعیان (ذوات) ہوں یا کیفیات و ہیئات، احوال و اعراض، خیر وشر، صحت ومرض، تونگری وفقیری وغیرہ ہوں، اللہ تعالیٰ نے اپنے علم کامل کی وجہ سے انھیں ان کے پیدا کرنے سے پہلے ہی مقرر کر کے لکھ دیا ہے اور اب اس کے مطابق یہ چیزیں وجود میں آتی ہیں۔ پہلے مقرر کرنے کو تقدیر کہا جاتا ہے اور بعد میں اس کا وجود میں آنا قضا ہے۔ بسا اوقات تقدیر وقضا ایک ہی معنی میں استعمال کیے جاتے ہیں۔ اور یہ ایک بنیادی اسلامی عقیدہ ہے جبکہ معتزلہ، قدریہ، دہریہ اور منکرین حدیث وغیرہ اس کا انکار کرتے ہیں۔ ہم اس مسئلے کے متعلق پہلے قرآنی تعبیرات کا اختصار کے ساتھ ذکر کرتے ہیں:

❁ تعبیر اول: مادہ "قدر" کا استعمال: اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهُ تَقْدِيرًا ۝﴾

"اور اس نے ہر چیز کو پیدا کیا، پھر اس کا ٹھیک ٹھیک اندازہ کیا۔"[1]

اس میں ہر چیز کی تقدیر کا ذکر ہے، نیز فرمایا:

﴿نَحْنُ قَدَّرْنَا بَيْنَكُمُ الْمَوْتَ﴾

[1] الفرقان 2:25۔

''ہم ہی نے تمھارے درمیان موت مقدر کر دی ہے۔''[1]

اس میں صرف موت کی تقدیر کا ذکر ہے، نیز فرمایا:

﴿ وَالشَّمْسُ تَجْرِي لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ۚ ذَٰلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ ﴿ وَالْقَمَرَ قَدَّرْنَاهُ مَنَازِلَ ﴾

''اور سورج اپنے ٹھکانے (پر پہنچنے) کے لیے رواں دواں رہتا ہے، یہ نہایت غالب، خوب جاننے والے (اللہ) کا اندازہ ہے۔ اور چاند کی ہم نے (اٹھائیس) منزلیں مقرر کر رکھی ہیں۔''[2]

پہلی آیت میں سورج کی تقدیر اور دوسری آیت میں چاند کی منازل کی تقدیر کا ذکر ہے، نیز فرمایا:

﴿ وَكُلُّ شَيْءٍ عِندَهُ بِمِقْدَارٍ ﴾

''اور اس کے ہاں ہر چیز کی ایک مقدار (مقرر) ہے۔''[3]

نیز فرمایا:

﴿ إِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنَاهُ بِقَدَرٍ ﴾

''بلاشبہ ہم نے ہر چیز ایک مقرر اندازے کے مطابق پیدا کی ہے۔''[4]

ان دونوں آیات میں ہر چیز کی تقدیر کا ذکر ہے، نیز فرمایا:

﴿ قَدْ جَعَلَ اللَّهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا ﴾

''بے شک اللہ نے ہر چیز کے لیے تقدیر مقرر کر رکھی ہے۔''[5]

اس میں بھی ہر چیز کی تقدیر کا ذکر ہے، نیز فرمایا:

﴿ وَكَانَ أَمْرُ اللَّهِ قَدَرًا مَّقْدُورًا ﴾

[1] الواقعۃ 60:56. [2] یٰسٓ 39,38:36. [3] الرعد 8:13. [4] القمر 49:54. [5] الطلاق 3:65.

''اور اللہ کا حکم ایک طے شدہ تقدیر ہوتی ہے۔''[1]

اس میں بھی اللہ تعالیٰ کے تمام امور کی تقدیر کا ذکر ہے۔

❁ **تعبیر دوم: مادۂ قضا:** قرآن کریم میں مادۂ ''قضا'' کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے بعض فرامین درج ذیل ہیں: فرمایا:

﴿ قُضِيَ الْأَمْرُ الَّذِي فِيهِ تَسْتَفْتِيَانِ ۝ ﴾

''اس معاملے کا فیصلہ کیا جا چکا ہے جس کی بابت تم مجھ سے پوچھ رہے تھے۔''[2]

یہاں قضا، بمعنی تقدیر ہے، یعنی ایک شخص کو صلیب پر چڑھایا جانا اور دوسرے کی نجات پہلے ہی سے مقرر کر دی گئی ہے، نیز فرمایا:

﴿ وَكَانَ أَمْرًا مَّقْضِيًّا ۝ ﴾

''اور یہ (عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت باپ کے بغیر) پہلے سے مقرر شدہ معاملہ تھا۔''[3]

نیز فرمایا:

﴿ كَانَ عَلَىٰ رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا ۝ ﴾

''(جہنم پر ہر شخص کا وارد ہونا) تیرے رب کے نزدیک فیصلہ شدہ بات ہے۔''[4]

❁ **تعبیر سوم: مادہ کتاب:** یعنی ہر بات اللہ تعالیٰ نے پہلے سے لکھ رکھی ہے اور اس کتاب کا نام لوح محفوظ، کتاب مکنون، کتاب مبین اور ام الکتاب ہے۔ اس کے متعلق بہت سی آیات ہیں۔ فرمایا:

﴿ وَابْتَغُوا مَا كَتَبَ اللَّهُ لَكُمْ ﴾

''اور اللہ نے تمھارے مقدر میں جو لکھ رکھا ہے اسے تلاش کرو۔''[5]

اس سے مراد اولاد ہے، نیز فرمایا:

---

① الأحزاب 38:33. ② یوسف 41:12. ③ مریم 21:19. ④ مریم 71:19. ⑤ البقرة 187:2.

﴿ قُلْ لَّنْ يُّصِيبَنَآ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا ﴾

''کہہ دیجیے: ہمیں تو صرف وہ (مصیبت) پہنچے گی جو اللہ نے ہمارے لیے لکھ دی ہے۔''[1]

اور فرمایا:

﴿ مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيبَةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ ﴾

''زمین میں اور تمھاری جانوں پر جو بھی مصیبت آتی ہے وہ تو کتاب میں (لکھی ہوئی) ہے۔''[2]

ان دونوں آیتوں کا مضمون یہ ہے کہ انسان کو جو مصیبت پہنچتی ہے وہ پہلے سے لکھی ہوتی ہے، نیز فرمایا:

﴿ وَلَوْلَآ اَنْ كَتَبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمُ الْجَلَآءَ ﴾

''اور اگر یہ نہ ہوتا کہ اللہ نے ان کا جلاوطن ہونا لکھ دیا تھا۔''[3]

یعنی بنونضیر کے یہود کی جلاوطنی پہلے ہی سے لکھی ہوئی تھی۔اور فرمایا:

﴿ وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِينٍ ۝ ﴾

''اور کوئی تر چیز اور کوئی خشک چیز ایسی نہیں جو واضح کتاب میں لکھی ہوئی نہ ہو۔''[4]

نیز فرمایا:

﴿ كُلٌّ فِيْ كِتٰبٍ مُّبِينٍ ۝ ﴾

''ہر چیز واضح کتاب میں ہے۔''[5]

ہر چیز کا رزق، اس کا ٹھکانا اور اس کے دفن ہونے کی جگہ پہلے سے کتاب مبین میں لکھی ہوئی ہے، نیز فرمایا:

﴿ لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ ۝ ﴾

[1] التوبة 9:51. [2] الحديد 57:22. [3] الحشر 59:3. [4] الأنعام 6:59. [5] هود 11:6.

''ہر وعدے کے لیے لکھا ہوا وقت ہے۔''[1]

نیز فرمایا:

﴿ وَمَآ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ اِلَّا وَلَهَا كِتَابٌ مَّعْلُوْمٌ ۝ ﴾

''اور ہم نے جس بستی کو بھی ہلاک کیا ہے اس (کی تباہی) کے لیے میعاد مقرر تھی۔''[2]

نیز فرمایا:

﴿ كَانَ ذٰلِكَ فِي الْكِتٰبِ مَسْطُوْرًا ۝ ﴾

''یہ (فیصلہ) کتاب (لوح محفوظ) میں لکھا ہوا ہے۔''[3]

ان آیات سے معلوم ہوا کہ ہر شخص اور ہر بستی کی ہلاکت پہلے سے لکھی ہوئی ہے۔

نیز فرمایا:

﴿ وَكُلَّ شَيْءٍ اَحْصَيْنٰهُ كِتٰبًا ۝ ﴾

''اور ہم نے ہر چیز کو ایک کتاب میں گن رکھا ہے۔''[4]

نیز فرمایا:

﴿ وَكُلَّ شَيْءٍ اَحْصَيْنٰهُ فِيْٓ اِمَامٍ مُّبِيْنٍ ۝ ﴾

''اور ہم نے ہر شے کو واضح کتاب میں محفوظ کر رکھا ہے۔''[5]

ان دونوں آیتوں میں ہر ایک چیز کے متعلق کتابت کا ذکر ہے۔

ان آیات کو غور وفکر کے ساتھ بار بار پڑھنے سے مسئلہ قضا و قدر پر ضرور یقین پیدا ہو جاتا ہے اور یہ چھٹا ایمانی رکن ہے جیسا کہ حدیثِ جبریل میں نبیٔ اکرم ﷺ نے ایمان کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا:

«أَنْ تُؤْمِنَ بِاللهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَتُؤْمِنَ

[1] الرعد 38:13. [2] الحجر 4:15. [3] بنیٓ إسرآء یل 58:17. [4] النبا 29:78. [5] یٰسٓ 12:36.

بِالْقَدْرِ خَيْرِهِ وَشَرِّهِ»

”ایمان یہ ہے کہ تو اللہ پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر، اس کے رسولوں پر اور آخرت کے دن پر ایمان لائے، نیز تو اس کی اچھی اور بُری تقدیر پر ایمان لائے۔“[1]

لیکن چونکہ پرویزیت اصل میں ایمان کی جڑیں کاٹنے کا ذریعہ ہے، لہٰذا پرویز صاحب کے نزدیک تقدیر پر ایمان لانا مجوسیت ہے۔ ان کا کہنا ہے: ”اس طرح جب ایک دفعہ فرقہ بندی ہوگئی تو پھر اس کے بعد چل سو چل۔ مجوسی اساورہ[2] نے یہ سب کچھ اس خاموشی سے کیا کہ کوئی بھانپ ہی نہ سکا کہ اسلام کی گاڑی کس طرح دوسری پٹڑی پر جا پڑی۔ انھوں نے تقدیر کے مسئلہ کو اتنی اہمیت دی کہ اسے مسلمانوں کا جزوایمان بنادیا، چنانچہ ہمارے ایمان میں وَالْقَدْرِ خَيْرِهِ وَشَرِّهِ مِنَ اللّٰهِ تَعَالٰى کا چھٹا جزو انھی کا داخل کیا ہوا ہے۔“[3]

اپنی کتاب قرآنی فیصلے میں لمبی بحث کے آخر میں تقدیر، اجل اور موت کے متعلق لکھتے ہیں: ”یہ تصور قرآن کے منشا کے خلاف ہے۔“ پھر فرمانِ الٰہی ﴿ نَحْنُ قَدَّرْنَا بَيْنَكُمُ الْمَوْتَ ﴾ کا معنی لکھتے ہیں: ”ہم نے تمھارے درمیان موت کے پیمانے مقرر کر دیے ہیں۔“[4]

یہ ترجمہ عجیب و غریب اور فہم سے خالی ہے۔ قرآن میں تحریف کرتے ہوئے بھی کسی قسم کی جھجک محسوس نہیں کی گئی۔ آپ کو یہ ترجمہ کسی بھی لغت میں نہیں ملے گا۔ جہاں تک تقدیر کے متعلق اس سوال کا تعلق ہے کہ کسی چیز کے وجود میں آنے سے قبل اس کا اندازہ کیسے لگایا گیا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے اور ہر چیز کو جاننے والا ہے جیسا کہ اس نے قرآن کریم میں متعدد مقامات پر اس کا تذکرہ کیا ہے۔

[1] صحيح مسلم، الإيمان، باب بيان الإيمان والإسلام......، حديث: 8. [2] بصرہ میں آباد ہونے والے عجمی مجوسی اساورہ کہلاتے تھے۔ [3] قرآنی فیصلے بحوالہ آئینۂ پرویزیت۔ [4] قرآنی فیصلے، ص:260.

بعض ذہنوں میں یہ شبہ بھی پیدا ہوسکتا ہے کہ تقدیر ماننے سے انسان مجبور محض بن جاتا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ تقدیر ایک غیبی مسئلہ ہے جس کا انسان کو کوئی علم نہیں، لہٰذا صرف اسے ماننے پر مجبوری لازم نہیں آتی کیونکہ دوسری طرف انسان کے لیے مشیت اور ارادہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ثابت فرمایا ہے:

﴿ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ ﴾

''پس جو چاہے (اس پر) ایمان لائے اور جو چاہے منکر رہے۔''[1]

اسی طرح سورۂ فرقان (58:25) اور سورۂ مدثر (74:37 و 55) میں آیا ہے۔ بلکہ انسان کی اپنی مشیت اور ارادے میں آزادی شَآءَ کے صیغے سے نو مرتبہ، شِئْتَ کے لفظ سے دو مرتبہ، شِئْتُمَا دو مرتبہ، شِئْتُمْ پانچ مرتبہ، تَشَآءُونَ دو مرتبہ، یَشَاءُ دو مرتبہ، یَشَاءُونَ دو مرتبہ اور صیغہ نَشَاءُ سے ایک مرتبہ بیان ہوا ہے۔ ان سب آیات میں بندے کے لیے اثبات مشیت کا ذکر ہے اور اسی طرح صفت ارادہ ماضی کے مختلف صیغوں سے بیس مرتبہ اور مضارع کے صیغوں سے اس سے بھی زیادہ مرتبہ وارد ہے، لہٰذا انسان صاحب ارادہ و اختیار ہے، پس اس صفت سے متصف شخص کو مجبور نہیں کہا جاسکتا۔ اسی ارادہ و اختیار کی وجہ سے انسان اللہ تعالیٰ کے احکام کا مکلّف ہے۔ جزا و سزا (مکافات عمل) اسی پر مبنی ہے۔ اس مسئلے میں یہ کتاب زیادہ تفصیل کی متحمل نہیں۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ قرآن کریم کی بہت سی آیات میں تقدیر الٰہی اور اس کی کتابت کا صریح ذکر موجود ہے اور اس مسئلے میں پرویزی تاویلات خالص دھوکا دہی ہیں اور عقیدۂ تقدیر کو مجوسی تحریک کا نام دینا صریح کفر ہے۔

معجزات

قرآن کریم میں جتنے معجزات اور خرق عادت واقعات کا ذکر ہے انھیں کسی تحریف و

[1] الکہف 29:18.

تاویل کے بغیر ماننا ایمان بالقرآن کا ایک لازمی جزو ہے۔ اس قسم کے امور جو انبیاء علیہم السلام کے ہاتھوں یا ان کی دعاؤں سے اللہ تعالیٰ کے حکم سے ظاہر ہوتے ہیں وہ معجزہ کہلاتے ہیں اور جب اس طرح کے امور اللہ کے کسی ولی سے ظاہر ہوں تو انھیں کرامت کہتے ہیں۔ تمام اہل علم اس بات پر متفق ہیں کہ ان امور کے ظاہر ہونے میں انبیاء علیہم السلام اور اولیائے کرام کا کوئی اختیار نہیں ہوتا۔ ان سے ایسے امور کا ظاہر ہونا ایسے ہی ہے جیسے قلم سے کتابت۔ اس کتابت میں قلم کا کوئی اختیار نہیں۔ انھی امور کی چند مثالیں درج ذیل آیات میں ہیں:

[1] سورۂ بقرہ کی آیات (2:55,56 و 73 و 243 و 258,259) میں اسی دنیا میں موت کے بعد معجزہ وکرامت کے طور پر دوبارہ زندہ ہونا ثابت ہے جس میں تاویل کی کوئی گنجائش نہیں اور سورۂ آل عمران (3:49) میں عیسیٰ علیہ السلام کے معجزے کا ذکر ہے۔

پرویزی لاجواب ہوگیا: ایک مجلس میں مجھ سے ایک پرویزیت زدہ شخص نے پوچھا کہ مولوی صاحبان کہتے ہیں کہ فلاں فلاں واقعے میں انسان اس دنیا میں موت کے بعد دوبارہ زندہ ہوا، حالانکہ یہ قرآن کے قانون کے خلاف ہے کیونکہ قرآن کے قانون کے مطابق انسان مرنے کے بعد قیامت کے دن دوبارہ اٹھایا جائے گا جبکہ ان واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس دنیا میں فوت ہوئے اور اسی دنیا میں دوبارہ زندہ کیے گئے۔ یہ تو قانون قرآن کے خلاف ہے۔ میں نے اس سے پوچھا: قیامت کے روز دوبارہ زندہ کیے جانے کو آپ کیوں تسلیم کرتے ہیں؟ اس نے کہا: یہ قرآن میں مذکور ہے۔ میں نے کہا: دنیا میں مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کرنے کے واقعات بھی تو قرآن میں مذکور ہیں تو

﴿ أَفَتُؤْمِنُونَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُونَ بِبَعْضٍ ﴾

''کیا تم کتاب کے بعض حصے پر ایمان لاتے ہو اور بعض حصے کا انکار کرتے ہو۔''[1]

[1] البقرۃ 2:85.

وہ شخص لاجواب ہو کر خاموش ہو گیا۔

[2] یحییٰ علیہ السلام کی ولادت اس حالت میں ہوئی کہ اس عمر میں والدین عام طور پر افزائش نسل کے اہل نہیں ہوتے۔ ①

[3] عیسیٰ علیہ السلام کا باپ کے بغیر پیدا ہونا۔ ②

[4] مریم علیہا السلام کو ظاہری اسباب کے بغیر بند کمرے میں رزق پہنچنا۔ ③

[5] اسحاق علیہ السلام کی ولادت اس حالت میں ہوئی کہ اس عمر میں والدین عام طور پر افزائش نسل کے اہل نہیں ہوتے۔ ④

[6] صالح علیہ السلام کے دور میں کسی عام سبب کے بغیر پہاڑ سے اونٹنی کا ظاہر ہونا۔ ⑤

[7] نبی ﷺ کا واقعۂ اسراء و معراج۔ ⑥

[8] اصحاب کہف کا غار میں دھوپ سے بچنا۔ ⑦

اور کوئی ظاہری سبب ان کا معاون نہیں تھا، پھر بھی اللہ تعالیٰ نے انھیں لوگوں سے محفوظ رکھا اور 309 سال غار میں سلائے رکھا۔ ⑧

[9] موسیٰ علیہ السلام کے عصا کا سانپ بن جانا، پھر واپس عصا بن جانا اور ہاتھ کا چمک دار بن جانا۔ ⑨

[10] ابراہیم علیہ السلام کا آگ میں محفوظ رہنا۔ ⑩

[11] ملکۂ سبا کے تخت کا ایک ہی لمحے میں حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس پہنچایا جانا۔ ⑪

[12] نبی ﷺ کے اشارے سے چاند کے دو ٹکڑے ہو جانا۔ ⑫

[13] اصحاب فیل کو کنکریوں کی بارش کے ذریعے سے تباہ و برباد کرنا۔ ⑬

① آل عمرٰن 3:39. ② آل عمرٰن 3:47. ③ آل عمرٰن 3:37. ④ هود 11:71. ⑤ هود 11:64.
⑥ بنيّ إسرآءيل 17:1، والنجم 53:13-18. ⑦ الكهف 18:17. ⑧ الكهف 18:18-25.
⑨ طٰه 20:20-22. ⑩ الأنبيآء 21:69. ⑪ النمل 27:40. ⑫ القمر 54:1. ⑬ الفيل 105:1-5.

قرآن کریم میں اس قسم کی اور بھی واضح آیات مذکور ہیں جو خرق عادت ہیں، لہٰذا انھیں معجزات اور کرامات سے تعبیر کیا جاتا ہے لیکن اس باب میں سر سید نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے:
''ہمارا معجزات سے انکار اس بنا پر ہے کہ قرآن مجید سے معجزات اور کرامات، یعنی ظہور امور کا بطور خرق عادت، یعنی خلافِ فطرت یا خلاف جبلّت کے امتناع پایا جاتا ہے جس کو ہم مختصر لفظوں میں یوں تعبیر کرتے ہیں کہ کوئی امر خلاف قانون قدرت نہیں ہوتا۔''[1]

سر سید نے اس عبارت میں معجزے سے انکار کرنے میں دھوکہ دہی سے کام لیا کہ پہلے تو یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ معجزہ خلافِ قانونِ قدرت چیز ہوتی ہے اور قرآن مجید سے یہ بات ثابت ہے کہ کوئی چیز قانونِ قدرت کے خلاف واقع نہیں ہوسکتی، لہٰذا معجزہ بھی واقع نہیں ہوسکتا اور اگر یہ معاملہ قانونِ قدرت کے تحت ہے، پھر وہ معجزہ نہیں ہے کیونکہ جس شخص کو یہ قانونِ قدرت معلوم ہو جائے وہ اسے وجود میں لاسکتا ہے۔ یہ اس کے استدلال کی توضیح تھی۔ اس استدلال میں انھوں نے دھوکہ دہی سے کام لیا ہے، بات یہ ہے کہ معجزہ کسی کے نزدیک بھی قدرت الٰہیہ کے خلاف نہیں ہوتا بلکہ خلاف عادت ہوتا ہے اور مخلوق کی قدرت سے خارج ہوتا ہے، لہٰذا مذکورہ غلط استدلال سے انکار معجزات جہالت ہے، پھر انھوں نے قرآن مجید میں مذکور معجزات کی ایسی مضحکہ خیز تاویلات کی ہیں جن کے باطل ہونے میں کوئی شک نہیں، مثلاً: ابراہیم علیہ السلام کی آگ کی تاویل کرتے ہوئے کہا: ''یہ کفار کی طرف سے مخالف تدبیریں تھیں۔''[2]

اصحاب فیل کے متعلق ﴿تَرْمِيهِم بِحِجَارَةٍ مِّن سِجِّيلٍ﴾ کا معنی کیا ہے کہ ابرہہ کے لشکر میں چیچک کی وبا پھوٹ پڑی تھی جس کی وجہ سے اس کی فوج ہلاک ہوگئی۔

موسیٰ علیہ السلام کے عصا اور ید بیضا کے متعلق کہا کہ یہ کیفیت جو موسیٰ علیہ السلام پر طاری ہوئی، یہ

[1] تفسیر القرآن: 37/1۔ [2] تفسیر القرآن، دیباچہ: 17/1۔

اسی قوت نفس انسانی کا ظہور تھا۔ یہ کوئی معجزہ یا فوق الفطرت چیز نہ تھی۔ انھوں نے اپنے خیال سے وہ عصا پھینک دیا کہ شاید یہ سانپ یا اژدہا ہے، جبکہ وہ لکڑی تھی اس میں فی الواقع کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ موسیٰ علیہ السلام اور ان کے ماننے والوں کے لیے دریا کا خشک ہونا اور اس میں راستے بننے کے متعلق کہا کہ کوئی دریا پھٹا نہ کوئی خلاف عادت معجزہ ظہور میں آیا بلکہ اس دریا کی سمندر کی طرح عادت تھی کہ اس میں مدوجزر، چڑھنا اترنا، آناً فاناً ہوا کرتا تھا۔[1]

اور پتھر سے جاری ہونے والے بارہ چشموں کے متعلق لکھتے ہیں کہ حجر سے مراد پہاڑ اور ضرب سے مراد سفر کرنا ہے، یعنی اپنی لاٹھی کے سہارے پہاڑ پر چل، اس پہاڑ کے پرے ایک مقام ہے جہاں پانی کے بارہ چشمے جاری ہیں۔[2]

اسی طرح عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات کا انکار کر کے ایسی تاویلات کیں جو قرآن کی فصاحت و بلاغت کے یکسر خلاف ہیں۔

یہ تو پرویز صاحب کے مقتدا سرسید احمد خاں کا نظریہ تھا۔ ان کی اندھی تقلید کرتے ہوئے پرویز صاحب کا انکارِ معجزات کا نیا طریقہ سن لیں۔

وہ کہتے ہیں: ''قرآن میں الفاظ کا ترجمہ نہیں ہوسکتا بلکہ الفاظ کا مفہوم بیان کیا جائے۔''[3]

پھر انھوں نے اس قانون کو قرآنی آیات میں تحریف اور بالخصوص آیات معجزات میں تاویل کرنے کے لیے حیلہ بنا کر معجزات کا انکار کیا۔ پرویز صاحب انکار معجزات میں سر سید کے ساتھ موافقت رکھتے ہیں، بس طریقۂ کار مختلف ہے۔ آیات معجزات بیان کرنے سے پہلے ہم معنی، مفہوم اور ترجمے کے الفاظ کی وضاحت پر اجمالاً نظر ڈالتے ہیں:

[1] تفسیر القرآن، تفسیر سورۃ البقرۃ : 102,101/1، آیت: 47، وتفسیر سورۃ الأعراف، بیان عصائے موسیٰ علیہ السلام وبیان یدبیضا: 3/171-173، آیت: 104. [2] تفسیر القرآن، تفسیر سورۃ البقرۃ: 113/1، آیت: 47. [3] کتاب مفہوم القرآن.

✿ لفظی معنی: یہ وہ معنی ہے جو لغت کے لحاظ سے اس لفظ سے مقصود ہوتا ہے اور کبھی لفظی معنی کو مصداق بھی کہہ دیتے ہیں۔

✿ مفہوم: وہ مقصود ہے جو لفظی معنی سے سمجھ میں آتا ہے، اس کی دو اقسام ہیں:

① **مفہوم موافق**: جو لفظی معنی کے ساتھ اثبات کے پہلو سے برابر ہو۔

② **مفہوم مخالف**: جو لفظی معنی کے مخالف سمت، یعنی نفی کے طور پر دلالت کرتا ہو لیکن دونوں صورتوں میں شرط یہ ہے کہ وہ اہل لغت کے محاورات کے مطابق ہو، البتہ کبھی لفظی معنی کو مفہوم بھی کہہ دیا جاتا ہے۔

✿ ترجمہ: دراصل تعبیر اور عنوان کو کہا جاتا ہے، خواہ اس کا معنی ہو یا مفہوم یا مضمون، جیسا کہ ترجمان اس شخص کو کہا جاتا ہے جو دو اجنبی زبان والوں کے درمیان رابطے کا فریضہ سرانجام دیتا ہے اور دوسرے کو سمجھانے کے لیے ایسی تعبیر کرتا ہے کہ جس سے اس کا مضمون دوسرے کو سمجھ آ جائے۔

ہاں، یہ بات طے ہے کہ جتنی فصاحت و بلاغت عربی الفاظ کے ذریعے سے قرآن میں سمو دی گئی ہے اتنی فصاحت و بلاغت کسی دوسری لغت میں نہیں پائی جاتی، مثلاً: ''الحمد للّٰہ'' کے جملے میں الف لام کا مقصد، حمد کا پورا معنی اور جملہ اسمیہ لانے میں جتنی فصاحت و بلاغت ہے وہ بمشکل ہی دوسری لغت میں آ سکتی ہے لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ہم قرآن کریم کے ہر لفظ و جملے کے حوالے سے یہ قانون لاگو کر دیں اور قطعی فیصلہ صادر کر دیں کہ قرآن کریم کا ترجمہ نہیں ہو سکتا۔

اکثر مفردات ایسے ہیں جن کے لفظی معانی اہل لغت کو معلوم ہیں اور اس سے ہر اہل لغت اپنی لغت کی تعبیر کر سکتا ہے۔ اسی طرح ہم یہ بھی واضح کرتے ہیں کہ ترجمہ چھوڑ کر مفہوم لینے میں یہ شرط ہے کہ عربی محاورے کے تحت ہو لیکن آپ کو آگے چل کر معلوم

ہو جائے گا کہ پرویز صاحب نے مفہوم لینے کے بہانے قرآنی الفاظ کے ایسے معانی بیان کیے ہیں جن کا مفہوم، محاورۂ عرب سے بہت دور ہے کیونکہ عربی زبان والے اب بھی موجود ہیں۔ ان سے پوچھا جائے کہ پرویز صاحب نے فلاں لفظ اور فلاں آیت کا یہ مفہوم مراد لیا ہے کیا یہ مفہوم آپ کے نزدیک عربیت کی بنیاد پر درست ہے؟ تو ان کا جواب یقیناً نفی میں ہوگا۔

اب ہم پرویزی مفہوم کی بنا پر آیات معجزات کے حوالے سے چند مثالیں پیش کرتے ہیں تاکہ آپ کو معلوم ہو جائے کہ انھوں نے مفہوم کے بہانے کتنے قطعی اور یقینی معجزات کا انکار کیا ہے۔

1. **ابراہیم علیہ السلام کا آگ میں پھینکا جانا:** انھوں نے آگ کا معنی عداوت اور انتقام کی آگ کیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ ایسی آگ کو اللہ تعالیٰ کا یہ فرمانا: ''سلامتی والی، ٹھنڈی ہو جا'' کیسے ہو سکتا ہے؟

2. اللہ تعالیٰ کے فرمان:

﴿ فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ اِلَيْكَ ﴾

''پھر تو چار پرندے لے اور انھیں اپنے ساتھ مانوس کر لینے کے بعد ٹکڑے کر دے۔''[1]

پرویز صاحب مفہوم بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: چار پرندے لو، وہ شروع میں تم سے دور بھاگیں گے۔ انھیں آہستہ آہستہ اس طرح سدھاؤ کہ وہ تم سے مانوس ہو جائیں۔ آخر میں لکھتے ہیں: بس حق سے نامانوس لوگوں میں زندگی پیدا کرنے کا یہی طریقہ ہے۔

دیکھیں اللہ تعالیٰ مردوں کو دوبارہ زندہ کرنے کا طریقہ بتلا رہا ہے جبکہ پرویز صاحب نے اس کا تعلق جاہل قوموں کے ساتھ جوڑ دیا۔ کیا جاہل لوگوں کے احیا کا یہ طریقہ ہے کہ

[1] البقرۃ 2:260۔

چار پہاڑوں پر پرندے رکھ کر ان کو آواز دو؟ اس کی کیا مناسبت ہے؟ ﴿ فَصُرْهُنَّ ﴾ کے معنی میں تفصیلی تحقیق ہم نے اپنی تفسیر احسن الکلام میں بیان کر دی ہے کہ اس کا معنی مانوس کرنا نہیں، اگر ہے تو اس کے ساتھ قطع (کاٹنے) کا حکم ضرور لگانا پڑے گا جس کا قرینہ اس آیت میں موجود لفظ جزء ہے کیونکہ اجزاء قطع کرنے سے پیدا ہوئے ہیں۔

③ فرمانِ الٰہی ہے:

﴿ فَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اَنِ اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْبَحْرَ ﴾

''تب ہم نے موسیٰ کی طرف وحی کی کہ اپنا عصا سمندر پر مار۔''[1]

❁ پرویزی مفہوم: ہم نے موسیٰ کی طرف وحی بھیجی کہ اپنی جماعت کو (فلاں سمت سے) سمندر یا دریا کی طرف لے چلو اور وہاں اس کو اس راستے سے پار لے جاؤ جو خشک ہو چکا ہے۔

﴿ فَانْفَلَقَ فَكَانَ كُلُّ فِرْقٍ كَالطَّوْدِ الْعَظِيْمِ ○ ﴾

''تو وہ پھٹ گیا، پھر (سمندر کا) ہر ٹکڑا یوں ہو گیا جیسے عظیم پہاڑ۔''[2]

جب صبح نمودار ہوئی تو کیا دیکھتے ہیں کہ دونوں جماعتیں عظیم تودوں کی طرح ایک دوسرے کے بالمقابل کھڑی ہیں۔[3] انھوں نے ''عصا'' کا معنی ''جماعت'' ﴿اضْرِبْ﴾ کا معنی ''لے جا'' ﴿ انْفَلَقَ ﴾ کا معنی ''صبح کا نمودار ہونا'' ﴿ فِرْقٍ ﴾ سے مراد ''دونوں جماعتیں'' کیا ہے۔ یہ مفہوم سراسر ناقابل فہم اور باطل ہے، یہ واضح طور پر پرویز صاحب کی ذہنی اختراع ہے، جو حقیقت سے بالکل دور ہے۔

اس وقت بنی اسرائیل فرعون کے لشکر کا مقابلہ کرنے کی تاب کہاں رکھتے تھے۔

④ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

① الشعرآء 26:63. ② الشعرآء 26:63. ③ تفسیر القرآن 841/1.

﴿ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ﴾

''تو ہم نے کہا: اپنی لاٹھی پتھر پر مار۔''[1]

❁ پرویزی مفہوم: تو ہم نے اس کی راہنمائی اس مقام کی طرف کردی جہاں بارہ چشمے مستور تھے، وہ اپنی جماعت کو لے کر وہاں پہنچا۔ چٹان پر سے مٹی ہٹائی......

دیکھیے: قلنا کا معنی ''راہنمائی کرنا'' ﴿اضْرِبْ﴾ ''لے جانا'' عصا ''جماعت'' ﴿الْحَجَرَ﴾ ''چٹان سے مٹی ہٹانا'' اللہ تعالیٰ کے عظیم کلام میں اپنی طرف سے پیوندکاری تحریف معنوی نہیں تو اور کیا ہے؟

5 اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَمَا تِلْكَ بِيَمِينِكَ يٰمُوسٰى ۝ ﴾

''اور اے موسیٰ! یہ تیرے دائیں ہاتھ میں کیا ہے؟''[2]

❁ پرویزی مفہوم: اے موسیٰ! تم ان امکانات و ہدایات پر قوت اور برکت ہر دو نکات و نگاہ سے غور کرو اور بتاؤ کہ تم انھیں کیسا پاتے ہو؟

﴿ قَالَ هِيَ عَصَايَ اَتَوَكَّؤُا عَلَيْهَا وَاَهُشُّ بِهَا عَلٰى غَنَمِي ﴾

''اس نے کہا: یہ میری لاٹھی ہے، میں اس پر ٹیک لگاتا ہوں اور اس سے اپنی بکریوں کے لیے پتے جھاڑتا ہوں۔''[3]

❁ پرویزی مفہوم: موسیٰ نے کہا: یا بارالٰہی! یہ احکام کیا ہیں، میرے لیے سفر زندگی کے لیے بہت بڑا سہارا ہے انھی کے ذریعہ اب میں اپنے ریوڑ (بنی اسرائیل) کو جھنجھوڑتا ہوں۔

﴿ قَالَ اَلْقِهَا يٰمُوسٰى ۝ ﴾

''اللہ نے فرمایا: اے موسیٰ! اسے پھینک دے۔''[4]

① البقرۃ 60:2. ② طٰہٰ 17:20. ③ طٰہٰ 18:20. ④ طٰہٰ 19:20.

❁ پرویزی مفہوم: حکم ہوا کہ تم نے ٹھیک سمجھا اب انھیں لوگوں کے سامنے پیش کرو۔

﴿ فَأَلْقٰهَا فَإِذَا هِيَ حَيَّةٌ تَسْعٰى ○﴾

''پھر جب اس نے اسے پھینکا، تب وہ دوڑتا ہوا سانپ بن گیا۔''[1]

❁ پرویزی مفہوم: اس کے بعد جب موسیٰ علیہ السلام نے اس مہم پر غور کیا تو معلوم ہوا کہ ان احکام کو لوگوں کے سامنے پیش کرنا آسان کام نہیں، انھوں نے ایسا محسوس کیا کہ وہ ضابطہ نہیں اژدہا ہے جو بڑی تیزی سے دوڑتا ہے۔

مندرجہ بالا مفہوم کو ذرا عقل اور قانون عربیت کے میزان پر تولو، انھوں نے اب ''عصا'' کا معنی احکامات و ہدایت کیا ہے جبکہ پہلے جماعت کا معنی کیا تھا۔ ﴿ أَتَوَكَّؤُا ﴾ کا مفہوم ''سفر زندگی کا سہارا'' ﴿غَنَمِي﴾ سے مراد ''بنی اسرائیل'' ﴿ أَلْقِهَا ﴾ کا معنی ''لوگوں کے سامنے پیش کرو۔'' (وہاں لوگ کہاں تھے) ﴿حَيَّةٌ﴾ کا معنی مُشکل کام، تو یہ ایک تصوراتی اژدہا تھا۔

دیوانے لوگوں کا کلام سوچ اور سمجھ سے عاری ہوتا ہے، اسی لیے پرویز صاحب نے ایک جگہ عصائے کلیمی اور اژدہا بننے کو حقیقت پر محمول کیا ہے، لکھتے ہیں: ''عصائے موسیٰ نے وہ کرشمہ دکھایا کہ خود ساحرین فرعون نے صداقت کے سامنے گردنیں جھکا دیں۔ اسے مذہبی اصطلاح میں معجزہ کہا جاتا ہے۔''[2] لیکن اس کی مخالفت میں مندرجہ بالا تفسیر خالصتاً معجزے سے انکار ہے۔ یہ دیوانگی، سراسیمگی یا خواہش پرستی نہیں تو اور کیا ہے؟

❻ فرمان الٰہی ہے:

﴿ وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ ﴾

''وہ جھولے میں لوگوں سے باتیں کرے گا۔''[3]

[1] طٰہٰ 20:20. [2] معراج انسانیت، ص: 703. [3] آل عمران 46:3.

پرویز صاحب نے ایک جگہ ''مھد'' کا معنی گہوارہ لکھا ہے[1] لیکن اپنی تفسیر میں اس کا معنی ''چھوٹی عمر'' کیا ہے، پھر اس کی تفسیر اس طرح بیان کرتے ہیں: حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جو کچھ کہا وہ خود اس حقیقت پر دلالت کرتا ہے کہ یہ باتیں سچ مچ گہوارے میں لیٹے ہوئے نہیں کی گئیں۔ یہ اس زمانے کی باتیں ہیں جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو نبوت مل چکی تھی۔[2]

دیکھیں اس بیان میں واقعۂ مریم علیہا السلام اور قصۂ ولادت عیسیٰ علیہ السلام کے مقصد کو یکسر بدل دیا۔ اللہ تعالیٰ نے مریم علیہا السلام کی پاک بازی کے لیے یہ معجزہ عطا فرمایا کہ بچے نے ماں کی گود میں باتیں کیں تاکہ لوگ مریم علیہا السلام کی عفت اور پاک دامنی پر یقین کریں جبکہ پرویز صاحب نے یہ سارا معاملہ بدل دیا۔

⑦ فرمانِ الٰہی ہے:

﴿ وَأُحْيِ الْمَوْتَىٰ بِإِذْنِ اللَّهِ ﴾

''اور میں (عیسیٰ) اللہ کے حکم سے مردوں کو زندہ کر دیتا ہوں۔''[3]

پرویز صاحب اس کا مفہوم یوں بیان کرتے ہیں: ''مختصراً یہ کہ ذلت وخواری کی یہ موت جو اس وقت تم پر چاروں طرف سے چھا رہی ہے ایک نئی زندگی میں بدل جائے گی۔''

یہ عیسیٰ علیہ السلام کے معجزے کا صریح انکار ہے، نیز انھوں نے تحریف کے ذریعے سے عیسیٰ علیہ السلام کے دوسرے معجزات کا بھی انکار کیا ہے۔

⑧ یونس علیہ السلام کے متعلق فرمانِ الٰہی ہے:

﴿ فَلَوْلَا أَنَّهُ كَانَ مِنَ الْمُسَبِّحِينَ ○ لَلَبِثَ فِي بَطْنِهِ إِلَىٰ يَوْمِ يُبْعَثُونَ ○ ﴾

''پھر اگر وہ تسبیح نہ کرتا تو اس کے پیٹ میں قیامت تک پڑا رہتا۔''[4]

① لغات القرآن، ص: 1572. ② تفسیر القرآن، ص: 129. ③ آل عمرٰن 3:49. ④ الصّٰفّٰت 37:143،144.

❊ پرویزی مفہوم: لیکن اس نے بہت ہاتھ پاؤں مارے اور مچھلی کی گرفت سے اپنے آپ کو چھڑا لیا۔ اگر وہ ایسا نہ کرتا اور بہت اچھا تیراک نہ ہوتا تو مچھلی اسے نگل لیتی اور پھر وہ قیامت تک باہر نہ آسکتا، یعنی کبھی باہر نہ آسکتا۔

پرویز صاحب نے خیال کیا کہ ﴿ اَلْمُسَبِّحِيْنَ ﴾ سباحة ''پانی میں تیرنا'' سے ماخوذ ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ یونس علیہ السلام کو مچھلی نے نہیں نگلا تھا بلکہ وہ دریا میں گر پڑے اور تیراکی کی وجہ سے اس سے بچ گئے، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ''سَابِحٌ'' کا معنی ہے، تیرنے والا جبکہ ''مُسَبِّحٌ'' تو بہر صورت تسبیح سے ماخوذ ہے، نیز دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے یونس علیہ السلام کے تسبیح پڑھنے کا ذکر کیا ہے:

﴿ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ ۖ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ○ ﴾

''تیرے سوا کوئی معبود برحق نہیں ہے، تو پاک ہے، بلاشبہ میں ظالموں میں سے تھا۔''[1]

اگر مچھلی نے انھیں نہیں نگلا تو پھر الظلمات ''اندھیرے'' کا کیا مطلب؟ اتنی تحریف تو یہود بھی نہیں کر سکے!

⑨ ایوب علیہ السلام کے متعلق قرآن میں بیان کیا گیا ہے:

﴿ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗٓ اَنِّيْ مَسَّنِيَ الشَّيْطٰنُ بِنُصْبٍ وَّعَذَابٍ ○ ﴾

''جب اس نے اپنے رب کو پکارا کہ شیطان نے مجھے رنج اور تکلیف پہنچائی ہے۔''[2]

❊ پرویزی مفہوم: وہ ایک سفر میں بڑی جانکاہ مصیبتوں میں مبتلا ہوا۔ اس کے ساتھی اس سے بچھڑ گئے، پانی ختم ہوگیا۔ وہ سفر کی تھکان اور پیاس کی شدت سے نڈھال ہو رہا تھا۔ مزید برآں سانپ نے اسے ڈس لیا۔ اس طرح اسے مصائب اور تکالیف کے ہجوم نے گھیر لیا۔

---

① الأنبیآء 87:21. ② صٓ 41:38.

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ اُرْكُضْ بِرِجْلِكَ ۚ هٰذَا مُغْتَسَلٌۢ بَارِدٌ وَّشَرَابٌ ○ ﴾

''اپنا پاؤں (زمین پر) دے مار (اور لو) یہ ایک ٹھنڈا چشمہ نکل آیا نہانے اور پینے کے لیے۔''[1]

❁ پرویزی مفہوم: ہم نے اس کی ایسے مقام کی طرف راہنمائی کر دی جہاں ٹھنڈے پانی کا چشمہ تھا۔ وہ وہاں پہنچا تو پانی پیا، نہایا، مارگزیدہ پاؤں کو پانی میں رکھ کر ہلاتا رہا جس سے حدت رفع ہوئی۔

پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَخُذْ بِيَدِكَ ضِغْثًا فَاضْرِبْ بِّهٖ وَلَا تَحْنَثْ ﴾

''اور اپنے ہاتھ میں تیلیوں کا مٹھا لو اور اس سے مارو اور قسم نہ توڑو۔''[2]

❁ پرویزی مفہوم: وہ جڑی بوٹیوں سے اپنا علاج کرتا رہا اس طرح اسے شفا ہوگئی۔ اس نے اس تکلیف کو بڑی پامردی سے برداشت کیا اور کہیں بھی ہمارے قانون کی خلاف ورزی نہیں کی۔

پرویز صاحب کا پیش کردہ یہ مفہوم ایک گپ کے سوا کچھ نہیں، سفر کا ذکر، شیطان کا معنی سانپ، ساتھی بچھڑنا، سفر کی تھکان، ﴿ اُرْكُضْ ﴾ کا معنی ہلانا، جڑی بوٹیوں وغیرہ سے علاج کرنا، یہ معانی کس لغت سے اخذ کیے گئے ہیں اور اس طرح کی قرآنی خانہ پری انھوں نے کہاں سے سیکھی؟ بالفرض ان کا یہ من گھڑت قصہ صحیح ہے تب کوئی ان سے پوچھے کہ پانی کے ذریعے سے مارگزیدہ پاؤں کا شفا حاصل کرنا بھی تو ایک معجزہ ہے کیونکہ دنیا میں بہت چشمے ہیں لیکن ان میں تو یہ صفت کمال موجود ہی نہیں۔

---

[1] صٓ 42:38۔ [2] صٓ 44:38۔

10 اصحاب فیل کے قصے میں سر سید صاحب نے ایک خاص طرز سے تحریف کی تھی، جیسا کہ پہلے، ص:51 میں اس کا ذکر گزر چکا ہے۔ پرویز صاحب نے اپنے الگ طریقے سے تحریف کی، تاہم دونوں نے کوشش کی کہ اس قصے میں سے معجزے کا پہلو ختم کردیا جائے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَّاَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا اَبَابِيْلَ ۝ ﴾

''اور ان کے اوپر جھنڈ کے جھنڈ پرندے بھیجے۔''[1]

❁ پرویزی مفہوم: چیلوں اور گدھوں کے جھنڈ (جو عام طور پر لشکر کے ساتھ ساتھ اڑتے ہیں کیونکہ انھیں فطری طور پر معلوم ہوتا ہے کہ انھیں بہت سی لاشیں کھانے کو ملیں گی) ان کے سروں پر منڈلاتے ہوئے آگئے اور اس طرح تم نے دور سے بھانپ لیا کہ پہاڑ کے نیچے کوئی لشکر آرہا ہے، چنانچہ تم نے پہاڑ پر چڑھ کر ان پر سخت پتھراؤ کیا۔[2]

واہ واہ! کس قدر عجیب فہم ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں بے شمار جنگیں ہوئیں۔ چیلوں اور گدھوں نے وہاں یہ فطری علم استعمال نہیں کیا بلکہ کسی بھی تاریخی جنگ میں اس کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ بفرض محال ایسا ہوا بھی ہے تو بھی یہ معجزہ ہوا۔ ﴿ سِجِّيْلٍ ﴾ ''اس مٹی کو کہتے ہیں جو آگ میں پک کر پتھر بن جائے۔'' پرویز صاحب نے بھی لغات القرآن میں اس کا معنی کنکر لکھا ہے[3] تو ایسے کنکر پہاڑوں کے اوپر کیسے ملتے ہیں، پھر ان کے مارنے سے ہاتھی کیسے ہلاک ہوئے۔ (عقل تسلیم نہیں کرتی) پھر ﴿ تَرْمِيْهِمْ ﴾ میں ''ترمی'' تو مؤنث کا صیغہ ہے جس کا فاعل ابابیل کے علاوہ یہاں کوئی اور نہیں ہوسکتا جبکہ پرویز صاحب نے اسے جمع مذکر مخاطب کا صیغہ سمجھا۔ تعجب ہے ایسی تفسیر پر!

11 واقعۂ اسراء میں پرویز صاحب نے مسجد اقصیٰ کا معنی مدینہ کی طرف کشادہ سرزمین کیا ہے اور اس واقعے کو ہجرت کے ساتھ منسلک کیا ہے۔ کیا کسی عربی لغت یا عجم کے عرف

❁

[1] الفیل 105:3. [2] تفسیر القرآن، ص:1484. [3] لغات القرآن، ص:852.

میں یا یہود و نصاریٰ کے نزدیک مسجد اقصیٰ سے مراد" مدینہ کی طرف کشادہ سرزمین" آج تک کبھی کسی نے سنا ہے؟ ایسی تاویلات تو عقل مندوں کے نزدیک نہایت تعجب کی بات ہوتی ہیں۔

قرآن کریم میں ان کے علاوہ اور بھی نصوص ہیں جو معجزات پر دلالت کرتی ہیں۔ پرویز صاحب نے ان سب میں تحریف کر کے اعجازی صورت ختم کردی بلکہ انھوں نے لکھا ہے:

"رسول اللہ ﷺ کو قرآن کے سوا کوئی معجزہ نہیں دیا گیا۔"[1]

آخرت پر ایمان

ایمانیات میں ایک اہم رکن آخرت پر ایمان لانا ہے۔ اسی لیے قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کے ساتھ اکثر مقامات پر آخرت پر ایمان لانے کا ذکر آتا ہے۔ قرآن کریم میں اس عقیدے کی تفصیلات میں درج ذیل آٹھ عنوانات ہیں:

1 نفخۂ اولی: پہلی مرتبہ صور پھونکنے سے عالم دنیوی، آسمان، زمین اور پہاڑ وغیرہ سب فنا ہو جائیں گے جبکہ نفخۂ ثانیہ، یعنی دوسری مرتبہ صور پھونکنے سے مردے زندہ ہو کر قبروں سے باہر نکل آئیں گے۔ اس کے متعلق بہت سی آیات ہیں: (الأنعام 73:6، النمل 87:27، الزمر 68:39، الحاقة 13:69) اس میں فنا کا ذکر ہے (الکھف 99:18، طٰہٰ 102:20، المؤمنون 101:23، یٰسٓ 51:36، النبا 18:78، قٓ 20:50) اس میں بعث بعد الموت کا ذکر ہے۔ اسی طرح آسمان کے حالات (الأنبیآء 104:21، الفرقان 25:25، الطور 9:52) زمین کے حالات، (إبراھیم 48:14، الزمر 69,68:39، قٓ 44:50) اس کے متعلق اور بہت سی آیات ہیں۔ پہاڑوں کے حالات: (الکھف 47:18،

[1] مکتوبات، سلیم کے نام خط: 36/3 اور تفسیر معارف القرآن: 731/4.

طٰہٰ 105:20، النمل 27: 88، الطور 10:52، الحآقة 14:69) ان کے علاوہ بھی بہت سی آیات میں ان کا ذکر ہے۔

2 **سوال، حساب، عرض اور وزن اعمال:** سوال کے متعلق چند آیات: (الأعراف 6:7، الحجر 92:15، النحل 52:16، الأحزاب 15:33-18)

حساب کے متعلق: (البقرة 284,202:2، آل عمرٰن 199,19:3، المآئدة 4:5، الأنعام 69,62,52:6)

عرض کے متعلق: (الکھف 48:18، الحآقة 18:69، ھود 18:11، الشورٰی 45:42)

وزن اعمال کے متعلق: (الأعراف 9,8:7، الأنبیآء 47:21، المؤمنون 103,102:23، القارعة 7,6:101)

3 **دنیا میں اعمال کا لکھا جانا اور آخرت میں نامۂ اعمال کی تقسیم:** اعمال لکھے جانے کے متعلق آیات: (آل عمرٰن 181:3، النسآء 81:4، یونس 21:10، مریم 79:19)

نامۂ اعمال کی تقسیم: (بنيٓ إسرآءیل 13:17، 14 و 71، الکھف 49:18، الزمر 29:39)

4 **انبیاء، فرشتوں اور مومنوں کی شہادت سے متعلق آیات:** (البقرة 143:2، النسآء 141:4 و 151، المآئدة 117:5، ھود 18:11، الحج 78:22، القصص 75:28، المزمل 15:73)

انسان کے اعضاء کی شہادت: (النور 24:24، یٰسٓ 65:36، حٰمٓ السجدة 20:41 و 22)

اپنی جان پر شہادت: (الأنعام 130:6، الأعراف 37:7)

5 **نسبی تعلقات ختم ہونا، ایک دوسرے سے بھاگنا، دوستی اور بلا اذن شفاعت کا نہ ہونا:** ان کا ذکر ان آیات میں ہے: (البقرة 48:2 و 123 و 254، الأعراف 53:7،

الأنبیآء 28:21، المؤمنون 23:101، الشعرآء 26:100، الزخرف 43:67، عبس 80:34)

6 **جنت، اہل جنت، جہنم، اہل جہنم اور آخرت کے تفصیلی احوال:** **جنت اور اہل جنت:** (البقرۃ 2:35و81 و240، اٰل عمرٰن 3:133و 151، النسآء 4:192، الرعد 13:35، العنکبوت 29:58، الزخرف 43:70)

جہنم اور اہل جہنم: (البقرۃ 2:39 و 81 و217، اٰل عمرٰن 3:116، المآئدۃ 5:72)

آخرت کے متعلق: (یونس 10:26، ھود 11:23، الفرقان 25:24، یٰسٓ 36:55)

اہل جنت کا جنت میں ہمیشہ رہنے کا ذکر 40 مرتبہ اور اہل جہنم کا جہنم میں ہمیشہ رہنے کا ذکر 39 مرتبہ آیا ہے۔

7 قرآن کریم میں قیامت کے لیے 33 نام آئے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کے صفاتی نام ہونے پر ایمان لانا فرض ہے جبکہ جنت کے لیے بارہ اور جہنم کے لیے آٹھ نام ہیں۔ یہ ساری چیزیں ایمانیات میں داخل ہیں۔

8 **آخرت پر ایمان لانا فرض اور حصول جنت کا باعث ہے دیکھیں:** (البقرۃ 2:62 و 177، اٰل عمرٰن 3:114، الأنعام 6:92)

انکارِ آخرت کفر اور ہمیشہ کے لیے جہنم میں داخلے کا باعث ہے: (النسآء 4:136، الأنعام 6:31، الأعراف 7:147، التوبۃ 9:29، النحل 16:22)

میں نے انھی آیات کریمہ پر تفصیلاً اپنی کتاب ''الفرائد الربانیۃ'' میں روشنی ڈالی ہے۔ یہ آٹھ عنوانات اس لیے بیان کیے گئے ہیں کہ آخرت پر ایمان لانے میں یہ ساری چیزیں شامل ہیں۔ پس جو شخص میزان، حساب، جنت یا جہنم کا منکر ہو تو اس کا آخرت پر ایمان صحیح نہیں اور ایسے ہی لوگ منکرین حدیث ہیں، لہٰذا ان کا اس بارے میں عقیدہ جاننا ضروری ہے۔

جنت اور جہنم کے متعلق سرسید کے نظریات

سرسید لکھتے ہیں: ''تمام انسانوں میں، خواہ وہ سرد ملک کے رہنے والے ہوں یا گرم ملک کے، مکان کی آراستگی وخوبی، باغ کی خوشنمائی، بہتے پانی کی دل ربائی، میووں کی تروتازگی سب کے دل پر ایک عجیب کیفیت پیدا کرتی ہے۔ اس کے سوا حسن، خوبصورتی سب سے زیادہ دل پر اثر کرنے والی چیز، خصوصًا جبکہ وہ انسان میں ہو اور اس سے بھی زیادہ جبکہ وہ عورت میں ہو، پس جنت کی ''قرة أعين'' کو ان کی فطری راحتوں کی کیفیات کی تشبیہ میں اور دوزخ کے مصائب کو آگ کے جلنے لہو و پیپ پلائے جانے اور تھوہر کھلائے جانے کی تمثیل میں بیان کیا ہے تاکہ انسان کے دل میں یہ خیال پیدا ہو کہ بڑی سے بڑی لذت وراحت یا سخت سے سخت عذاب وہاں موجود ہے اور درحقیقت جو لذت و راحت یا رنج وکلفت وہاں ہے ان کو اس سے کچھ بھی مناسبت نہیں ہے۔ یہ تو صرف ایک اعلیٰ راحت و احتظاظ یا رنج وکلفت کا خیال پیدا کرنے کو اس پیرایہ میں، جس میں انسان اعلیٰ سے اعلیٰ احتظاظ اور رنج کو خیال کرسکتا تھا، بیان کیا۔ یہ سمجھنا کہ جنت مثل ایک باغ کی پیدا ہوئی ہے، اس میں سنگ مرمر اور موتی کے جڑاؤ محل ہیں، باغ ہیں اور سرسبز درخت ہیں، دودھ اور شراب کی نہریں بہ رہی ہیں، ہر قسم کا میوہ کھانے کو موجود ہے، ساقی اور خادمین نہایت خوبصورت چاندی کے کنگن پہنے ہوئے، جو ہمارے ہاں کی گھوسنیں پہنتی ہیں، شراب پلا رہے ہیں۔ ایک جنتی حور کے گلے میں ہاتھ ڈالے پڑا ہے، ایک نے ران پر سر دھرا ہے، دوسرا چھاتی سے لپٹا ہوا ہے، ایک نے لب جان بخش کا (بااین ریش دُرَخش) بوسہ لیا ہے، کوئی کسی کونے میں کچھ کر رہا ہے، تو کوئی کسی کونے میں کچھ، (یہ سب) بے ہودہ ہے، جس پر تعجب ہوتا ہے، اگر بہشت یہی ہے تو بے مبالغہ ہمارے

خرابات اس سے ہزار درجہ بہتر ہیں۔[1]

اس تحریر اور تمسخر و استہزا سے صریح معلوم ہوا کہ سرسید کے نزدیک جنت اور جہنم کا کوئی خارجی وجود ہے نہ اس کی کوئی حقیقت ہے بلکہ جنت اور جہنم محض تخیلات کی دنیا کے دو مختلف پہلوؤں کے نام ہیں۔ اس کے بعد لکھتے ہیں کہ انھی آیات (جو جنت اور جہنم کے متعلق ہیں) کی نسبت دو مختلف دماغوں کے خیالات پر غور کرو ایک تربیت یافتہ دماغ (سرسید اس سے اپنے ہم خیال لوگ مراد لیتا ہے) خیال کرتا ہے کہ وعدہ، وعید، دوزخ و بہشت کے جو الفاظ بیان ہوتے ہیں ان سے بعینہ وہی اشیاء مقصود نہیں بلکہ ان کا بیان کرنا صرف اعلیٰ درجے کی خوشی وراحت کو فہم انسانی کے لائق تشبیہ میں لانا ہے......اور ایک کوڑ مغز ملّا یا شہوت پرست زاہد (سرسید اس سے وہ لوگ مراد لیتا ہے جو قرآن کے الفاظ اور معانی کو اصل حقیقت پر سمجھتے ہیں) سمجھتا ہے کہ درحقیقت بہشت میں نہایت خوبصورت ان گنت حوریں ملیں گی، شرابیں پئیں گے، میوے کھائیں گے، دودھ وشہد کی ندیوں میں نہائیں گے اور جو دل چاہے وہ مزے اڑائیں گے اور اس لغو بے ہودہ خیال سے دن رات اوامر کے بجالانے اور نواہی سے بچنے کی کوشش کرتا ہے۔[2]

اس تحریر سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص ان آیات پر، جو جنت اور جہنم کی تفصیلات کے متعلق ہیں، ایمان لاتا ہے اور انھیں حقیقت سمجھتا ہے، وہ سرسید کے نزدیک کوڑ مغز اور شہوت پرست ہے۔ مثل مشہور ہے کہ دیوانے شخص کو صحیح الدماغ لوگ بھی دیوانے معلوم ہوتے ہیں۔ قرآن حکیم میں ہے کہ بے وقوف اور جاہل اہل عقل و دانش کو سفہاء (نادان، بے وقوف) سمجھتے ہیں۔ سرسید کے اس نظریے سے لازمی طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ گویا اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے ان آیات کے ذریعے سے لوگوں کو

[1] تفسیر القرآن: 33/1. [2] تفسیر القرآن: 35/1

دھوکا دیا ہے (نعوذ باللہ) کہ حقیقت کچھ بھی نہیں، صرف خیالی جنت اور خیالی جہنم کے لیے انھیں اوامر ونواہی پر عمل کرنے کا حکم دیا۔

اس قسم کی بے ہودہ باتوں کے بعد ایسے لوگوں کے کافر ہونے میں کسی مسلمان کے نزدیک شک کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ اب پرویز صاحب کے خیالات سن لیں:

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَإِنَّ السَّاعَةَ لَآتِيَةٌ ﴾

''اور قیامت یقیناً آنے والی ہے۔''[1]

❊ پرویزی تفسیر: اس کی تفسیر یوں کرتے ہیں: ''جس انقلاب کے لیے تم جدوجہد کر رہے ہو وہ تو آ کر رہے گا۔''

پرویز صاحب کے نزدیک السَّاعَةَ سے مراد انقلاب نظام ربوبیت ہے۔ تو اس کے خیال کے مطابق ہر نبی پر نظام ربوبیت نازل ہوتا رہا اور وہ آخر یہ انقلاب برپا کر کے رہتے۔

﴿السَّاعَةَ﴾ کے اس مفہوم کے لیے کوئی قرینہ نہیں اور نہ ہی یہ مفہوم کسی لغت میں ہے۔

اور انبیاء علیہم السلام کو وحی کے ذریعے سے دعوت الوہیت مع توحید ربوبیت دی گئی جیسا کہ فرمایا:

﴿ وَمَآ أَرْسَلْنَا مِن قَبْلِكَ مِن رَّسُولٍ إِلَّا نُوحِىٓ إِلَيْهِ أَنَّهُۥ لَآ إِلَـٰهَ إِلَّآ أَنَا۠ فَٱعْبُدُونِ ۝ ﴾

''اور ہم نے آپ سے قبل کوئی رسول نہیں بھیجا مگر یہ کہ ہم نے اس کی طرف وحی بھیجی کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں، لہٰذا میری ہی عبادت کرو۔''[2]

ربوبیت (نظام چلانے) کا عقیدہ اکثر مشرکین بھی رکھتے تھے کہ اللہ تعالیٰ خالق اور مدبر ہے جیسا کہ بہت سی آیات قرآنی اس پر دلالت کرتی ہیں۔

① الحجر 85:15. ② الأنبيآء 25:21.

پرویز صاحب کے نزدیک قیامت کا مفہوم عام ہے جو ہر آن مسلمان پر طاری رہتی ہے، چنانچہ کہتے ہیں: مسلمان، قیامت بھی صرف (مانتا ہے) جو مرنے کے بعد آئے گی وہ اس قیامت سے کوئی تعلق نہیں رکھتا جو اس کی ایک ایک سانس میں پوشیدہ ہے۔ اور اس جنت اور دوزخ سے کوئی واسطہ نہیں رکھتا جو قدم قدم پر اس کے سامنے ہے۔ نہ وہ اس میزان کو دیکھتا ہے جس میں قوموں کے اعمالِ حیات ہر آن تلتے رہتے ہیں۔[1]

انھوں نے اس عبارت میں قیامت، جنت وجہنم اور میزان کے دنیا میں وجود کا نظریہ پیش کیا ہے مگر قرآن کریم کی اصطلاحات کو مدنظر نہیں رکھا۔ سلیم کے نام اکیسویں خط میں لکھتے ہیں: قرآن ماضی کی طرف نگاہ رکھنے کے بجائے ہمیشہ مستقبل کو سامنے رکھنے کی تاکید کرتا ہے، اسی کا نام ایمان بالآخرت ہے اور ﴿ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ﴾[2] کا یہی مطلب ہے۔[3]

میزانِ اعمال کے متعلق لکھا ہے: قرآن کہتا ہے کہ اب وہ دورِ سرمایہ داری گزر گیا۔ اب وہ زمانہ ربوبیت کا آرہا ہے جس میں انصاف کی رو سے میزان کھڑی کی جائے گی۔ اس میزان کا نتیجہ یہ ہوگا کہ کسی مزدور کی محنت میں کوئی کمی نہیں کرسکے گا اور محنت کرنے والے کی محنت کا ذرہ ذرہ نتیجہ خیز ہوگا، اس کا حساب زمیندار یا سرمایہ دار نہیں کیا کرے گا کہ محنت کش کا حصہ کیا ہے اور اس کا حصہ کتنا۔[4]

پرویزیت کے حامی بتلائیں کہ قرآن کریم میں یہ معنی ومفہوم کس آیت اور کون سی سورت میں ہے؟ ان کے نزدیک اعمال کا تول اور حساب کتاب نظام ربوبیت کے دن ہوگا اور اس دن حساب صرف مزدور اور سرمایہ دار کا لیا جائے گا باقی کسی کا کوئی حساب کتاب نہیں ہوگا۔

[1] قرآنی فیصلے، ص:332. [2] البقرة 2:4. [3] مکتوبات:2/124. [4] نظام ربوبیت، ص:256.

اسی طرح پرویز صاحب کے نزدیک یوم الحشر کی حقیقت یہ ہے کہ اس وقت تمام نوع انسان (ذاتی مفاد کے پیچھے بھاگنے کے بجائے) خدا کی ربوبیت عامہ کے قیام کے لیے اٹھ کھڑی ہوگی۔ ان کے ہاں ﴿ يَوْمَ يَقُومُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ ﴾ ''جس دن لوگ رب العالمین کے سامنے کھڑے ہوں گے۔''[1] کی یہی تفسیر ہے، حالانکہ اس آیت سے پہلے ﴿ اَنَّهُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ ۝ لِيَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝ ﴾ ''بلاشبہ وہ بہت بڑے دن کے لیے اٹھائے جائیں گے۔''[2] ہے جو اس بات کی صریح دلیل ہے کہ قیام بعث بعد الموت کے بعد ہوگا لیکن پرویز صاحب بہت سی آیات کو ہڑپ کر لیتے ہیں۔

اسی طرح پرویز صاحب کے نزدیک آخرت کی کامیابی کا معیار صرف دنیا کی خوش حالی ہے۔[3] جبکہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک آخرت کی کامیابی، ایمان اور عمل صالح پر موقوف ہے۔ بہت سی قرآنی آیات اس پر دلالت کرتی ہیں۔

غلام احمد پرویز کے نزدیک جنت اور جہنم کا مفہوم

سلیم کے نام گیارھویں خط، ص:159 میں لکھا ہے: ''جس طرح مسلمانوں نے اللہ تعالیٰ کو عرش پر بٹھا رکھا ہے، اسی طرح انھوں نے جنت کو بھی دوسری دنیا کے ساتھ مختص کر رکھا ہے، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ جنت اور دوزخ اسی دنیا سے شروع ہو جاتے ہیں۔''

دوسری جگہ لکھتے ہیں: ﴿ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ﴾ میں یہ نہیں کہا گیا کہ قیامت میں جا کر دیکھ لینا کہ کون جنت میں جاتا ہے اور کون جہنم میں۔ کہا یہ گیا ہے کہ ذرا توقف کرو ہمارا پروگرام پورا ہو لینے دو تم ابھی دیکھ لو گے کہ جنت کس کے حصے میں آتی ہے۔[4]

[1] المطففین 6:83. [2] المطففین 5,4:83. [3] نظام ربوبیت، ص:193. [4] نظام ربوبیت، ص:218.

یہ نظریہ سراسر قرآنی آیات کے خلاف ہے۔

اسی طرح ایک جگہ لکھتے ہیں: ''بہرحال مرنے کے بعد جنت اور جہنم مقامات نہیں ہیں بلکہ انسانی ذات کی کیفیات ہیں۔''[1]

نوٹ: ہم نے باب اول میں قرآن کریم کے متعلق آٹھ عقیدے بیان کیے ہیں اور یہ واضح کیا ہے کہ قرآن کریم کی تعلیمات کیا ہیں اور منکرین حدیث سرسید اور پرویز صاحبان کا عقیدہ کیا ہے۔ یہ فرق ظاہر کر کے واضح کیا ہے کہ منکرین حدیث خصوصًا پرویز صاحب قرآن کریم پر بھی وہ ایمان نہیں رکھتے جو قرآن کریم کا مطلوب ہے۔ اس قسم کی قطعی آیات میں تاویل کی کوئی گنجائش نہیں ہے، لہٰذا وہ جاہل لوگ جو پرویز صاحب کی کتابوں کی تلبیسات سے متاثر ہو رہے ہیں ان کے لیے ضروری ہے کہ وہ قرآن کریم کا مطالعہ پرویز صاحب کی عینک سے نہ کریں بلکہ وہ عربی لغت، محاورۂ عرب، نبی ﷺ کی تعلیمات اور صحابۂ کرام کے فہم کی روشنی میں کریں۔ یہی صراط مستقیم ہے جو انسان کے لیے دنیوی اور اخروی زندگی میں کامیابی حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔ فرمایا:

﴿ وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۚ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ ﴾

''اور بے شک یہ ہے میری راہ جو سیدھی ہے، لہٰذا اسی پر چلو اور دوسری راہوں پر نہ چلو کہ یہ راہیں تم کو اس راہ سے جدا کر دیں گی۔''[2]

[1] لغات القرآن: 449/1. [2] الأنعام 153:6.

باب 2

محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان

یہ مسئلہ اگرچہ ایمان بالقرآن میں داخل ہے اور ایمانیات قرآنیہ کا خاص رکن ہے لیکن دو وجوہ کی بنا پر ہم اسے مستقل باب میں بیان کرنا چاہتے ہیں۔

1 ہمارے موضوع اثبات حجیت حدیث (جو اس کتاب کا اصل مقصد ہے) کی اساس ایمان بالرسول ہے۔

2 ایمانیات کا اصل منبع ایمان بالرسول ہے کیونکہ جو شخص محمد ﷺ کو رسول نہیں مانتا وہ اللہ تعالیٰ کی توحید اور قرآن کریم میں مذکورہ اعتقادات کیسے اور کہاں سے حاصل کرسکتا ہے۔

ایمان بالرسول کا مطلب یہ ہے کہ اس کی تمام صفات (جو اثباتًا یا نفیًا مذکور ہیں) کو ماننا فرض ہے۔ ان میں سے کسی ایک صفت کا انکار یا غلط تاویل کرنا کفر ہے۔ پرویز صاحب کے نزدیک رسالت محمدیہ پر ایمان سے مقصود اس کتاب پر ایمان لانا ہے جو محمد ﷺ کی وساطت سے امت کو ملی۔[1]

پرویز صاحب کی نظر میں رسول اللہ ﷺ زیادہ سے زیادہ ایک مبلّغ کی حیثیت سے تشریف لائے، قرآن پاک امت کے حوالے کیا اور دنیا سے تشریف لے گئے تو پھر آپ کی عملی زندگی جو اسوۂ حسنہ ہے، وہ کہاں گئی؟ اب ہم قرآن کریم سے محمد ﷺ کی حیثیت،

[1] فردوس گم گشتہ، ص: 383.

شان اور صفات بیان کرتے ہیں تا کہ پرویز کے مقلدین کو معلوم ہو جائے کہ ایمان بالرسول کے متعلق ان کا دعویٰ زبانی جمع خرچ کے سوا کچھ نہیں۔

پہلی صفت رسالت اور نبوت

تمام انبیاء علیہم السلام اور رسولوں پر ایمان لانا فرض ہے۔ ان پر ایمان کے متعلق قرآن کریم میں امر کا صیغہ استعمال ہوا ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ ۚ وَاِنْ تُؤْمِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَلَكُمْ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ۝ ﴾

”پس اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لاؤ اور اگر ایمان لاؤ اور تقویٰ اختیار کرو گے تو تمھیں بڑا اجر ملے گا۔“[1]

نیز فرمایا:

﴿ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ ﴾

”تم اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولوں پر ایمان لاؤ۔“[2]

ان آیات مبارکہ میں تمام رسولوں پر ایمان لانے کا حکم ہے لیکن اس وقت مقصد صرف آخری رسول پر ایمان لانے کی فرضیت بیان کرنا ہے۔ قرآن کریم میں آپ ﷺ پر ایمان لانے کے لیے سات مرتبہ امر کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے۔ فرمایا:

﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ ﴾

”اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ۔“[3]

نیز فرمایا:

﴿ قَدْ جَآءَكُمُ الرَّسُوْلُ بِالْحَقِّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَاٰمِنُوْا خَيْرًا لَّكُمْ ﴾

① اٰل عمرٰن 179:3. ② النسآء 171:4. ③ النسآء 136:4.

”رسول تمھارے پاس تمھارے رب کی طرف سے حق لے کر آ چکے، پس تم ایمان لے آؤ، یہ تمھارے لیے بہتر ہوگا۔“[1]

نیز فرمایا:

﴿ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهِ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ ﴾

”پس اللہ اور اس کے رسول، نبی امی پر ایمان لاؤ۔“[2]

نیز فرمایا:

﴿ يٰقَوْمَنَآ اَجِيْبُوْا دَاعِيَ اللّٰهِ وَ اٰمِنُوْا بِهٖ ﴾

”اے ہماری قوم! اللہ کی طرف دعوت دینے والے (نبی) کی دعوت قبول کرو اور اس پر ایمان لاؤ۔“[3]

نیز فرمایا:

﴿ اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ اَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ ﴾

”تم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور اس مال میں سے جس کا اس نے تمھیں جانشین بنایا ہے، خرچ کرو۔“[4]

نیز فرمایا:

﴿ اتَّقُوا اللّٰهَ وَ اٰمِنُوْا بِرَسُوْلِهٖ يُؤْتِكُمْ كِفْلَيْنِ مِنْ رَّحْمَتِهٖ ﴾

”اللہ سے ڈرو اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ۔ وہ اپنی رحمت سے تمھیں دگنا اجر دے گا۔“[5]

نیز فرمایا:

① النسآء 170:4. ② الأعراف 158:7. ③ الأحقاف 31:46. ④ الحدید 7:57. ⑤ الحدید 28:57.

﴿فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ النُّوْرِ الَّذِیْۤ اَنْزَلْنَا﴾

''پس اللہ، اس کے رسول اور اس نور پر جو ہم نے نازل کیا ہے۔ ایمان لاؤ۔''[1]

ان سات آیات میں سے پہلی آیت میں منافقین کو خالص ایمان لانے کی دعوت دی گئی ہے، دوسری، تیسری اور چھٹی آیت میں اہل کتاب (یہود و نصاری) کو دعوت ہے۔ چوتھی آیت میں جنات کی زبان سے اپنے ہم جنسوں کو ایمان لانے کی دعوت ہے جبکہ پانچویں اور ساتویں آیت میں ایمان بالرسول کی طرف عام دعوت ہے۔ اوران ساتوں آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی صفت رسالت اور صفت نبوت کا ذکر فرمایا ہے۔

رسول اور نبی کا معنی

رسول اور نبی میں لغت کے لحاظ سے یہ فرق ہے کہ رسالت کا معنی پیغام پہنچانا اور نبوت ''نَبَأ'' سے ماخوذ ہے خبر دینا یا نبوت ''نبوۃ'' سے ماخوذ ہے۔ اس کا معنی ہے: رفعتِ شان۔ رسول اور نبی میں بعض نے اس لحاظ سے فرق بیان کیا ہے کہ جس کو مستقل کتاب اور شریعت دی گئی ہو وہ رسول ہے جبکہ نبی عام ہے، خواہ اس کو مستقل کتاب یا شریعت ملی ہو یا نہ ملی ہو لیکن اس کی طرف وحی الٰہی آتی ہو، لہٰذا ہر رسول نبی ہے، جبکہ ہر نبی رسول نہیں۔

راجح قول: لیکن صحیح یہ ہے کہ شرعی طور پر ہر رسول نبی ہوتا ہے اور ہر نبی رسول ہوتا ہے، صرف اعتباری فرق ہے کہ اللہ کی طرف نسبت ہو تو رسول، یعنی اللہ تعالیٰ کا پیغام لانے والا اور بندوں کی طرف نسبت ہو تو نبی، یعنی بندوں کو خبر دینے والا۔ اس لیے سورۂ مریم میں موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام کے لیے رسول اور نبی دونوں صفات بیان کی گئی ہیں اور ہمارے نبی، خاتم النبیین ﷺ کی صفت میں بھی رسول اور نبی دونوں صفات جمع کی گئی ہیں۔

[1] التغابن 8:64.

رسول کے شرعی معنی میں خصوصیت یہ ہے کہ رسالت کی دو قسمیں ہیں:

① قولی رسالت: یعنی اقوال، کلمات اور الفاظ کا پیغام دینا اور پہنچانا۔

② فعلی اور عملی رسالت: یعنی افعال اور کیفیات اعمال کا عملی پیغام دینا۔

ایمان بالرسالت میں یہ دونوں (قولی اور فعلی و عملی رسالت کے) معانی شامل ہیں۔

قولی رسالت

قولی رسالت کے لیے قرآنی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں 329 مرتبہ لفظ ''قُلْ'' سے آپ کو مخاطب فرمایا ہے، جس کا معنی ہے: فرما دیجیے، یعنی یہ پیغام قولی طریقے سے پہنچا دیں۔ اس پیغام میں رسول کی امانت داری اصل صفت ہے، لہٰذا وہ اس بات کی نسبت اپنی طرف نہیں کر سکتے، یعنی ایسے نہیں کہہ سکتے کہ میں یہ بات اپنی طرف سے کرتا ہوں، لہٰذا رسول کا سارا کلام وحی پر مبنی ہوتا ہے اور رسول اور وکیل میں یہی فرق ہے۔ رسول صرف مرسل (بھیجنے والے) کا پیغام پہنچاتا ہے، اس پیغام کو اپنی طرف منسوب نہیں کرتا جبکہ وکیل بات کو اپنی طرف منسوب کرتا ہے، لہٰذا عقود (معاہدوں) وغیرہ میں جو وکیل ہوتا ہے حقوق کی ذمہ داری اسی پر عائد ہوتی ہے، جبکہ رسول پر حقوق کی ذمہ داری نہیں عائد ہوتی، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ سے فرمایا:

﴿ وَمَآ اَنۡتَ عَلَيۡهِمۡ بِوَكِيۡلٍ ۝ ﴾

''اور آپ ان کے ذمے دار نہیں۔''[1]

نیز فرمایا:

﴿ وَلَا تُسۡـَٔلُ عَنۡ اَصۡحٰبِ الۡجَحِيۡمِ ۝ ﴾

① الأنعام 6:107.

”آپ سے جہنمیوں کے بارے میں کوئی باز پرس نہیں ہوگی۔“[1]

اس سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کی قولی احادیث اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی پر مبنی ہیں جس کا نام وحیِ خفی یا وحیِ غیر متلو ہے۔ اگر احادیثِ رسول کو وحی سے مستثنیٰ کیا جائے جیسا کہ پرویزی نظریہ ہے تو اس سے رسول کو خیانت کی طرف منسوب کرنا لازم آئے گا، (العیاذ باللہ) یا یہ لازم آئے گا کہ جس وقت نبی ﷺ احادیث بیان کر رہے تھے اس وقت ان سے صفت رسالت منقطع ہوگئی تھی، العیاذ باللہ۔

فعلی اور عملی رسالت

اس کا مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رسولوں کو اور خصوصًا آخری رسول ﷺ کو بہت سے اعمال کے متعلق بھی وحی کی کہ فلاں فلاں عمل کرتے رہو، لہٰذا انھوں نے اس کی لازمی پابندی کی۔ ان اعمال کا تذکرہ اور ان کے کرنے کا طریقہ قرآن کریم میں بالتفصیل موجود نہیں، اس کی تفصیل احادیث سے ملتی ہے۔ اگر اسے وحی نہ کہا جائے تو پھر جب رسول اللہ ﷺ ان پر عمل کر رہے تھے تو کیا اس وقت آپ ﷺ سے صفت رسالت ختم ہوگئی تھی؟ اس کے متعلق چند آیات ملاحظہ فرمائیں، فرمان الٰہی ہے:

﴿ وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ ﴾

”ہم نے ہر قوم میں ایک رسول بھیجا کہ (وہ دعوت دیں کہ اے لوگو!) اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت سے اجتناب کرو۔“[2]

نیز فرمایا:

﴿ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ ○ ﴾

[1] البقرة 2:119. [2] النحل 16:36.

''اور ہم نے آپ سے قبل کوئی رسول نہیں بھیجا مگر یہ کہ ہم اس کی طرف وحی بھیجتے تھے کہ میرے سوا کوئی معبود برحق نہیں، لہٰذا تم میری ہی عبادت کرو۔''[1]

نیز فرمایا:

﴿ يَاَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا ﴾

''اے رسولو! پاکیزہ چیزیں کھاؤ اور نیک عمل کرو۔''[2]

نیز فرمایا:

﴿ اِنَّمَآ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ رَبَّ هٰذِهِ الْبَلْدَةِ ﴾

''مجھے تو صرف یہی حکم ہوا ہے کہ میں اس شہر کے رب کی عبادت کروں۔''[3]

نیز فرمایا:

﴿ وَاَنْ اَتْلُوَا الْقُرْاٰنَ ﴾

''اور یہ کہ میں قرآن کی تلاوت کروں۔''[4]

نیز فرمایا:

﴿ يَاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ﴾

''اے رسول! آپ کے رب کی طرف سے آپ کی طرف جو کچھ نازل کیا گیا ہے، اسے پہنچا دیجیے۔''[5]

نیز فرمایا:

﴿ يَاَيُّهَا النَّبِيُّ اتَّقِ اللّٰهَ وَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ ﴾

''اے نبی! اللہ سے ڈرتے رہیے، نیز کافروں اور منافقوں کی بات نہ مانیں۔''[6]

---

① الأنبیآء 25:21. ② المؤمنون 51:23. ③ النمل 91:27. ④ النمل 92:27. ⑤ المآئدة 67:5. ⑥ الأحزاب 1:33.

نیز فرمایا:

﴿ وَّاتَّبِعْ مَا يُوْحٰٓى اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ﴾

''اور آپ کے رب کی طرف سے آپ کی طرف جو وحی کیا جاتا ہے اس کی اتباع کریں۔''[1]

نیز فرمایا:

﴿ اُتْلُ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنَ الْكِتٰبِ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ ﴾

''جو کتاب آپ کی طرف وحی کی گئی ہے اسے پڑھا کریں اور نماز کی پابندی کریں۔''[2]

نیز فرمایا:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ○ قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا ○ نِّصْفَهٗٓ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا ○ اَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَ رَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا ○...... وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَ تَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلًا ○ ﴾

''اے چادر میں لپٹنے والے! رات کو بجز تھوڑے سے وقت کے نماز میں کھڑے رہیں۔ آدھی رات تک یا اس سے کم یا کچھ زیادہ اور قرآن کو خوب ٹھہر ٹھہر کر پڑھا کریں۔ ...... اور اپنے رب کے نام کا ذکر کریں اور سب سے تعلق توڑ کر اسی کے ہو جائیں۔''[3]

نیز فرمایا:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ○ قُمْ فَاَنْذِرْ ○ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ○ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ ○ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ ○ وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ ○ وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ ○ ﴾

''اے لحاف میں لپٹنے والے! اٹھو اور (لوگوں کو اللہ کے عذاب سے) ڈراؤ اور اپنے رب کی عظمت بیان کرو، اور اپنے کپڑوں کو پاک رکھو، اور نجاست سے دور

[1] الأحزاب 2:33. [2] العنكبوت 45:29. [3] المزمل 73:1-4 و 8.

رہو اور اس نیت سے نہ دو کہ زیادہ کے طالب رہو اور اپنے رب کے لیے صبر کرو۔"[1]

ان کے علاوہ اور بھی بہت سی آیات ہیں جن میں اعمال کا ذکر ہے۔ ان ہی آیات کریمہ میں رسولوں کو اللہ تعالیٰ کی بندگی کرنے کا حکم بھی ہے اور اس (بندگی ہی) میں قلبی، لسانی، بدنی اور مالی، ہر قسم کی عبادت شامل ہے۔ ان آیات میں پاکیزہ چیزیں کھانے، تلاوت کرنے، تبلیغ اور دعوت کا کام کرنے، توکل و تقویٰ اختیار کرنے، اقامت صلاۃ، قیام اللیل، ٹھہر ٹھہر کر قرآن پڑھنے، اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے، سب سے تعلق توڑ کر اسی کا ہو رہنے، اللہ تعالیٰ کی کبریائی بیان کرنے، کپڑے پاک رکھنے، ہر قسم کی نجاست سے اجتناب کرنے اور صبر کرنے کا حکم ہے۔ یہ سارے اعمال ہیں (ان کے علاوہ اور بھی اعمال ہیں جن کا تذکرہ ہم صفات رسول میں بیان کریں گے۔) اگر رسول اللہ ﷺ یہ اعمال بجالائے ہیں اور یقیناً بجالائے ہیں تو ان کی کیفیت، ہیئت، اوقات اور مقدار وغیرہ ضرور آپ سے منقول ہیں لیکن وہ قرآن کریم میں مذکور نہیں بلکہ ان کا ذکر احادیث میں ہے۔ ان احادیثِ اعمال کو ماننا ان کی رسالت کو ماننا ہے اور ان سے انکار ان کی رسالت سے انکار ہے۔ پرویزی مکتب فکر کی اندھا دھند تقلید کرنے والے تو رسول کو صرف ایک ڈاکیے کی حیثیت سے دیکھتے ہیں کہ ڈاک پہنچائی اور پھر اپنے کام میں لگ گئے۔ ڈاک پہنچانے کے سوا دوسرے اوقات میں اسے ڈاکیا نہیں کہا جا سکتا۔ معلوم ہوا ان کی عقل و دانش پر جہل اور تعصب کے پردے پڑے ہوئے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو اہل قرآن کہتے ہیں جبکہ وہ سرے سے قرآن کو سمجھتے ہی نہیں۔

[1] المدثر 74:1-7.

نبی ﷺ کی صفت تبلیغ، تعلیم اور تزکیہ

اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا نقل کرتے ہوئے فرمایا:

﴿ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ ﴾

"اے ہمارے رب! انھی میں سے ان میں ایک رسول مبعوث فرما جو ان کو تیری آیات سنائے، انھیں کتاب وحکمت کی تعلیم دے اور ان کا تزکیہ کرے۔"[1]

یہ آیت ابراہیم علیہ السلام کی دعا ہے اور اس دعا کی قبولیت کا تین آیتوں میں ذکر کیا گیا ہے۔ البقرہ 151:2، آل عمران 164:3، الجمعۃ 2:62.

ان چار آیات میں نبی ﷺ کی تین صفات کا ذکر کیا گیا ہے:

1. مبلغ اعظم: آپ کا تبلیغی نصاب قرآن کریم کی آیات ہیں۔ اس کی تائید متعدد آیات کرتی ہیں۔ فرمایا:

﴿ وَاتْلُ مَا أُوحِيَ إِلَيْكَ مِن كِتَابِ رَبِّكَ ﴾

"اور اپنے رب کی کتاب سے جو آپ کی طرف وحی کی گئی ہے پڑھتے رہا کریں۔"[2]

دوسری جگہ فرمایا:

﴿ لِّتَتْلُوَ عَلَيْهِمُ الَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ ﴾

"تاکہ آپ انھیں پڑھ کر سنائیں جو ہم نے آپ کی طرف وحی کیا ہے۔"[3]

قاعدہ: جب حرف جر "علیٰ" فعل "تلاوت" کا متعلق ہو تو پھر اس کا مطلب ہوتا ہے: دوسروں کو سنانا اور اس کا مقصد دعوت الی القرآن ہوتا ہے۔

---

[1] البقرۃ 129:2. [2] الکہف 27:18. [3] الرعد 30:13.

② معلّم اعظم: اس کے لیے آپ کا تعلیمی نصاب قرآن کریم اور احادیث ہیں۔

❁ لفظ حکمت کی تحقیق: یہ لفظ قانون عربی میں مصدر ہے حکم یا احکام سے ماخوذ ہے۔ یہ لفظ قول اور علم و عمل میں استحکام کے لیے بولا جاتا ہے۔ قرآن کریم میں یہ لفظ بیس مرتبہ استعمال کیا گیا ہے۔ اکثر جگہ پر لفظ "کتاب" کے بعد لفظ "حکمت" آیا ہے۔ سورۂ احزاب 34:33 میں ﴿ اٰيٰتِ اللّٰهِ ﴾ کے بعد لفظ ﴿ وَالْحِكْمَةِ ﴾ آیا ہے اور ﴿ مَا يُتْلٰى ﴾ کے تحت ذکر ہے۔ سورۂ بقرہ میں فرمایا:

﴿ وَمَآ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ وَالْحِكْمَةِ ﴾

"اور جو اس نے تم پر کتاب اور حکمت نازل کی۔"[1]

اسی طرح فرمایا:

﴿ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ﴾

"میں تمھیں کتاب اور حکمت عطا کروں۔"[2]

نیز فرمایا:

﴿ وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ﴾

"اور اللہ نے آپ پر کتاب اور حکمت نازل کی۔"[3]

ان آیات سے دو باتیں واضح ہوئیں:

1. حکمت بھی کتاب کی طرح اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل شدہ ہے۔
2. حکمت کتاب اللہ سے ماسوا ہے کیونکہ حکمت کا کتاب اللہ پر عطف آیا ہے اور عطف اصل میں معطوف اور معطوف علیہ کے درمیان مغایرت، یعنی فرق کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے اگرچہ مغایرت جزوی ہو۔

---

① البقرۃ 231:2. ② آل عمرٰن 81:3. ③ النسآء 113:3.

ابو حیان نے حکمت کا مفہوم بیان کرتے ہوئے 29 اقوال نقل کیے ہیں اور ان سب اقوال کا مرجع ایک ہی ہے اور وہ ہے اسرارِ قرآن کا فہم، جس کی لفظ سنت کے ساتھ تعبیر کی جاتی ہے کیونکہ قرآن کریم میں عام طور پر ظاہری احکام اور اصولی امور کا ذکر ہوتا ہے اور احادیث میں جزئیات، فروع، کیفیات اور اسرار و دقائق کا ذکر ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے امام شافعی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ''الرسالہ'' میں نقل فرمایا ہے کہ اس بات پر اتفاق ہے کہ حکمت سے مراد نبی ﷺ کی سنت ہے۔

غلام احمد پرویز نے حکمت سے عین قرآن مراد لیا ہے اور کبھی عقل، حالانکہ حکمت سے یہ دونوں معانی مراد لینا غلط ہے کیونکہ عقل اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل شدہ ہے نہ وہ انبیاء علیہم السلام کے ساتھ مخصوص ہے، جب ثابت ہُوا کہ ''حکمت'' سے مراد سنت ہے تو اس سے واضح ہوا کہ احادیث بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل شدہ ہیں۔ اس کا تفصیلی ذکر بعد میں کیا جائے گا۔

3 مرشد اعظم: نبی ﷺ کی تیسری صفت مرشد ہے، یعنی آپ تزکیہ کرنے والے ہیں۔ آیات کی تلاوت اور کتاب وسنت کی تعلیم کے بعد تزکیہ کا مقام ہے اور تزکیہ کتاب وسنت پر عمل کرنے، اس کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق استوار کرنے اور دل کو غیر اللہ کے افکار سے خالی کرنے سے ہوتا ہے، یہ ساری راہ نمائی احادیث سے ملتی ہے۔ نبی کریم ﷺ نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو عبادات، معاملات، اخلاقیات، ذکر و اذکار اور حکمرانی کے طریقے عملی طور پر سکھائے۔ اگر نبی ﷺ کی صرف یہی ذمہ داری تھی کہ آپ نے اللہ تعالیٰ کی کتاب امت کے حوالے کرنی تھی، جیسا کہ ''جناب'' غلام احمد پرویز کا زعم باطل ہے تو پھر تعلیم وتربیت اور تزکیے کا فریضہ ادا کرنا کس کی ذمہ داری تھی؟

نبی ﷺ مُبیّن، یعنی بیان کرنے والے ہیں

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ○ ﴾

''اور ہم نے تیری طرف یہ ذکر اتارا، تاکہ آپ لوگوں کے لیے خوب واضح کریں جو کچھ ان کی طرف نازل کیا گیا اور تاکہ وہ غور وفکر کریں۔''[1]

اور فرمایا:

﴿ وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِى اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ﴾

''اور ہم نے آپ پر کتاب صرف اس لیے نازل کی ہے تاکہ آپ ان لوگوں کے لیے وہ چیزیں واضح کردیں جن میں انھوں نے اختلاف کیا۔''[2]

تبیان: کسی چیز کی زیادہ وضاحت اور تشریح کے لیے لفظ ''تبیان'' جبکہ وضاحت کے لیے لفظ ''بیان'' استعمال ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَتُبَيِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ وَلَا تَكْتُمُوْنَهٗ ﴾

''جب اللہ نے ان لوگوں سے، جو اہل کتاب ہیں، یہ عہد لیا تھا کہ تم اسے لوگوں کے سامنے ضرور بیان کرو گے اور اسے ہرگز نہیں چھپاؤ گے۔''[3]

اس سے واضح ہوا کہ نبی ﷺ کا کام صرف کتاب کی تلاوت کرنا ہی نہیں تھا بلکہ اس کی تلاوت وتبلیغ کے ساتھ ساتھ اس کی وضاحت کرنا بھی آپ کی ذمہ داری تھی۔ اور اس کتاب کی وضاحت وتشریح احادیث کی صورت میں ہمارے پاس موجود ہے۔ اس کی تفصیل اور مثالیں ان شاء اللہ اس کتاب کے چوتھے باب میں آئیں گی۔

---

① النحل 44:16. ② النحل 64:16. ③ آل عمرٰن 187:3.

اس بحث سے یہ واضح ہوا کہ صحیح وحسن احادیث قرآن کی شرح ہیں، موضوع وضعیف نہیں۔ اس سلسلے میں خبر واحد کی بھی اتنی ہی اہمیت ہے جتنی خبر مشہور کی ہے۔ مفردات قرآن یا اس کے جملوں کی تفسیر، توجیہ، تخصیص یا تقیید احادیث کے ذریعے سے کرنے پر امت کا اتفاق ہے۔ ائمۂ اربعہ اور دوسرے ائمۂ محدثین نے تصریح کی ہے کہ صحیح خبر واحد سے کتاب اللہ کی تخصیص، تقیید اور تفسیر کرنا صحیح اور برحق ہے۔ ائمہ کا اس میں کوئی اختلاف نہیں۔ اگر کسی نے اختلاف ذکر کیا ہے تو وہ صحیح نہیں۔ اس کی عقلی دلیل بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے مابین کوئی اختلاف نہیں ہوسکتا۔ اللہ تعالیٰ اپنے نبی کی اور نبی اپنے اللہ تعالیٰ کی تکذیب نہیں کرسکتا۔ اقامتِ صلاۃ، نصابِ زکاۃ، روزے کے احکام، مناسکِ حج وعمرہ، آدابِ جہاد، نکاح وطلاق اور تجارت وغیرہ کے تمام احکام ومسائل کی تشریح اور وضاحت صحیح احادیث میں موجود ہے۔ اس کی نقلی دلیل یہ ہے کہ قرآن وحیِ الٰہی ہے تو احادیث بھی وحیِ الٰہی ہیں۔ اس کتاب کے چھٹے باب میں ان شاء اللہ مزید وضاحت کی جائے گی۔

نبی ﷺ حاکم وقاضی ہیں

قرآن کریم میں واضح طور پر موجود ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کے نزول کے ساتھ اپنے نبی ﷺ کو فیصل اور حَکَم (فیصلہ کرنے والے) کی شان بھی عطا فرمائی ہے۔ جبکہ مبلّغ کو یہ اختیار نہیں ہوتا، لہٰذا رسول اللہ ﷺ کے وصف رسالت میں آپ کا حاکم وفیصل ہونا بھی شامل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ إِنَّآ أَنزَلْنَآ إِلَيْكَ ٱلْكِتَـٰبَ بِٱلْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ ٱلنَّاسِ بِمَآ أَرَىٰكَ ٱللَّهُ ﴾

''ہم نے حق وصداقت کے ساتھ آپ کی طرف کتاب نازل فرمائی، تاکہ اللہ نے

آپ کو جو سیدھی راہ دکھائی ہے آپ اس کے مطابق لوگوں میں فیصلہ کریں۔"[1]

نیز فرمایا:

﴿ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ ﴾

"(اے نبی!) آپ ان لوگوں کے درمیان اس کے مطابق فیصلہ کریں جو اللہ نے (آپ پر) نازل کیا ہے۔"[2]

نیز فرمایا:

﴿ وَاَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ ﴾

"اور یہ کہ آپ اس کے مطابق ان میں فیصلہ کریں جو اللہ نے نازل کیا ہے۔"[3]

اور فرمایا:

﴿ فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ۝ ﴾

"پس قسم ہے تمھارے رب کی! یہ لوگ اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتے، جب تک اپنے تمام جھگڑوں میں آپ کو حاکم نہ بنالیں، پھر اپنے دلوں میں آپ کے فیصلے کے بارے میں کوئی تنگی محسوس نہ کریں اور (آپ کے فیصلے کو) پوری طرح تسلیم کرلیں۔"[4]

ان آیاتِ کریمہ میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ نبی ﷺ رسالت کے ساتھ فیصلے کرنے پر بھی مامور تھے۔ جسے حاکم اور قاضی کہا جاتا ہے، البتہ فیصلہ کرنے کے لیے ﴿ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ ﴾ "جو اللہ نے نازل کیا ہے" کی شرط عائد کی ہے جو قرآن و حدیث کو محیط ہے بلکہ پہلی آیت میں ﴿ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ ﴾ "(اور اس کے مطابق فیصلہ کریں) جسے اللہ نے آپ کو

[1] النسآء 4:105. [2] المآئدة 5:48. [3] المآئدة 5:49. [4] النسآء 4:65.

دکھایا ہے۔'' کا ذکر کیا تو کتاب اللہ کے علاوہ ﴿بِمَآ أَرٰىكَ اللّٰهُ﴾ سے مراد حدیث ہے، جبکہ آخری آیت میں تو رسول اللہ ﷺ کو حاکم تسلیم کرنا ایمان کے لیے شرط قرار دیا ہے۔ اس میں ان احادیث کی طرف اشارہ ہے جن میں نبی ﷺ کے مختلف عدالتی اور تعزیری فیصلے ذکر ہیں، مثلاً: چور کا ہاتھ کاٹنا، شادی شدہ زانی کو سنگسار کرنا، قاتل پر قصاص کے بدلے دِیَت کا حکم جاری کرنا، قصاص فی الأطراف (اعضائے جسمانی کے قصاص) کا حکم صادر کرنا، آزاد ہونے والے اور آزاد کرنے والے میں ولاء کے حق کا فیصلہ کرنا، تجارت کی بعض اقسام کو جائز اور بعض کو ناجائز قرار دینا، نکاح اور طلاق میں فیصلے کرنا، کاشت کاری میں پانی کی تقسیم وغیرہ کا فیصلہ کرنا، یہ سارے واقعات احادیث میں مذکور ہیں۔ نبی ﷺ کو حاکم تسلیم کر کے ان احادیث کو ماننا ایمان بالرسول میں داخل ہے۔

نبی ﷺ بحیثیت داعی و مبلّغ

قرآن کریم کی بہت سی آیات میں نبی ﷺ کی صفت دعوت و تبلیغ، اس کے آداب اور نصابِ دعوت کا مفصل ذکر موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ يَاأَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَآ أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ۖ وَإِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ ﴾

''اے رسول! آپ کے رب کی جانب سے آپ پر جو کچھ نازل ہوا ہے اسے لوگوں تک پہنچا دیجیے۔ اور اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو آپ نے اس (اللہ) کی رسالت کو نہ پہنچایا۔''[1]

نیز فرمایا:

﴿ فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَأَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِينَ ۝ ﴾

[1] المآئدة 5:67.

"پس جس بات کا آپ کو حکم دیا گیا ہے اسے صاف صاف کہہ دیجیے۔ اور مشرکین سے اعراض کیجیے۔"[1]

نیز فرمایا:

﴿ اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَ الْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ ﴾

"(اے نبی!) آپ اپنے رب کی راہ کی طرف حکمت اور اچھے وعظ کے ذریعے سے دعوت دیجیے اور احسن طریقے سے ان سے بحث کیجیے۔"[2]

نیز فرمایا:

﴿ قُلْ هٰذِهٖ سَبِیْلِیْٓ اَدْعُوْٓا اِلَی اللّٰهِ ۛ عَلٰی بَصِیْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِیْ ﴾

"کہہ دیجیے: یہی میرا راستہ ہے۔ میں (تمھیں) اللہ کی طرف بلاتا ہوں، میں اور وہ لوگ بھی جو میری اتباع کرتے ہیں۔ ہم سب بصیرت پر ہیں۔"[3]

نیز فرمایا:

﴿ یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِیْرًا ۙ وَّدَاعِیًا اِلَی اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا ﴾

"اے نبی! ہم نے آپ کو شاہد، خوشخبری سنانے والا، ڈرانے والا، اللہ کی طرف اس کے حکم سے دعوت دینے والا اور ایک روشن چراغ بنا کر بھیجا ہے۔"[4]

ان آیاتِ کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ کے ذمے دعوت و تبلیغ کا فریضہ عائد کیا ہے اور ﴿ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ ﴾ "جو کچھ اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا۔" ﴿ مَا تُؤْمَرُ ﴾ "جس کا آپ کو حکم دیا گیا۔" اور ﴿ سَبِیْلِ رَبِّكَ ﴾ "رب کا راستہ" نصابِ دعوت مقرر فرمایا اور

[1] الحجر 94:15. [2] النحل 125:16. [3] یوسف 108:12. [4] الأحزاب 46,45:33.

اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ کو بطور شاہد، بشیر ونذیر، داعی الی اللہ اور سراجًا مّنیرًا بنا کر مبعوث فرمایا۔ پس ﴿ مَآ اَنۡزَلَ اللّٰهُ ﴾ ''جو کچھ اللہ نے نازل فرمایا۔'' اس میں سنت بطور جزو لازم شامل ہے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ فریضۂ دعوت وتبلیغ کے پیش نظر جو احکامات اور مواعظ وغیرہ بیان فرماتے تھے وہ صرف قرآن مجید ہی پر مشتمل نہیں ہوتے تھے بلکہ آپ ﷺ احادیث بھی بیان کیا کرتے تھے، پس وہ بھی ﴿ مَآ اَنۡزَلَ اللّٰهُ ﴾ میں شامل ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے علاوہ بھی نبی ﷺ کے لیے صفات بیان کی ہیں، مثلاً: سورۂ اعراف 157:7، سورۂ مائدہ 16,15:5 اور سورۂ توبہ 128:9 میں بھی آپ کی صفات بیان کی گئی ہیں۔ اگر ان ساری صفات کو دیکھ لیا جائے تو رسول اور نبی ہونے کے لحاظ سے اس کا مصداق قرآن اور حدیث دونوں میں مذکور ہے۔

یہاں تک تو ایمان بالرسول میں دوسری صفات کاملہ کا تذکرہ تھا کہ وہ بھی ایمان بالرسول میں داخل ہیں۔ ان میں سے ایک کا بھی انکار کرنا یا غلط تاویل کرنا موجب کفر ہوگا۔

ایمان بالرسول سے مشروط ومتعلق تقاضے

اب ہم ایمان بالرسالت کے دوسرے تقاضوں کا ذکر کرتے ہیں جن کو مانے بغیر ایمان بالرسول درست نہیں ہوسکتا۔

ایمان بالرسول کا پہلا تقاضا

ایمان بالرسول میں رسول اللہ ﷺ کی مطلق اطاعت بطور رکن فرض ہے اور اس کی فرضیت کے لیے قرآن کریم میں چار طریقے وارد ہوئے ہیں۔

1 امر (حکم) کا صیغہ: اطاعت رسول کے متعلق چودہ مرتبہ امر کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے۔

2 ترغیب: یعنی چودہ طریقوں سے آپ کی اطاعت کی طرف ترغیب دی گئی ہے۔ ان

میں سے بعض کی تفصیل درج ذیل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ﴾

''جس نے رسول ﷺ کی اطاعت کی تو اس نے اللہ کی اطاعت کی۔''[1]

ایسے نہیں فرمایا کہ جس نے اللہ کی اطاعت کی تو اس نے رسول کی اطاعت کی کیونکہ اطاعتِ رسول احادیث (وحیِ خفی) اور قرآن (وحیِ جلی) دونوں کو محیط ہے، لہٰذا ان دونوں قسم کی وحی میں رسول اللہ ﷺ کی اطاعت، اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے جبکہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا بظاہر مصداق صرف قرآن ہے جس کی وجہ سے صرف اللہ کی اطاعت، اطاعت رسول کو مستلزم نہیں ہوگی۔ دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَاِنْ تُطِيْعُوْهُ تَهْتَدُوْا ﴾

''اور اگر تم اس (نبی) کی اطاعت کرو گے تو ہدایت پا جاؤ گے۔''[2]

نیز فرمایا:

﴿ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ○ ﴾

''اور نماز قائم کرو، زکاۃ ادا کرو اور رسول کی اطاعت کرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔''[3]

یہاں صرف رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کا ذکر کیا گیا ہے، یعنی نماز قائم کرنے اور زکاۃ ادا کرنے کے متعلق رسول اللہ ﷺ نے احادیث میں جس طرح تعلیم دی ہے اس کی پابندی کرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے، نیز فرمایا:

﴿ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ﴾

''ہم نے صرف اسی واسطے رسول بھیجے کہ اللہ کے حکم سے ان کی اطاعت کی جائے۔''[4]

یعنی رسالت کا مقصد اطاعت رسول ہے اور اسی میں اللہ تعالیٰ کے حکم کی اطاعت

[1] النسآء 80:4. [2] النور 54:24. [3] النور 56:24. [4] النسآء 64:4.

ہے۔ اس کے علاوہ (سورۂ نساء 69:4، آل عمران 132:3، سورۂ توبہ 71:9، سورۂ نور 52:24، سورۂ احزاب 71:33، سورۂ فتح 16:48، اور سورۂ حجرات 14:49) کی ان آیات کا بغور مطالعہ کریں، ان میں اطاعت رسول کے بہت سے فائدے بیان کیے گئے ہیں۔

غلام احمد پرویز کہتے ہیں:

﴿ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ ﴾

"اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرو اور رسول اللہ کی اطاعت کرو۔"

اس آیت سے صرف ایک اطاعت مراد ہے، یعنی اطاعت قرآن۔

لیکن یہ استدلال غلط ہے کیونکہ اگر اطاعت رسول سے مراد مستقل اطاعت نہ تھی تو اللہ تعالیٰ کسی بھی آیت میں ﴿ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ ﴾ کا حکم نہ فرماتا، جیسا کہ "اُولُوا الْاَمْرِ" کی اطاعت مستقل نہیں ہے، لہٰذا وہاں مستقل حیثیت میں ﴿ وَاَطِيْعُوا ﴾ کا لفظ دوبارہ استعمال نہیں کیا گیا۔

مزید برآں ﴿ اَطِيْعُوا ﴾ میں واؤ عطف کے لیے ہے جو مغایرت پر دلالت کرتی ہے اگر چہ یہ مغایرت مِنْ وجہٍ ہو، لہٰذا اطاعت رسول مستقل ہے اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت بھی مستقل ہے۔ اگر چہ دونوں میں مشترک چیز یا حکم ایک ہے۔

علاوہ ازیں اگر اطاعت رسول مستقل مقصود نہ تھی تو ﴿ مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ﴾ میں اس فرمان کے برعکس کیوں نہیں فرمایا جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے، نیز بعض آیات میں صرف اطاعت رسول کا حکم ہے، جیسا کہ تیسری آیت میں ہے، پس یہ آیت مستقل اطاعت رسول پر دلالت کرتی ہے۔

3 اللہ تعالیٰ نے ایمان کو نبی ﷺ کی اطاعت اور آپ کا فیصلہ قبول کرنے پر موقوف کیا ہے، جیسا کہ فرمایا:

﴿ فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ﴾

''پس تمھارے رب کی قسم! یہ لوگ کبھی مومن نہیں ہو سکتے حتی کہ اپنے تمام جھگڑوں میں آپ کو حاکم و فیصل نہ بنا لیں۔''[1]

4 اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو، جو اطاعت اور اتباع رسول ترک کرتے ہیں، سخت انداز میں دنیوی و اخروی عذاب کا خوف دلایا ہے، خواہ اطاعت ترک کرنا بطور تکذیب ہو یا بطور نافرمانی یا بطور اعراض و مخالفت ہو۔ چند آیات ملاحظہ فرمائیں:

﴿ وَلَقَدْ جَآءَهُمْ رَسُولٌ مِّنْهُمْ فَكَذَّبُوهُ فَأَخَذَهُمُ الْعَذَابُ وَهُمْ ظٰلِمُونَ ○ ﴾

''اور یقیناً انھی میں سے ایک رسول ان کے پاس آیا تو انھوں نے اسے جھٹلایا، تو عذاب نے انھیں آ پکڑا اور وہ ظالم تھے۔''[2]

نیز فرمایا:

﴿ فَإِنْ عَصَوْكَ فَقُلْ إِنِّي بَرِيٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُونَ ○ ﴾

''پس اگر وہ لوگ آپ کی نافرمانی کریں تو آپ فرما دیں: بلاشبہ تم جو کچھ کر رہے ہو، میں اس سے بری ہوں۔''[3]

اور فرمایا:

﴿ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُولَهٗ فَإِنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِينَ فِيهَآ أَبَدًا ○ ﴾

''اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا تو بے شک اس کے لیے جہنم کی آگ ہے، جس میں وہ ہمیشہ رہے گا۔''[4]

اور فرمایا:

﴿ وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُولَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيلِ

[1] النسآء 4:65. [2] النحل 16:113. [3] الشعرآء 26:216. [4] الجن 72:23.

الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَ نُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ؕ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا ۝﴾

”اور جو شخص اس بات کے بعد کہ اللہ نے اس پر راہ ہدایت کھول دی ہو، رسول کی مخالفت کرے اور مومنوں کی راہ چھوڑ کر دوسری راہ چلنے لگے تو ہم اسے اسی طرف پھیر دیں گے جس طرف وہ پھر گیا ہے اور اسے جہنم میں پہنچائیں گے اور وہ بہت ہی بری جگہ ہے۔“[1]

نیز فرمایا:

﴿اَلَمْ يَعْلَمُوْٓا اَنَّهٗ مَنْ يُّحَادِدِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاَنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ خَالِدًا فِيْهَا ؕ ذٰلِكَ الْخِزْيُ الْعَظِيْمُ ۝﴾

”کیا انھوں نے نہیں جانا کہ بے شک حقیقت یہ ہے کہ جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کرے گا تو اس کے لیے جہنم کی آگ ہے، جس میں وہ ہمیشہ رہے گا اور یہ بہت بڑی رسوائی ہے۔“[2]

نیز ارشاد الٰہی ہے:

﴿فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَقُلْ اَنْذَرْتُكُمْ صٰعِقَةً مِّثْلَ صٰعِقَةِ عَادٍ وَّثَمُوْدَ ۝﴾

”پس اگر وہ منہ پھیر لیں تو ان سے فرما دیجیے: میں نے تمھیں ایک ایسی کڑک سے آگاہ کیا ہے جو عاد اور ثمود کی کڑک کی طرح ہوگی۔“[3]

اور فرمان باری تعالیٰ ہے:

﴿فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖٓ اَنْ تُصِيْبَهُمْ فِتْنَةٌ اَوْ يُصِيْبَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝﴾

”پس وہ لوگ جو اس کے حکم کی مخالفت کرتے ہیں، انھیں اس بات سے ڈرنا

[1] النسآء 4:115. [2] التوبة 9:63. [3] حٰمٓ السجدة 41:13.

چاہیے کہ ان پر کوئی مصیبت آ پڑے یا ان پر دردناک عذاب آ جائے۔"[1]

اور یہ امور عام ہیں، خواہ قرآن کے بارے میں ہوں یا احادیث کے بارے میں، سب دنیا و آخرت میں اسباب عذاب ہیں اور یہ امراض خصوصاً رسول اللہ ﷺ کی مخالفت، بے رغبتی اور دشمنی منکرین حدیث میں صراحت کے ساتھ موجود ہیں۔

ایمان بالرسول کا دوسرا تقاضا

آپ ﷺ کے تمام معجزات کو ماننا فرض ہے، خواہ وہ قرآن میں مذکور ہوں یا صحیح احادیث میں۔ نبی ﷺ کے معجزات میں سے معجزۂ قرآن تو پرویز صاحب بھی مانتے ہیں کہ اس کی فصاحت، بلاغت، طریقۂ دعوت و ہدایت اور طریقۂ استدلال کے مقابلے سے آج تک ساری دنیا عاجز ہے اور عاجز رہے گی، لہٰذا رسول اللہ پر ایمان لانے میں ایمان بالقرآن پہلا رکن ہے۔ اور یہ باب اول میں بالتفصیل بیان ہو چکا ہے۔ لیکن قرآن کریم کے علاوہ ہمارے نبی ﷺ کے دوسرے معجزات بھی گزشتہ انبیاء علیہم السلام سے زیادہ ہیں۔ ان میں سے بعض اشارتاً قرآن کریم میں موجود ہیں۔ فرمایا:

﴿ قَدْ كَانَ لَكُمْ اٰيَةٌ فِيْ فِئَتَيْنِ الْتَقَتَا ﴾

"تمھارے لیے دو جماعتوں میں، جب وہ باہم لڑیں، ایک نشانی (معجزہ) ہے۔"[2]

یعنی غزوۂ بدر میں ایمان والوں کا غلبہ اور فتح ایک معجزہ ہے کہ تعداد بہت تھوڑی اور جنگ کے اسباب و وسائل بھی نسبتاً کم تھے، اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے غلبہ عطا فرمایا۔

دوسری جگہ فرمان الٰہی ہے:

[1] النور 63:24. [2] آل عمرٰن 13:3.

﴿ وَمَا تَأْتِيهِمْ مِّنْ آيَةٍ مِّنْ آيَاتِ رَبِّهِمْ إِلَّا كَانُوا عَنْهَا مُعْرِضِينَ ۝ ﴾

''اوران کے پاس ان کے رب کی نشانیوں میں سے کوئی نشانی ایسی نہیں آئی جس سے انھوں نے منہ نہ موڑا ہو۔''[1]

یہاں بھی آیت (نشانی) سے مراد معجزہ ہے کیونکہ آیات قرآنیہ کے ساتھ اکثر لفظ تلاوت بیان کیا جاتا ہے۔ اور یہاں مادہ (اتیان) استعمال ہوا ہے۔ پرویز صاحب کا دعویٰ ہے کہ (اتیان) محسوسات کے ساتھ خاص ہے جیسا کہ اپنے موقع پر بحث آئے گی تو اس مفروضے کے مطابق یہاں معجزات محسوسہ مراد لینا پڑے گا، اگرچہ پہلے باب میں گزر چکا ہے کہ غلام احمد پرویز ہمارے نبی ﷺ کے لیے قرآن کے علاوہ کوئی محسوس معجزہ نہیں مانتے، لہٰذا اس آیت ﴿ وَمَا تَأْتِيهِمْ مِّنْ آيَةٍ ...... ﴾ کا مصداق پرویز صاحب اور اس کے مقلدین ہیں کہ یہ لوگ نشانیوں کے آنے کے باوجود مانتے نہیں بلکہ اعراض کرنے والے ہیں۔ جبکہ اس آیتِ قرآنیہ میں تصریح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کو محسوس معجزات بھی عطا کیے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَإِذَا جَاءَتْهُمْ آيَةٌ قَالُوا لَن نُّؤْمِنَ حَتَّىٰ نُؤْتَىٰ مِثْلَ مَا أُوتِيَ رُسُلُ اللَّهِ ﴾

''اور جب ان کے پاس کوئی نشانی آتی ہے تو کہتے ہیں کہ ہم کبھی یقین نہیں کریں گے، جب تک ہمیں بھی وہ چیز نہ دی جائے جو اللہ کے رسولوں کو دی گئی۔''[2]

یعنی یہ لوگ (کفار مکہ) نبی ﷺ کے محسوس معجزات کی اس وجہ سے تکذیب کرتے تھے کہ آپ بھی سابقہ رسولوں کی طرح معجزات کیوں نہیں لائے، جیسا کہ فرمایا:

﴿ فَلْيَأْتِنَا بِآيَةٍ كَمَا أُرْسِلَ الْأَوَّلُونَ ۝ ﴾

''پس اسے چاہیے کہ جس طرح پہلے نبیوں کو بھیجا گیا تھا وہ بھی اسی طرح ہمارے

[1] الأنعام 4:6. [2] الأنعام 124:6.

پاس کوئی نشانی لائے۔''[1]

اس آیت میں وہی تفصیل ہے جو اس موضوع کی آیت نمبر 2 (سابقہ آیت) میں مذکور ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ ○ وَاِنْ يَّرَوْا اٰيَةً يُّعْرِضُوْا وَيَقُوْلُوْا سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ ○ ﴾

''قیامت قریب آ گئی اور چاند پھٹ گیا۔ اور اگر یہ لوگ کوئی نشانی دیکھتے ہیں تو روگردانی کرتے ہیں اور کہتے ہیں (یہ) ایک جادو ہے جو ہمیشہ سے چلا آتا ہے۔''[2]

چاند کے پھٹنے کا واقعہ ایک محسوس معجزہ تھا، جس کے متعلق متواتر احادیث وارد ہیں۔ اسی لیے دوسری آیت میں اسے ﴿ اٰيَةً ﴾ (نشانی) کہا جس کے متعلق تاریخ بھی گواہی دیتی ہے، جیسا کہ ابن کثیر رحمہ اللہ نے البدایہ والنہایہ میں بھوپال کے حکمران کا واقعہ تاریخ فرشتہ سے نقل کیا ہے۔[3]

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى ﴾

''اور جب آپ نے کنکریاں پھینکی تھیں وہ آپ نے نہیں پھینکی تھیں بلکہ وہ اللہ نے پھینکی تھیں۔''[4]

یعنی نبی ﷺ نے بدر کے دن صرف ہاتھ سے کفار کی طرف کنکریاں پھینکی تھیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے انھیں کفار کی آنکھوں تک پہنچایا۔ یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت تھی۔ اس میں نبی ﷺ کا کوئی اختیار نہیں تھا۔ بدر میں کفار کی شکست کے اسباب میں سے ایک سبب یہ بھی تھا۔

صحیح احادیث میں بہت سے محسوس معجزات کا ذکر موجود ہے۔ جنھیں بعض اہلِ علم نے

---

(1) الأنبیاء 5:21۔ (2) القمر 2,1:54۔ (3) تاریخ فرشتہ: 120/3۔ (4) الأنفال 17:8۔

احادیث کی کتابوں میں علامات النبوۃ کے عنوان سے بیان کیا ہے، جیسے تھوڑے سے کھانے کا زیادہ لوگوں کے لیے کافی ہو جانا، تھوڑے سے پانی کا زیادہ لوگوں کے لیے اور ان کے جانوروں کے لیے کافی ہو جانا، نبی ﷺ کی انگلیوں سے پانی کا نکلنا، کنکریوں اور کھانے کا تسبیح پڑھنا وغیرہ، یہ سارے محسوس معجزات ہیں۔ رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے میں صحیح احادیث سے ثابت معجزات پر ایمان لانا جزو ایمان ہے۔ پرویز صاحب کا یہ نظریہ ہے کہ ''ہم ان احادیث کو نہیں مانتے جو قرآن کے خلاف ہوں'' (اس نظریے کی تفصیل پرویز صاحب کے معتقدات کے بیان میں آئے گی)، تاہم یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ معجزات والی احادیث قرآن کی کس آیت کے خلاف قرار دے کر مسترد کی جا سکتی ہیں؟

ایمان بالرسول کا تیسرا تقاضا

اتباع رسول، اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَ يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ﴾

''آپ فرمادیں: اگر تمھیں اللہ سے محبت ہے تو پھر میری اتباع کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمھارے گناہ بخش دے گا۔''[1]

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنی محبت کے لیے نبی ﷺ کی اتباع کو معیار قرار دیا ہے اور اپنی محبت اسی میں منحصر کر دی ہے کیونکہ شرط اور جزا جملہ شرطیہ میں اکثر حصر کے لیے آتے ہیں۔ محبت اپنے مشہور معنی میں ہے، یعنی جو لوگ اللہ تعالیٰ کی محبت کا دعویٰ کرتے ہیں یا اس کی محبت کو حاصل کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں، جبکہ اللہ کی محبت اس کی قربت ہے اور یہ محبت ثواب کو مستلزم ہے، پس جو شخص اللہ تعالیٰ کی محبت حاصل کرنا چاہتا ہے یا ثواب

[1] آل عمرٰن 3:31.

کا متلاشی ہے تو اسے معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ کی محبت، اطاعت رسول کو مستلزم ہے، لہٰذا اس متلاشی پر لازم ہے کہ وہ نبی ﷺ کی اتباع کرے۔ اسی طرح محبت الٰہی، احکام الٰہی کی پابندی کو مستلزم ہے جو کہ قرآن کی صورت میں ہمارے پاس موجود ہیں، لہٰذا جو شخص قرآن مجید پر عمل کرنا چاہتا ہے، اس کے لیے بھی نبی ﷺ کی احادیث پر عمل کرنا لازم ہے، لہٰذا یہ آیت کریمہ حجیت حدیث کے لیے قطعی دلیل ہے۔

اتباع اور اطاعت دو الفاظ ہیں اور یہ دونوں الفاظ قرآن کریم میں مختلف مواقع پر استعمال ہوئے ہیں۔ جب یہ الفاظ الگ الگ استعمال ہوں، تو اطاعت اتباع کو اور اتباع اطاعت کو محیط ہوتا ہے اور جب یہ دونوں الفاظ اکٹھے استعمال ہوں، تو اطاعت کا اطلاق اقوال کی پیروی پر اور اتباع کا اطلاق اعمال میں کسی کی پیروی پر ہوتا ہے۔ اہلِ لغت نے بھی اتباع کا معنی ”کسی کے نقش قدم پر چلنا اور عمل کرنا۔“ کیا ہے۔ یہ دونوں الفاظ اکٹھے بھی استعمال ہوتے ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿فَاتَّبِعُونِي وَأَطِيعُوا أَمْرِي ۝﴾

”پس میرا اتباع کرو اور میرا حکم مانو۔“ [1]

اس آیت میں اتباع اور اطاعت دونوں لفظ اکٹھے استعمال کیے گئے ہیں۔ اتباع کے معنی ہیں نبی ﷺ کے عمل کی پیروی کرنا اور اطاعت کا مطلب ہے آپ کے اقوال کو ماننا۔ عمل میں چونکہ اللہ تعالیٰ کی اتباع (اللہ تعالیٰ جیسا عمل کرنا) ممکن نہیں، اس لیے لفظ اتباع کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا ذکر نہیں کیا گیا، لہٰذا اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی جائے گی اس کے اقوال میں اور اللہ تعالیٰ کا قول قرآن ہے جبکہ رسول اللہ ﷺ کا قول حدیث ہے اور ان دونوں کے بارے میں اطاعت کا حکم دیا گیا ہے۔

[1] طٰہٰ 90:20۔

اس تمہید کے بعد یہ بات واضح ہوگئی کہ جب نبی ﷺ کے اعمال کا اتباع ہم پر لازم ہے، تو وہ سارے اعمال قرآن کریم میں مذکور نہیں بلکہ وہ احادیث میں مذکور ہیں، لہٰذا نبی ﷺ کی اتباع کے لیے آپ ﷺ کی احادیث پر عمل کرنا ضروری ہے لیکن جس شخص کے نزدیک نبی ﷺ کی احادیث حجت نہیں وہ قرآن کریم کی آیت ﴿فَاتَّبِعُونِي﴾ پر ایمان نہیں رکھتا جبکہ قرآن کریم کی ایک آیت کا منکر پورے قرآن کا منکر تصور ہوتا ہے اور جو شخص قرآن کریم پر ایمان رکھتا ہے اس کا اس آیت پر بھی ایمان ہونا لازم ہے۔ اور آیت ﴿فَاتَّبِعُونِي﴾ پر ایمان تب ہوگا جب نبی ﷺ کے اعمال احادیث میں تلاش کیے جائیں اور ان کی روشنی میں آپ کا اتباع کیا جائے، مثلاً: ایک شخص قرآن کریم میں ﴿وَأَقِيمُوا الصَّلَوٰةَ﴾ ''نماز قائم کرو'' پر ایمان رکھ کر نماز قائم کرتا ہے۔ نماز قائم کرنا ایک ایسا عمل ہے جس کی نبی ﷺ نے تادم حیات پابندی کی، لہٰذا احادیث میں نبی ﷺ کی نماز کی جو کیفیت ،اوقات، ارکان اور شرائط وغیرہ کا ذکر ہے ان پر لازماً عمل کرنا ہوگا۔ احادیث میں پانچ اوقات کا تفصیلی ذکر ہے۔ ہر نماز کی رکعتوں کی تعداد، ترتیب، قیام، رکوع و سجود اور قعدہ و سلام کا بیان ہے۔ ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ پڑھنا، دوسری سورتیں اور آیات پڑھنے کا ذکر احادیث میں موجود ہے۔

لہٰذا نماز پڑھنے میں فرمان نبوی:

«صَلُّوا كَمَا رَأَيْتُمُونِي أُصَلِّي»

''اس طریقے کے مطابق نماز پڑھو جس طرح تم مجھے پڑھتے ہوئے دیکھتے ہو۔''[1]

کو مدنظر رکھتے ہوئے سنت نبوی کی پیروی فرض ہے لیکن نماز قائم کرنے کے متعلق پرویز صاحب اور ان کے مقلدین کے مختلف افکار ملاحظہ فرمائیں۔

[1] صحيح البخاري، الأذان، باب الأذان للمسافرين إذا ......، حديث:631.

① تقریباً تیس سال قبل ایک پرویزی سے ملاقات ہوئی۔ بات چیت کے دوران میں اس نے کہا: ''ہر نماز صرف دو رکعت ہے۔'' اس نے دلیل کے طور پر سورۂ نساء کی آیت نمبر: 102 میں مذکور نماز خوف کا حوالہ دیا اور کہا: ''اس آیت میں خوف کا ذکر نہیں'' میں نے کہا: ''اس آیت میں امام کے ساتھ صرف ایک رکعت پڑھنے کا ذکر ہے جبکہ امام کے بغیر نماز کا کوئی ذکر نہیں تو پھر عمومی طور پر دو رکعت پڑھنے کا تمھارے نزدیک کیا جواز ہے؟'' پھر میں نے کہا: ''اس آیت میں اپنے پاس اسلحہ رکھنے کا ذکر ہے اگر تمھارے بقول یہ نماز خوف نہیں بلکہ اس سے عام نماز مراد ہے، پھر ہر نماز کے وقت اپنے پاس اسلحہ ضرور ہونا چاہیے۔''

② کچھ عرصہ بعد پرویزی نظریے کے حامل ایک میجر سے ملاقات ہوئی انھوں نے کہا: ''نماز پڑھنے کے لیے شریعت میں کوئی مقرر وقت ہے نہ کوئی متعین طریقہ، جس وقت اور جس طریقے سے نماز پڑھ لی جائے جائز ہے۔'' اس نے دلیل کے طور پر یہ آیت پیش کی:

﴿ كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهُ وَتَسْبِيحَهُ ﴾

''یقیناً (اللہ نے) ہر ایک کی نماز اور اس کی تسبیح جان لی ہے۔''[1]

میجر صاحب نے اس آیت کا یہ ترجمہ کیا:

''ہر شخص اپنی نماز اور تسبیح کا طریقہ خود سمجھتا ہے۔''

میں نے کہا ''یہ معنی غلط ہے، آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ کے علم کی بات ہو رہی ہے اور علم کی ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف راجع ہے، یعنی ہر ایک کی نماز اور تسبیح اللہ تعالیٰ جانتا ہے۔''

③ پرویز صاحب کا نماز کے متعلق نظریہ بھی اختلافات کا شکار ہے۔ ایک جگہ سورۂ نور کی آیت:58 لکھ کر فیصلہ کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں اجتماعاتِ نماز کے لیے کم از کم دو اوقات (نماز فجر، نماز عشاء) متعین تھے۔[2]

① النور 41:24. ② لغات القرآن: 43/3.

④ ایک موقع پر لکھتے ہیں: جس اصول کا میں نے اپنے مضمون میں ذکر کیا ہے وہ قانون اور عبادت دونوں پر منطبق ہے، یعنی اگر جانشین رسول اللہ (قرآنی حکومت) نماز کی کسی جزوی شکل میں جس کا قرآن نے تعین نہیں کیا (مثلاً: اوقات، تعداد رکعات) اپنے زمانے کے تقاضے کے تحت کچھ ردوبدل ناگزیر سمجھے تو وہ ایسا کرنے کا اصولاً مجاز ہوگا۔[1]

⑤ پرویز اپنی کتاب معارف القرآن میں ایک جگہ لکھتے ہیں: قرآن کریم نے نماز پڑھنے کا نہیں کہا، قیام صلاۃ، یعنی نماز کے نظام کے قیام کا حکم دیا ہے۔ مسلمان نماز پڑھتے ضرور ہیں لیکن انھوں نے نظام صلاۃ کو قائم نہیں کیا۔ ان کی نماز ایک وقت معینہ کے لیے ایک عمارت (مسجد) کی چاردیواری کے اندر ایک عارضی عمل بن کر رہ جاتی ہے۔[2]

⑥ ایک جگہ لکھتے ہیں: عجم میں مجوسیوں (پارسیوں) کے ہاں پرستش کی رسم کو نماز کہا جاتا تھا۔ یہ لفظ ان کے ہاں کا ہے اور ان کی کتابوں میں موجود ہے، لہٰذا صلاۃ کی جگہ نماز نے لے لی اور قرآن کی اصطلاح ﴿ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ ﴾ کا ترجمہ ہوگیا ''نماز پڑھو۔'' جب گاڑی نے اس طرف پٹڑی بدلی تو اس کے پہیے کا ہر چکر اسے منزل سے دور لے جاتا گیا، چنانچہ اب حالت یہ ہوچکی ہے کہ ﴿ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ ﴾ سے ذہن نماز پڑھنے کے علاوہ کسی اور طرف منتقل نہیں ہوتا اور نماز پڑھنے سے مراد ہے خدا کی پرستش کرنا۔[3]

اس کے علاوہ غلام احمد پرویز صاحب کی کتابوں میں صلاۃ کے متعلق متفرق معانی مذکور ہیں۔[4]

نماز ارکان اسلام میں سے ایک اہم رکن ہے جس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ ﴾

---

① قرآنی فیصلے، ص: 15,14. ② معارف القرآن: 328/4. ③ قرآنی فیصلے، ص: 27,26.

④ دیکھیے مکتوبات، سلیم کے نام تیرھواں خط، ص: 409.

''اور نماز قائم کرو، اور مشرکوں میں سے نہ ہو جاؤ۔''[1]

اس اہم رکن کے متعلق آپ نے پرویز صاحب کے خیالات ونظریات ملاحظہ فرمائے، کبھی کہتے ہیں کہ صرف دو نمازیں فرض ہیں، حالانکہ سورۂ نور آیت: 58 میں اوقات نماز بیان کرنا مقصود نہیں بلکہ وہ تین اوقات بیان کیے گئے ہیں جن میں انسان عموماً پردے کا اہتمام نہیں کرتا، لہٰذا انھی تین اوقات میں غلام اور بلوغت کے قریب عمر کے بچوں کو بھی اندر جانے کے لیے اجازت طلب کرنی چاہیے۔

کبھی کہتے ہیں: جانشینِ رسول نماز کے اوقات و کیفیات وغیرہ میں تبدیلی کرسکتا ہے تو پھر رسول اللہ ﷺ کی اتباع (جو مسلمانوں پر فرض ہے) کہاں گئی؟ کبھی کہتے ہیں: نماز مجوسیوں کا لفظ ہے۔ تو ہم کہتے ہیں کہ لفظ خدا بھی تو انھی کا ہے، آپ یہ لفظ کیوں استعمال کرتے ہیں؟ پرویز صاحب کی کتابوں میں لفظ خدا بہت زیادہ استعمال کیا گیا ہے۔ میں نے اتباع کی تشریح میں بطور مثال نماز کا ذکر کیا، زکاۃ اور حج وغیرہ کے متعلق ان کے خیالات کا تذکرہ ان شاء اللہ باب نمبر 9 میں کیا جائے گا۔

ایمان بالرسول کا چوتھا تقاضا

رسول اللہ ﷺ کی زندگی کو اسوہ بنانا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَن كَانَ يَرْجُوا اللَّهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ وَذَكَرَ اللَّهَ كَثِيرًا ۝ ﴾

''تمھارے لیے رسول اللہ کی ذات میں بہترین نمونہ ہے، (اور یہ نمونہ) اس شخص کے لیے ہے جو اللہ اور یوم آخرت کی امید رکھتا ہو اور کثرت سے اللہ کا ذکر کرتا ہو۔''[2]

① الروم 31:30. ② الأحزاب 21:33.

اس آیت کے اندر بہت سی تاکیدیں اور شرائط ہیں۔ لام، قد، لکم، في، رسول اللّٰہ، أسوۃ، حسنۃ، ﴿ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا ۝﴾ اور پھر لفظ ﴿ لِّمَنْ ﴾ جو (﴿ لَكُمْ ﴾ سے بدل ہے) میں تعمیم اور ابدیت کی طرف اشارہ ہے، یعنی یہ حکم صحابہ کے ساتھ مختص نہیں بلکہ جو شخص بھی اللہ تعالیٰ اور یوم آخرت کی امید اور عقیدہ رکھتا ہے اور وہ ہر وقت اللہ تعالیٰ کی بندگی اور اس کے ذکر میں مشغول ہے، اس پر لازم ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی زندگی کو پیش نظر رکھے۔ آپ کے اقوال، اعمال، اخلاق، سیرت و کردار، عبادات و معاملات اور جہاد کرنے میں آپ کی اتباع اپنے اوپر فرض سمجھے۔ اس تعمیم سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کا عملی نمونہ صرف صحابۂ کرام کے لیے خاص نہیں تھا جیسا کہ پرویزیت میں یہ عقیدہ ہے بلکہ صحابۂ کرام کے بعد قیامت تک آنے والے تمام جن و انس کے لیے بھی آپ کی زندگی میں بہترین نمونہ ہے۔ اس کی تائید دوسری آیت سے بھی ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۗ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝ وَّاٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ ﴾

”وہی ذات ہے جس نے ان پڑھوں میں انھی میں سے ایک رسول بنا کر بھیجا جو ان کو اس (اللہ) کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سناتا ہے، انھیں پاک کرتا ہے، اور انھیں کتاب و حکمت سکھاتا ہے، اگرچہ اس سے پہلے وہ صریح گمراہی میں تھے۔ اور (اس رسول کی بعثت) ان دوسرے لوگوں کے لیے بھی ہے جو ابھی تک ان سے نہیں ملے۔“[1]

[1] الجمعۃ 62:2، 3.

پس ﴿ اٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ ﴾ سے وہ تمام لوگ مراد ہیں جو صحابۂ کرام کے دور کے بعد پیدا ہوئے، خواہ وہ عرب ہوں یا عجم۔ ان آیات کی رو سے واضح ہوا کہ آپ ﷺ کی اطاعت اور اتباع ابد تک جاری رہے گی۔ کوئی مرکزِ ملت یا مدعیِ نبوت اس کی اطاعت کو ختم، منسوخ یا تبدیل نہیں کرسکتا۔ اب جناب غلام احمد پرویز کے کچھ کفریہ نظریات ملاحظہ فرمائیں:

ان کا کہنا ہے قرآن کریم میں جہاں جہاں اللہ تعالیٰ اور رسول ﷺ کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے، اس سے مراد امام وقت، یعنی مرکز ملت کی اطاعت ہے۔ جب تک محمد ﷺ امت میں موجود تھے تو ان کی اطاعت اللہ و رسول کی اطاعت تھی اور آپ کے بعد آپ کے جانشینوں کی اطاعت اللہ و رسول کی اطاعت ہوگی اور عربی میں اطاعت، زندہ کی فرماں برداری کو کہتے ہیں۔[1]

امام وقت سے مرکز ملت مراد لینے کے لیے کیا دلیل ہے؟ اسی طرح اطاعت سے زندہ کی فرماں برداری مراد لینا کس لغت میں ہے؟ پرویزی فرقے سے استدعا ہے کہ یہ اندھی تقلید چھوڑ دیں۔ پرویز صاحب کی بلا دلیل باتیں صریح گمراہی اور کفر ہیں۔

پس آیت میں اسوہ کے بیان سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ نبی ﷺ کی پوری زندگی تمام لوگوں کے لیے تا قیامت لائحۂ عمل ہے۔ اس پر عمل درآمد تب ہی ممکن ہے جب ہم قرآن کریم کا مقصد صحیح احادیث کی روشنی میں سمجھیں اور اپنے اعمال نبی ﷺ کے اسوۂ حسنہ کے مطابق بجا لائیں۔ احادیثِ صحیحہ کا قرآن کریم کے ساتھ تین قسم کا تعلق ہے۔

پہلی قسم: اس میں وہ احادیث شامل ہیں جو قرآنی احکام کی مؤید اور اجمال و تفصیل میں اس کے مطابق ہیں، یعنی قرآن حکیم میں پہلے سے کوئی حکم موجود ہوتا ہے اور رسول اللہ ﷺ اس کی مزید تائید و حمایت فرما دیتے ہیں، مثلاً: اسلام کے پانچ ارکان

[1] مقام حدیث: 155/1.

توحید و رسالت کی گواہی، نماز، روزہ، زکاۃ اور حج، یہ امور اور احکام قرآن کریم میں موجود ہیں اور نبی ﷺ نے احادیث میں ان کی مزید تائید و توثیق فرمادی ہے۔

پرویز صاحب اس قسم کے تعلق کو بظاہر ماننے کا دعویٰ تو کرتے ہیں لیکن آپ نے پہلے بھی جان لیا اور آئندہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ انھوں نے قرآنی نماز، روزہ، زکاۃ اور حج وغیرہ کے لیے اپنی طرف سے من گھڑت معانی ایجاد کر کے اس پر عمل کیا ہے۔

دوسری قسم: اس میں وہ احادیث شامل ہیں جو قرآنی احکام کی تشریح اور وضاحت کرتی ہیں، یعنی مطلق کی تقیید، مجمل کی تفصیل، عام کی تخصیص اور مبہمات کی توضیح۔ اس قسم کی احادیث بے شمار ہیں اور ہم نے باب اول میں نبی ﷺ کی صفت شارح میں ان میں سے کچھ مفصل بیان کی ہیں۔ اس قسم کی احادیث کے متعلق بھی پرویز صاحب کا رویہ منافقانہ ہے۔

تیسری قسم: اس قسم کی احادیث ایسے احکام پر دلالت کرتی ہیں جن کے متعلق قرآن نے کچھ بیان نہیں کیا، مثلاً: وہ احادیث جن میں پھوپھی اور بھتیجی اور اسی طرح خالہ اور بھانجی کا بیک وقت ایک نکاح میں جمع کرنا حرام ہے۔ یا احادیث شفعہ یا شادی شدہ زانی کو رجم کرنے کے متعلق احادیث۔ بعض علماء نے اس قسم کو قرآن کے مفہوم کی طرف راجع کر کے حجت بنایا ہے لیکن صحیح یہ ہے اس قسم کی احادیث مستقل حجت ہیں اور آیت اتباع رسول اور آیتِ اسوۂ حسنہ میں صراحتاً داخل ہیں، لہٰذا یہ تینوں قسم کی احادیث دین میں حجت ہیں۔

اس باب میں ایمان بالرسول کے ضمن میں رسول اللہ ﷺ کی بعض صفات اور احوال پر ایمان اور ایمان بالرسول کے چار تقاضے بیان کیے گئے ہیں جو واضح طور پر اتباع احادیثِ صحیحہ اور حجیت حدیث پر دلالت کرتے ہیں۔

باب 3

صحیح احادیث بھی وحی ہیں

اس کے متعلق قرآن کریم کی آیات بینات میں دلالت واشارات ملاحظہ فرمائیں:

[1] اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ○ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ○ ﴾

”وہ اپنی خواہش سے نہیں بولتے بلکہ وہ وحی ہے جو ان کی طرف کی جاتی ہے۔“[1]

قرآن کریم میں نطق (بولنے) کا مادہ بارہ دفعہ مختلف طریقوں سے مذکور ہے۔

پرندوں کی زبان سے آوازیں نکلتی ہیں (النمل 16:27)

روز قیامت انسانی چمڑے کی شہادت (حٰمٓ السجدة 21:41)

روز قیامت ہر چیز کا بولنا (حٰمٓ السجدة 21:41)

بتوں کا نطق سے عاجز ہونا (الصآفات 92:37، الأنبیآء 64,63:21)

روز قیامت انسان کا کسی وقت نطق سے عاجز ہونا (النمل 85:27، المرسلات 35:77)

نطق کی نسبت اعمال نامہ کی طرف (المؤمنون 62:23، الجاثیة 29:45)

انسانوں کا عام اوقات میں نطق (الذاریات 23:51)

نبی ﷺ کا اپنی خواہش سے نطق نہ کرنا (النجم 3:53)

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ قرآن کریم پر نطق کا اطلاق حقیقتاً ثابت نہیں۔ انسانوں یا

① النجم 4,3:53.

پرندوں کے منہ سے جو بات نکلتی ہے اسے نطق کہتے ہیں۔قرآن کریم میں لفظ ﴿الْهَوٰى﴾ کا استعمال 38 مرتبہ ہوا ہے۔اس کے مختلف معانی ہیں۔

اوپر سے آنا اور گرنا (طٰہٰ 20:81، النجم 53:1)

مائل ہونا، محبت کرنا (ابراھیم 14:37)

نفس کا کسی چیز کی خواہش کرنا: اس کا استعمال بہت ہے اور نفسانی خواہشات شریعت کی مخالف اور بے دلیل چیزیں ہوتی ہیں۔ جب ﴿الْهَوٰى﴾ کے ساتھ لفظ نفس مذکور ہو تو آخری معنی مراد ہوگا اور جب یہ لفظ نفس کے بغیر استعمال ہو تو اس کا معنی میلان ہوگا، خواہ یہ میلان خیر کی طرف ہو یا شر کی طرف۔

اس تمہید کے بعد اس آیت کی تفسیر اور تفصیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی آیات میں کفار اور مشرکین کی تردید کرتا ہے کہ وہ نبی ﷺ کو گمراہ اور غلط راستے پر سمجھتے تھے۔کبھی انسان خواہشِ نفس کی وجہ سے جہالت کی بنا پر غلطی کرلیتا ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ کی اس وجہ سے غلطی کے ارتکاب کی براءت ظاہر کرتے ہوئے فرمایا: ﴿وَمَا ضَلَّ﴾ اور کبھی دیدہ دانستہ غلطی ہوجاتی ہے ایسی غلطی کی براءت کے لیے فرمایا: ﴿وَمَا غَوٰى ۝﴾ کبھی دل کا میلان خیر اور صحیح بات کی طرف ہوتا ہے لیکن وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہیں ہوتا تو اس سلسلے میں فرمایا: ﴿وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝﴾ ''وہ نبی (ﷺ) اپنی خواہش سے بات نہیں کرتے'' یعنی شریعت کے معاملے میں آپ کی گفتگو آپ کا خودساختہ کلام نہیں اگرچہ وہ صحیح بھی ہو بلکہ وہ کلام وحی پر مبنی ہوتا ہے۔فرمایا: ﴿اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۝﴾

یعنی آپ کی زبان سے جو بھی کلمات نکلتے ہیں، خواہ وہ تلاوتِ قرآن ہو، خواہ دوسری باتیں ہوں، نبی ﷺ دونوں قسم کی باتیں اللہ تعالیٰ کی وحی کی وجہ سے زبان سے ادا کرتے ہیں۔جبکہ دوسرے لوگوں کی زبان سے قرآن کریم کی تلاوت کے علاوہ بہت سی باتیں

خواہشات نفس کی وجہ سے زبان سے ادا ہو جاتی ہیں۔ بعض باتیں صحیح بھی ہوتی ہیں لیکن وہ وحی نہیں ہوتیں۔ اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ ان آیات میں واضح طور پر دلیل ہے کہ قرآن کریم اور احادیث نبویہ دونوں وحی الٰہی ہیں۔ اگرچہ عام مفسرین نے اس آیت کو قرآن کریم سے منسلک کیا ہے لیکن لفظ نطق کے عموم کی وجہ سے یہ آیت احادیث کو بھی محیط ہے، بلکہ اگر غور کیا جائے تو اللہ تعالیٰ نے قرآن کے متعلق لفظ انزال، تنزیل، تلاوت، قراءت اور تعلیم بیان فرمایا ہے جبکہ نطق کا لفظ کسی بھی جگہ قرآن کے لیے استعمال نہیں ہوا، لہٰذا ﴿ وَمَا يَنْطِقُ ﴾ کے الفاظ حقیقتاً احادیث کے لیے ہیں اور قرآن کریم مجازی طور پر اس میں داخل ہے کیونکہ اعمال نامے کی طرف نطق کی نسبت دو آیتوں (سورۂ مومنون 23:62، سورۂ جاثیہ 45:29) میں بیان کی گئی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ کتاب (اعمال نامے) کی طرف نطق کی نسبت جائز ہے اور بعض مفسرین نے اس تعمیم کو ترجیح دی ہے۔ آلوسی اور بیضاوی نے لکھا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے:

اس سے مراد آپ کا کلام یا قرآن ہے اور سیاق کلام سے دونوں معانی معلوم ہوتے ہیں۔"[1]

آلوسی بیان کرتے ہیں: "میری رائے کے مطابق یہ بعید نہیں کہ ﴿ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ﴾ کو عموم پر محمول کیا جائے حتی کہ امام احمد اور امام ابو یوسف رحمہ اللہ جیسے لوگ جو نبی ﷺ کے لیے اجتہاد کے قائل ہیں، وہ بھی یہ نہیں کہتے کہ آپ ﷺ نے اجتہاد کے طور پر جو کلام کیا وہ خواہش نفس سے صادر ہوا...... اللہ کی پناہ! رسول کی شان ایسے نہیں ہو سکتی...... بلکہ وہ کہتے ہیں کہ آپ کا کلام اجتہاد اور وحی کے درمیان واسطہ (وحی خفی) ہوتا ہے۔"[2]

[1] تفسیر بیضاوي، مذکورہ آیت۔ [2] تفسیر روح المعاني: 72/15.

پس یہ آیتِ کریمہ صریح دلالت کرتی ہے کہ صحیح احادیث بھی وحی الٰہی میں داخل ہیں۔

2 اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۚ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ﴾

''رسول جو کچھ تمھیں دیں وہ لے لیا کرو اور جس چیز سے تمھیں روکیں اس سے رک جایا کرو۔''①

اس آیت سے بالکل واضح طور پر معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کی احادیث پر عمل کرنا فرض ہے کیونکہ وہ وحیِ الٰہی ہیں اور اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں یہ الفاظ ﴿ فَخُذُوْهُ ﴾ اور ﴿ فَانْتَهُوْا ﴾ امر کے صیغے سے بیان فرمائے ہیں اور یہ عموم پر دلالت کرتے ہیں، پس معلوم ہوا کہ یہ بھی وحی ہے۔

نوٹ: یہ آیت اگرچہ مالِ فے (جو بنونضیر سے حاصل ہوا تھا) کے متعلق ہے لیکن مسلمہ قرآنی قانون ہے کہ خصوصی سبب کا اعتبار نہیں ہوتا بلکہ الفاظ کے عموم کا اعتبار ہوتا ہے جبکہ پرویز صاحب تو سرے سے قرآنی آیت میں سبب نزول کے قائل ہی نہیں تو پھر اس آیت میں کیوں کر تخصیص کا ذکر کرتے ہیں۔

لفظ ﴿ وَمَآ اٰتٰىكُمُ ﴾ عام ہے کہ نبی ﷺ مالِ فے، مالِ غنیمت اور مالِ زکاۃ وصدقات کو تقسیم کرتے ہوئے اس میں سے جو حصہ کسی کو دیں یا امر کے طور پر جو حکم قرآن یا حدیث میں دیں یا عمل کے طور پر امت کو جو طریقہ اور کیفیت بتائیں یہ سب اسی آیت کے زمرے میں آتا ہے۔ باقی رہ گیا منع کرنا تو اس کے متعلق مستقل فرمادیا: ﴿ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ﴾ اس سے معلوم ہوا کہ نبی ﷺ کا دین صرف اوامر اور نواہی نہیں کیونکہ ''مَا أَمَرَكُمُ الرَّسُولُ'' ''جس چیز کا رسول تمھیں حکم دیں۔'' نہیں فرمایا بلکہ نبی ﷺ کا دین

① الحشر 7:59.

اوامر، اقوال، اعمال، تروک اور مناہی سب کو محیط ہے، لہٰذا رسول کی طرف ان الفاظ کی نسبت سے صراحتاً معلوم ہوا کہ قرآن کے ساتھ ساتھ احادیث کو ماننا بھی ضروری ہے۔

پرویزی جماعت کا اعتراض ہے کہ لفظ ''آتی'' محسوسات کے ساتھ خاص ہے، لہٰذا لفظ ﴿ اٰتٰكُمُ ﴾ یہاں صرف مالِ فے کے متعلق ہے، عام نہیں۔

اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ اس مصدر کے مختلف صیغے قرآن کریم میں 129 مرتبہ بیان ہوئے ہیں اور یہ محسوسات اور غیر محسوسات دونوں کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ غیر محسوسات کے لیے چند آیات ملاحظہ فرمائیں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَلَقَدْ اٰتَيْنَآ اِبْرٰهِيْمَ رُشْدَهٗ ﴾

''اور ہم نے ابراہیم کو اس کی دانائی دی۔''[1]

نیز فرمایا:

﴿ وَكُلًّا اٰتَيْنَا حُكْمًا وَّعِلْمًا ﴾

''اور ہم نے دونوں (داود اور سلیمان علیہما السلام) میں سے ہر ایک کو علم و حکمت عطا کی۔''[2]

نیز فرمایا:

﴿ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ عِلْمًا ﴾

''اور یقیناً ہم نے داود اور سلیمان کو علم عطا کیا۔''[3]

اور فرمایا:

﴿ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ ﴾

''اور بلاشبہ ہم نے لقمان کو حکمت عطا کی۔''[4]

نیز فرمایا:

[1] الأنبیآء 51:21. [2] الأنبیآء 79:21. [3] النمل 15:27. [4] لقمان 12:31

﴿ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ مِنَّا فَضْلًا ﴾

''اور بلاشبہ ہم نے داود کو اپنی طرف سے فضل عطا کیا۔''[1]

نیز فرمایا:

﴿ فَاٰتَيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْهُمْ اَجْرَهُمْ ﴾

''ہم نے ان میں سے ایمان لانے والوں کو ان کا اجر عطا کیا۔''[2]

مزید فرمایا:

﴿ وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ الَّذِيْٓ اٰتَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا ﴾

''اور ان لوگوں کو اس شخص کا حال پڑھ کر سنائیں جس کو ہم نے اپنی نشانیاں عطا کی تھیں۔''[3]

اور فرمایا:

﴿ وَاٰتَيْنٰهُ الْحِكْمَةَ وَفَصْلَ الْخِطَابِ ۝ ﴾

''اور ہم نے اس کو حکمت اور فیصلہ کن بات کا سلیقہ عطا کیا۔''[4]

نیز فرمایا:

﴿ وَتِلْكَ حُجَّتُنَآ اٰتَيْنٰهَآ اِبْرٰهِيْمَ عَلٰي قَوْمِهٖ ﴾

''اور یہ ہماری دلیل ہے جو ہم نے ابراہیم کو اس کی قوم کے مقابلے میں دی تھی۔''[5]

نیز فرمایا:

﴿ سَلْ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ كَمْ اٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ اٰيَةٍۢ بَيِّنَةٍ ﴾

''بنی اسرائیل سے پوچھیں کہ ہم نے انھیں کس قدر واضح دلائل دیے۔''[6]

① سبا 10:34. ② الحديد 27:57. ③ الأعراف 175:7. ④ صٓ 20:38. ⑤ الأنعام 83:6.
⑥ البقرة 211:2.

ان کے علاوہ اور بھی بہت سی آیات کریمہ ہیں جن میں مصدر ''إیتاء'' علم وحکمت اور آیات وحی کے لیے استعمال ہوا ہے۔اسی طرح مصدر ''أخذ'' محسوسات کے ساتھ خاص نہیں۔فرمان باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَ اَخَذَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ ﴾

''ظالموں کو زور کی آواز نے آ پکڑا۔''[1]

نیز ارشاد الٰہی ہے:

﴿ قَدْ اَخَذَ عَلَيْكُمْ مَّوْثِقًا مِّنَ اللّٰهِ ﴾

''اس (تمھارے باپ) نے تم سے اللہ کی قسم لے رکھی ہے۔''[2]

اور فرمان الٰہی ہے:

﴿ وَاَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِيْ ﴾

''اور اس پر میرا عہد قبول کرتے ہو۔''[3]

نیز رب العالمین نے فرمایا:

﴿ وَّ اَخَذْنَ مِنْكُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ۝ ﴾

''اور انھوں (عورتوں) نے تم سے پختہ عہد لیا ہے۔''[4]

اور ارشاد الٰہی ہے:

﴿ خُذِ الْعَفْوَ وَ اْمُرْ بِالْعُرْفِ ﴾

''درگزر کریں اور نیکی کا حکم کرتے رہیں۔''[5]

اس کے علاوہ اور بھی آیاتِ کریمہ ہیں جن میں مصدر ﴿ اَخَذَ ﴾ کے مختلف صیغے غیر محسوسات کے لیے استعمال ہوئے ہیں جن میں سے بعض قبولیت کے معنی میں ہیں اور

[1] هود11:67. [2] يوسف12:80. [3] آل عمرٰن3:81. [4] النسآء4:21. [5] الأعراف7:199.

یہاں پر ﴿ فَخُذُوْهُ ﴾ سے بھی قبولیت کا معنی مراد ہے۔ اس آیتِ کریمہ سے صحابۂ کرام نے بہت سے احکام مستنبط کر کے وحیِ قرآنی کی ذیل میں شمار کیے ہیں۔ یہاں ان کی تفصیل نقل کرنے کی گنجائش نہیں، بہرحال اس آیت کریمہ سے واضح طور پر معلوم ہوا کہ احادیث بھی وحیِ الٰہی ہیں۔

3 اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ ﴾

''میں تو صرف اس چیز کی پیروی کرتا ہوں جو میری طرف وحی کی جاتی ہے۔''[1]

نیز فرمایا:

﴿ قُلْ اِنَّمَآ اَتَّبِعُ مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ مِنْ رَّبِّيْ ﴾

''کہہ دیجیے: میں تو اسی چیز کی پیروی کرتا ہوں جو میرے رب کی طرف سے میری طرف وحی کی جاتی ہے۔''[2]

نیز فرمایا:

﴿ وَاتَّبِعْ مَا يُوْحٰٓى اِلَيْكَ ﴾

''اور جو کچھ آپ کی طرف وحی کیا گیا ہے اس کی اتباع کریں۔''[3]

نیز فرمایا:

﴿ وَّاتَّبِعْ مَا يُوْحٰٓى اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ﴾

''اور اس چیز کی پیروی کریں جو آپ کی طرف آپ کے رب نے وحی کیا ہے۔''[4]

نیز فرمایا:

﴿ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ ﴾

(1) الأنعام 50:6. (2) الأعراف 203:7. (3) يونس 109:10. (4) الأحزاب 2:33.

''میں تو صرف اسی بات کی اتباع کرتا ہوں جو میری طرف وحی کی جاتی ہے۔''[1]

ان آیات میں بیان کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبی ﷺ کو حکم تھا کہ وہ صرف وحی کی اتباع کریں، لہٰذا آپ ﷺ نے صرف وحی کی اتباع کی۔ لفظ اتباع کی تحقیق پہلے بیان کی جا چکی ہے کہ یہ عمل کرنے کے ساتھ خاص ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ آپ ﷺ نے اپنی نبوت والی زندگی میں اللہ تعالیٰ کی وحی کے مطابق اعمال کیے ہیں۔ اگر ان آیات میں وحی سے صرف قرآن کریم مراد ہے تو اس کے مطابق نبی ﷺ نے جو عمل کیا وہ احادیث میں موجود ہے، لہٰذا وہ بھی وحی ہے۔ اگر وحی سے مراد وحیِ جلی اور وحیِ خفی ہے تو پھر یہ آیت اس بات پر صریح دلیل ہے کہ نبی ﷺ کے تمام اعمال وحیِ الٰہی تھے۔ آپ کے اعمال کی تفصیل احادیث میں موجود ہے، پس تمام احادیث وحیِ الٰہی ہیں، اس مسئلے میں یہ آیت قطعی دلیل ہے۔

آپ کے نماز، روزے، حج اور جہاد وغیرہ سے متعلق اعمال احادیث میں مفصل بیان ہو چکے ہیں اور یہ اعمال مذکورہ آیت: ''میں تو صرف اس چیز کی اتباع کرتا ہوں جو میری طرف وحی کی گئی ہے۔'' کے تابع ہیں۔ اور اگر وہ اعمال اس وحی کے تابع نہیں تو پھر تو (العیاذ باللہ) یہ اعمال آپ نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرتے ہوئے سرانجام دیے ہیں جس کا آپ ﷺ کے متعلق تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ چونکہ آپ ﷺ نے وحی کی اتباع کرتے ہوئے تمام اعمال کیے تو پھر لازمی بات ہے کہ آپ کے اعمال کو وحی کا درجہ دیا جائے گا، لہٰذا ثابت ہُوا کہ احادیث صحیحہ بھی وحی ہیں۔

4 اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ مَا وَلّٰىهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِيْ كَانُوْا عَلَيْهَا ﴾

---

[1] الأحقاف 46:9.

’’کس چیز نے انھیں اس قبلہ (بیت المقدس) سے پھیر دیا جس کی طرف وہ رخ کیا کرتے تھے؟‘‘[1]

نیز فرمایا:

﴿ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰىهَا ﴾

’’پس ہم ضرور آپ کو اس قبلے کی طرف پھیر دیں گے جسے آپ پسند کرتے ہیں۔‘‘[2]

ان آیات میں تحویل قبلہ کا مختصر ذکر ہے جس کی تفصیل احادیث میں ہے کہ نبی ﷺ اور صحابۂ کرام پہلے بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نمازیں پڑھا کرتے تھے لیکن ہجرتِ مدینہ کے سولہ یا سترہ ماہ بعد اللہ تعالیٰ نے انھیں قبلے کی طرف رخ موڑنے کا حکم دے دیا۔ پہلے قبلے (بیت المقدس) کا ذکر قرآن کریم میں تو نہیں ہے، صرف صحیح احادیث میں اس کا تفصیلی ذکر ہے، چنانچہ آپ اور صحابۂ کرام حدیث (وحی خفی) پر عمل کرتے ہوئے بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نمازیں پڑھا کرتے تھے، اس سے ثابت ہوا کہ احادیث صحیحہ و حسنہ دین میں حجت ہیں۔

5 اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَاِذْ اَسَرَّ النَّبِيُّ اِلٰى بَعْضِ اَزْوَاجِهٖ حَدِيْثًا ۚ فَلَمَّا نَبَّاَتْ بِهٖ وَاَظْهَرَهُ اللّٰهُ عَلَيْهِ عَرَّفَ بَعْضَهٗ وَاَعْرَضَ عَنْۢ بَعْضٍ ۚ فَلَمَّا نَبَّاَهَا بِهٖ قَالَتْ مَنْ اَنْۢبَاَكَ هٰذَا ۭ قَالَ نَبَّاَنِيَ الْعَلِيْمُ الْخَبِيْرُ ۝ ﴾

’’پس جب نبی نے اپنی کسی اہلیہ سے راز کی ایک بات کی، پھر جب اس نے وہ بات (کسی ساتھ والی کو) بتادی اور اس چیز کو اللہ نے نبی پر ظاہر کر دیا تو آپ نے کچھ بات بتادی اور کچھ نہ بتائی، پس جب آپ نے وہ بات اس (اہلیہ) سے کی تو

[1] البقرة 2:142. [2] البقرة 2:144.

اس نے کہا کہ آپ کو کس نے بتایا؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: مجھے جاننے والے خبر رکھنے والے (اللہ تعالیٰ) نے بتایا ہے۔''[1]

اس آیت میں وحیِ خفی کی طرف پہلا اشارہ یہ ہے کہ نبی ﷺ نے اپنی ایک اہلیہ سے ایک راز کی بات کی تھی۔ وہ کون سی بات تھی جس کا ذکر قرآن کریم میں نہیں۔ بلکہ اس کا ذکر صحیح احادیث میں ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ نبی ﷺ نے شہد کو نہ پینے پر قسم اُٹھالی تھی تا کہ عائشہ اور حفصہ رضی اللہ عنہما راضی ہو جائیں۔[2] وحیِ خفی کی طرف دوسرا اشارہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فرمان ﴿ وَاَظْهَرَهُ اللّٰهُ عَلَيْهِ ﴾ ''اس بات کو اللہ تعالیٰ نے آپ پر ظاہر کر دیا۔'' اور ﴿ نَبَّاَنِيَ الْعَلِيْمُ الْخَبِيْرُ ﴾ ''مجھے جاننے والے اور باخبر (اللہ) نے بتایا ہے۔'' سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو واقعے کی تفصیل بتا دی، لیکن وہ خبر قرآن کریم میں وحیِ جلی کے طور پر نہیں ملتی بلکہ وحی خفی کے طور پر ملتی ہے۔ اور وحی خفی، اس لیے ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ﴿ وَاَظْهَرَهُ اللّٰهُ عَلَيْهِ ﴾ اور ﴿ نَبَّاَنِيَ الْعَلِيْمُ الْخَبِيْرُ ﴾ فرما کر دو مرتبہ اس کی نسبت اپنی طرف کی ہے۔

ایک پرویزی نے لکھا ہے کہ ہو سکتا ہے ﴿ اَلْعَلِيْمُ الْخَبِيْرُ ﴾ کوئی انسان ہو جس نے نبی ﷺ کو خبر دی۔ لیکن اس کی یہ بات صحیح نہیں ہے کیونکہ ﴿ اَلْعَلِيْمُ الْخَبِيْرُ ﴾ جیسی صفات پر جب الف لام داخل ہو جائے تو وہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کے لیے استعمال نہیں ہوتیں، یہ اللہ تعالیٰ کے لیے خاص ہیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ لفظ ﴿ اَلْخَبِيْرُ ﴾ کا معنی ہے ''باطنی امور کا علم رکھنا'' اور باطنی امور کا علم بھی اللہ تعالیٰ ہی کے لیے خاص ہے اور اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کے متعلق یہ عقیدہ رکھنا کہ وہ باطنی امور کا علم رکھتا ہے اور اسے ہر چیز کا علم ہے، صریح شرک ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ یہ لوگ کفر اور شرک کا ارتکاب

[1] التحريم 66:3. [2] صحيح البخاري، تفسير سورة التحريم.

کرتے ہوئے بھی نہیں ڈرتے اور اپنے مذموم مقاصد کے تحت وحیِ خفی سے انکار کیے جا رہے ہیں۔

6 اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى ۙ عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى ○ عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَاْوٰى ۭ اِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ مَا يَغْشٰى ۙ مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى ○ لَقَدْ رَاٰى مِنْ اٰيٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى ○ ﴾

''اور یقیناً اس (رسول) نے اس (جبریل) کو ایک بار اور بھی دیکھا، سدرۃ المنتھیٰ کے پاس، جس کے قریب ہی جنت الماوٰی ہے۔ جس وقت سدرۃ المنتھیٰ پر چھا رہا تھا جو چھا رہا تھا۔ آنکھ نے غلطی کی نہ اسے دھوکا ہوا۔ یقیناً اس (رسول) نے اپنے رب کی (بعض) بڑی بڑی نشانیاں دیکھیں۔''[1]

ان آیات سے سدرۃ المنتھیٰ کے قریب جبریل علیہ السلام سے نبی ﷺ کی ملاقات ثابت ہوتی ہے۔ اس درخت کو عظیم الشان چیز نے چھپا رکھا تھا اور اس کے پاس اور بھی بڑی بڑی نشانیاں نظر آئیں، جن کی تفصیل صحیح متواتر احادیث میں واقعۂ معراج کی صورت میں مذکور ہے۔ اگر ان احادیث سے صرف نظر کر لیا جائے تو اس کلام سے کوئی تفصیلی بات سمجھ میں نہیں آتی اور تاویلات باطلہ کی بھی اس میں کوئی گنجائش نہیں بلکہ منکرین حدیث اس باب میں جو تاویلات کرتے ہیں، وہ بالکل تحریفات ہیں جو یہود کی قبیح عادت تھی۔ ان آیات میں اس وحی خفی کی طرف اشارہ ہے، جس میں واقعۂ معراج تفصیل سے مذکور ہے۔ چونکہ یہ واقعہ نبی ﷺ کے معجزات میں سے ہے، اس لیے اسے اپنی عقل کی میزان پر نہیں تولنا چاہیے۔ یہ ایمان والوں کے لیے ایمان بالغیب کے عقیدے سے تعلق رکھتا ہے،

[1] النجم 53:13-18۔

جس کے بغیر کوئی انسان مومن نہیں ہوسکتا۔

7 اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ مَا قَطَعْتُمْ مِّنْ لِّيْنَةٍ اَوْ تَرَكْتُمُوْهَا قَآئِمَةً عَلٰٓى اُصُوْلِهَا فَبِاِذْنِ اللّٰهِ وَلِيُخْزِيَ الْفٰسِقِيْنَ ۝ ﴾

''تم نے (ان کے) کھجور کے درخت جو کاٹ ڈالے یا انھیں اپنی جڑوں پر قائم رہنے دیا تو یہ سب اللہ کی اجازت سے تھا اور اس لیے تھا کہ وہ (اللہ) فاسقوں کو رسوا کرے۔''[1]

اس آیت میں بنونضیر کی جلاوطنی کا تذکرہ ہے۔ اس جلاوطنی کے ساتھ نبی ﷺ نے صحابۂ کرام کو حکم دیا تھا کہ ان کے بعض باغات کاٹ ڈالو اور بعض کو رہنے دو۔ اللہ تعالیٰ نے اس کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا: ﴿ فَبِاِذْنِ اللّٰهِ ﴾ ''یہ سب اللہ کے حکم سے تھا۔'' جبکہ اللہ تعالیٰ کا یہ حکم قرآن کریم میں کسی بھی جگہ مذکور نہیں ہے، لہٰذا ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے یہ حکم وحی خفی کے ذریعے سے اپنے رسول ﷺ کو دیا تھا جس پر آپ ﷺ نے عمل کیا۔ جو شخص وحی خفی کو نہیں مانتا وہ نبی ﷺ تک یہ اذن الٰہی پہنچنے کا کون سا ذریعہ بتائے گا؟ ظاہر ہے ان کے پاس ضد، عناد اور کج روی کے سوا کوئی دلیل نہیں۔

8 اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّتِيْ تُجَادِلُكَ فِيْ زَوْجِهَا وَتَشْتَكِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ﴾

''یقیناً اللہ نے اس عورت کی بات سن لی جو آپ سے اپنے شوہر کے معاملے میں جھگڑ رہی تھی اور اللہ کے حضور شکایت کر رہی تھی۔''[2]

اس آیت میں ایک خاص واقعے کی طرف اشارہ ہے جس میں ایک عورت اپنے

---

[1] الحشر 5:59. [2] المجادلة 1:58.

خاوند کے متعلق نبی ﷺ سے جھگڑ رہی تھی اور اللہ تعالیٰ کے حضور فریاد کر رہی تھی۔ اس عورت کا نام، اس کے خاوند کا نام، وہ بات جو اس نے نبی ﷺ سے کی اور اللہ تعالیٰ کے حضور فریاد کے الفاظ یہ ساری چیزیں قرآن کریم کی کسی آیت میں مذکور نہیں، البتہ صحیح احادیث میں ان کا تفصیلی ذکر ہے۔ اگر احادیث کی کوئی اہمیت اور حجیت نہ ہوتی تو پھر اس قسم کی آیات بینات حقیقت سے خالی رہتیں، البتہ منکرین حدیث یہاں پینترا بدلتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہم اس قسم کی احادیث مانتے ہیں۔ ''بعض احادیث مانتے ہیں اور بعض کا انکار کرتے ہیں۔'' کی وضاحت ان شاء اللہ تعالیٰ بعد میں کی جائے گی۔

9 اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ اِذْ جَعَلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْحَمِيَّةَ حَمِيَّةَ الْجَاهِلِيَّةِ ﴾

''جب کافروں نے اپنے دلوں میں جاہلیت کے زمانے کی سی ضد کا تہیہ کر لیا۔''[1]

اس آیت میں صلح حدیبیہ کے واقعے کی طرف اشارہ ہے جس کا کچھ حصہ اشارات کے ساتھ اس سورت میں مذکور ہے، یعنی بیعت کا ذکر، منافقوں کا کردار، درخت کے نیچے بیٹھنا، مال غنیمت کی بشارت اور جنگ بندی وغیرہ۔ اس آیت میں کفار کی جاہلانہ ضد کا اجمالی طور پر ذکر ہے۔ اس ضد سے کیا مراد ہے؟ اس کی تشریح صلح حدیبیہ کے متعلق احادیث میں موجود ہے۔ کفار نے صلح نامہ پر بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ اور مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ لکھنے سے انکار کر دیا، نیز نبی ﷺ اور صحابۂ کرام کو بیت اللہ جانے سے روکنے پر اصرار کیا۔ اگر احادیث کے ذخیرے (وحی خفی) پر اعتماد نہ کیا جائے تو پھر سورۂ فتح کی تفسیر کہاں سے حاصل کریں گے؟ عقل کے ذریعے سے تو کوئی قصہ نہیں بنا سکتا اور یہ عذر بھی قبول نہیں کہ بعض احادیث کو مانا جائے اور بعض کا انکار کر کے ﴿ اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ

[1] الفتح 48:26.

الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ﴾ کا مصداق بن جائیں۔

[10] اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّبَدِّلُوْا كَلٰمَ اللّٰهِ ؕ قُلْ لَّنْ تَتَّبِعُوْنَا كَذٰلِكُمْ قَالَ اللّٰهُ مِنْ قَبْلُ﴾

''وہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے کلام کو بدل ڈالیں، کہہ دیجیے کہ تم ہرگز ہمارے ساتھ نہیں چلو گے۔ اللہ نے پہلے ہی سے ایسے فرما دیا تھا۔''[1]

اس آیت میں ﴿كَلٰمَ اللّٰهِ﴾ اور ﴿قَالَ اللّٰهُ مِنْ قَبْلُ﴾ کا مصداق کسی دوسری آیت میں نہیں ہے۔ آیت کا مضمون اور مقصد یہ ہے کہ جب تم صلح حدیبیہ سے فارغ ہو کر خیبر کی طرف روانہ ہو گے تو منافق لوگ کہیں گے کہ ہم بھی تمھارے ساتھ غزوۂ خیبر میں شریک ہونا چاہتے ہیں کیونکہ غزوۂ خیبر آسان تھا اور اس میں مالِ غنیمت زیادہ حاصل ہونے کی توقع تھی، لہٰذا اس موقع پر وحی خفی کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ کا فرمان یہ تھا کہ جو لوگ حدیبیہ کے سفر میں آپ کے ساتھ نہیں تھے وہ غزوۂ خیبر میں آپ کے ساتھ شامل نہیں ہو سکتے کیونکہ غنائمِ خیبر حقیقت میں ان کے سفر حدیبیہ کی تکالیف اور مصائب کے بدلے میں ایک عمدہ جزا تھی اور یہ ﴿هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ ۝﴾ ''احسان کا بدلہ احسان سے دیا جاتا ہے۔''[2] کے قانون کے مطابق تھی، لیکن منافق لوگ کوشش کرتے رہے تھے کہ وہ غزوۂ خیبر میں ضرور شریک ہوں۔ اگر وہ شریک ہو جاتے تو اس کا یہ نتیجہ نکلتا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان جو وحی خفی کی صورت میں تھا، تبدیل ہو جاتا۔ اگر پورے انصاف کے ساتھ اس آیت کے مفہوم پر غور و فکر کیا جائے تو یہ معلوم ہو جائے گا کہ وحی خفی کے اثبات اور اس پر کلامِ الٰہی اور فرمانِ الٰہی کا اطلاق کرنے میں یہ آیتِ کریمہ نصِ قطعی ہے

[1] الفتح 15:48. [2] الرحمٰن 60:55.

جبکہ اس کی مخالفت میں چون و چرا کی کوئی گنجائش نہیں۔ یہاں تک دس آیات کریمہ مختصر تشریح کے ساتھ بیان کی گئی ہیں جو کہ وحی خفی کے ثبوت پر دلالت کرتی ہیں اور وہ قرآن کی طرح شرعی حجت ہیں، یعنی صحیح و حسن احادیث بھی حجت شرعیہ کا درجہ رکھتی ہیں۔

باب 4

فہم قرآن کے لیے صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین حدیث نبوی کے محتاج تھے

باب دوم میں مذکور اللہ تعالیٰ کے فرمان:

﴿ وَاَنۡزَلۡنَاۤ اِلَيۡكَ الذِّكۡرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيۡهِمۡ ﴾

''ہم نے آپ کی طرف ذکر (قرآن) نازل کیا تاکہ آپ لوگوں کے سامنے بیان کریں جو کچھ ان کی طرف نازل کیا گیا۔''[1]

سے ثابت ہوتا ہے کہ احادیثِ صحیحہ قرآن کریم کی شرح ہیں، یعنی متن سمجھنے میں انسان شرح کا محتاج ہوتا ہے، لہٰذا تمام اہل قرآن، قرآن سمجھنے کے لیے احادیث کے محتاج ہیں۔ اس باب میں یہ بتانا مقصود ہے کہ صحابۂ کرام نے قرآن کے فہم اور تفسیر کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف رجوع کیا، حالانکہ ان کی زبان بھی عربی تھی اور ان کی عقل بھی باقی امت کی نسبت کامل تھی اور ﴿ اُولٰٓئِكَ هُمُ الرّٰشِدُوۡنَ ۝ ﴾ ''وہی لوگ ہدایت یافتہ ہیں۔''[2] کی صفت سے بھی متصف تھے۔ اس کے لیے چند مثالیں پیش خدمت ہیں:

1. جب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی:

﴿ وَلَا تَحۡسَبَنَّ الَّذِيۡنَ قُتِلُوۡا فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ اَمۡوَاتًا ؕ بَلۡ اَحۡيَآءٌ عِنۡدَ رَبِّهِمۡ

---

[1] النحل 16:44. [2] الحجرات 49:7.

﴿ يُرْزَقُونَ ۝ ﴾

''اور ان لوگوں کو جو اللہ کی راہ میں مارے گئے ہیں، مردہ خیال نہ کرو بلکہ وہ زندہ ہیں اور انھیں ان کے رب کے ہاں رزق دیا جاتا ہے۔''[1]

آیت کا ظاہر لغت اور عقل کے لحاظ سے مراد نہیں لیا جا سکتا کیونکہ جو شخص قتل کیا جائے وہ لازماً مر جاتا ہے اور مرنے کے بعد اس میں زندگی کا احساس باقی نہیں رہتا وہ کھا پی نہیں سکتا تو اللہ تعالیٰ نے یہ کیسے فرمایا کہ انھیں مردہ مت سمجھو بلکہ وہ زندہ ہیں اور انھیں روزی دی جاتی ہے۔ اہلِ لغت اور اہل عقل اسے سمجھنے سے عاجز ہیں، اسی لیے صحابۂ کرام میں سے ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس آیت کے متعلق استفسار کیا، پھر تابعین میں سے (مسروق رحمہ اللہ) نے ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ یہاں زندہ ہونے اور روزی دیے جانے کا کیا مفہوم ہے تو ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ان کی ارواح جنت میں سبز پرندوں کے اندر ہیں اور وہ جنت میں کھاتے پھرتے ہیں۔''[2] معلوم ہوا کہ یہ برزخی زندگی ہے جس کا عقل ادراک نہیں کر سکتی، اسی لیے فرمایا: ﴿ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ۝ ﴾ ''لیکن تم نہیں سمجھتے۔''[3] پس یہ حدیث قرآن کے لیے واضح تفسیر ہے۔

اس کے علاوہ بعض دوسری آیات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ برزخ کا زمانہ موت سے لے کر حشر تک کا زمانہ ہے۔ اس مدت کی مقدار اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہے۔ یہ زمانی دوری (بُعد) کے ساتھ مکانی بھی ہے، کیونکہ اس حالت میں بدن ایک جگہ ہوتا ہے اور روح دوسری جگہ اور یوم حشر دونوں کو اکٹھا کیا جائے گا لیکن پرویز صاحب کے استاد حافظ اسلم کی متضاد تحریروں میں عذابِ قبر سے انکار کی کوشش کی گئی ہے۔ فرماتے ہیں:

---

[1] آل عمران 169:3. [2] صحیح مسلم، الإمارة، بیان أن أرواح الشهداء......، حدیث: 1887.
[3] البقرة 154:2.

برزخ کی مدت مرنے والوں کی موت سے لے کر حشر تک ہے کہ وہ اس میں اپنے رب کی حضوری سے آڑ میں رکھے جائیں گے اور جب حشر ہوگا تو اللہ تعالیٰ کے سامنے حاضر کردیے جائیں گے۔[1]

پھر اس نظریے سے انحراف کر کے لکھتے ہیں کہ موت اور حشر میں مردوں کے لیے فصل (دوری) زمانی نہیں ہے۔[2] پھر لکھتے ہیں: اہل برزخ کو زمانے کا مطلق احساس نہیں، اس لیے یہ سمجھنا چاہیے کہ مرنے والے کے لیے موت ہی کا دن حشر کا دن ہے۔[3] پھر عذاب قبر پر اعتراض کرتے ہوئے لکھتے ہیں: یہاں یہ بھی سوچنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں انصاف ہے یہ کیونکر جائز ہوسکتا ہے کہ جس نے حضرت نوح علیہ السلام کا انکار کیا وہ پانچ ہزار سال پہلے سے عذاب سہے اور برزخ میں جلے اور جس نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار کیا وہ پانچ ہزار یا دس ہزار برس بعد۔[4]

یہ متضاد نظریہ ہے اور اس کا مقصد عذابِ قبر اور انعامِ قبر سے انکار کرنا ہے جو معتزلہ (پرانے منکرین حدیث) کا عقیدہ ہے۔

2 اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يَلْبِسُوْٓا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ○ ﴾

”وہ لوگ جو ایمان لائے ہیں اور انھوں نے اپنے ایمان کو ظلم (شرک) کے ساتھ آلودہ نہیں کیا تو انھی کے لیے امن ہے اور یہی صحیح راستے پر ہیں۔“[5]

اس آیت میں لفظ ظلم کا ذکر ہے چونکہ عربی لغت اور عرف میں ظلم کے معنی میں بڑی

1 قرآنی فیصلے، ص:312. 2 قرآنی فیصلے، ص:318. 3 قرآنی فیصلے، ص:322. 4 قرآنی فیصلے، ص:324. 5 الأنعام 82:6.

وسعت ہے۔ خلاف اولیٰ بلکہ اجتہادی خطا سے لے کر کفر اور شرک تک اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے عذاب سے بچنے اور صحیح راستے پر ہونے کے لیے ایسے ایمان کو شرط قرار دیا ہے جس کے ساتھ ظلم کی آمیزش نہ ہو۔ اس پر صحابۂ کرام نے سمجھا کہ یہاں ظلم اپنے عام مفہوم میں استعمال ہوا ہے اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ انبیاء علیہم السلام کے سوا کوئی شخص بھی گناہ سے معصوم نہیں، لہٰذا صحابۂ کرام کو خطرہ لاحق ہوا کہ ہم سے گناہ سرزد ہوتے ہیں جس کی وجہ سے ہمیں امن اور ہدایت نہیں ملے گی۔ ان کی اس فکر مندی کے پیش نظر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں سمجھایا کہ یہاں ظلم سے ایک خاص قسم، یعنی ظلم عظیم مراد ہے جو کہ شرک ہے، جس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ ۝ ﴾

''بلاشبہ شرک بہت بڑا ظلم ہے۔''[1]

یعنی یہاں ظلم سے مراد شرک ہے، لہٰذا ایسا ایمان جس کے ساتھ شرک کی آمیزش نہیں ہوگی وہ باعث امن ہے اور امن سے مراد یہ ہے کہ دائمی عذاب اور جہنم سے بچنا۔

صحابۂ کرام اگرچہ اہل زبان تھے لیکن انھوں نے بھی لفظ ظلم کی وضاحت کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث (وحی خفی) کی طرف رجوع کیا تو انھیں اس کی حقیقت سمجھ میں آئی۔ جبکہ پرویز صاحب اور ان کے ہم خیال عجمی ہیں انھیں تو عربی لغت اور گرامر پر بھی عبور حاصل نہیں اور عقل بھی ناقص ہے تو پھر ایسے لوگ حدیث کے بغیر قرآن کریم کیسے سمجھ سکتے ہیں۔ اور انھوں نے جو فہم قرآن کا دعویٰ کیا ہے وہ تفسیر نہیں بلکہ تحریف معنوی ہے جو یہودیوں کا پیشہ ہے۔

[1] لقمان 13:31، صحيح البخاري، أحاديث الأنبياء، باب قول الله تعالىٰ ﴿ وَاتَّخَذَ اللَّهُ إِبْرَاهِيمَ خَلِيلًا ﴾، حديث: 3360، وصحيح مسلم، الإيمان، باب صدق الإيمان وإخلاصه، حديث: 124.

3 اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا صَلُّوا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوا تَسْلِيمًا ۝ ﴾

''اے ایمان والو! تم بھی اس (رسول ﷺ) پر درود وسلام بھیجو۔''[1]

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں پر واجب قرار دیا ہے کہ وہ نبی ﷺ پر صلاۃ وسلام پڑھیں۔لفظ صلاۃ قرآن کریم میں مختلف معانی میں استعمال ہوا ہے:

دعا کے معنی میں (توبة 103:9)

نماز جنازہ پڑھنا (توبة 84:9)

دین (ھود 87:11)

اہتمام شان اور تعظیم کرنا (الأحزاب 56:33)

انزال رحمت (الأحزاب 43:33)

درود پڑھنا (الأحزاب 56:33)

جبکہ اس آیت میں صلاۃ کا تعلق نبی ﷺ کے ساتھ ہے کیونکہ ﴿ عَلَيْهِ ﴾ میں ضمیر ''ہ'' آپ کی طرف لوٹتی ہے۔تو ''صَلَاةٌ عَلَى النَّبِيِّ'' کا معنی نبی ﷺ کے لیے خاص دعا کرنا ہے جس کا عرف میں ترجمہ درود کیا جاتا ہے۔صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم ﴿ صَلُّوا عَلَيْهِ ﴾ کا مطلب تو سمجھتے تھے لیکن اس کے الفاظ کیا ہوں، اس ابہام کو دور کرنے کے لیے صحابۂ کرام نے نبی ﷺ سے درخواست کی کہ ہم نے سلام پڑھنے کا طریقہ تو آپ سے سیکھ لیا لیکن صلاۃ پڑھنا ہم نہیں جانتے، لہٰذا وہ ہمیں سکھلا دیں تو نبی ﷺ نے انھیں درود کے وہ الفاظ سکھلائے جو مسلمان عام طور پر تشہد میں درود ابراہیمی کے طور پر پڑھتے ہیں۔[2] اس

[1] الأحزاب 56:33. [2] صحيح البخاري، أحاديث الأنبياء، باب:10، حديث:3370، ومسند أحمد: 244/4.

سے دو باتیں واضح ہوگئیں۔

1 صحابۂ کرام عبادت اوراس کی کیفیات و ہیئات اپنی طرف سے نہیں بناتے تھے بلکہ وہ اس کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے راہ نمائی حاصل کرتے تھے کیونکہ اپنی طرف سے کیفیاتِ عبادت ایجاد کرنا صریح بدعت ہے۔

2 صحابۂ کرام تفسیر قرآن کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف رجوع کرتے تھے، حالانکہ وہ اہل لغت اوراہل فہم وفراست تھے، پھر بھی وہ کیفیت درود نہیں سمجھے تھے، اس لیے انھوں نے کیفیتِ درود سمجھنے کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف رجوع کیا۔

اس ضمن میں اور بھی بہت سی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔اس بات کا خلاصہ یہ ہے کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے قرآن فہمی کے لیے اپنی عقل اورفہم وفراست پرانحصار نہیں کیا بلکہ انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کی طرف رجوع کیا، لہٰذا ثابت ہوا کہ احادیث صحیحہ دین میں یقینی حجت ہیں جن پر قرآن کریم کا فہم موقوف ہے۔

قرآن کریم پر عمل کا انحصار علم حدیث پر ہے

قرآن کریم پر عمل علم حدیث پر موقوف ہے اور یہ امر حجیت حدیث کے لیے صریح دلیل ہے۔ کیونکہ قرآن کریم پر عمل کرنا فرض ہے جس کی فرضیت اور حجیت میں کوئی شک نہیں۔ چونکہ قرآن کریم پر عمل علم حدیث پر موقوف ہے اور فرض کا موقوف علیہ (جس پر وہ منحصر ہو وہ) بھی فرض ہوتا ہے، لہٰذا علم حدیث بطور حجیت فرض ہے۔ سابقہ باب میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ فہم قرآن علم حدیث پر موقوف ہے اور اس باب میں یہ ثابت کرنا ہے کہ عمل بالقرآن علم حدیث پر موقوف ہے۔ گزشتہ ابواب کے ضمن میں یہ بات ثابت کی جا چکی ہے کہ قرآن کریم متن ہے اور نبی ﷺ کی صحیح احادیث اس کی شرح اور توضیح ہیں۔ شرح کے بغیر متن کو سمجھنا اور اس پر عمل کرنا مشکل اور کبھی محال ہوتا ہے۔ اس موقف کی وضاحت کے لیے چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

① اقامت صلاۃ (نماز)

اسلامی اعمال میں سب سے زیادہ اہم عمل اقامت صلاۃ ہے اور اس کی اہمیت کی دلیل یہ ہے کہ قرآن کریم میں اس کا کثرت سے ذکر کیا گیا ہے۔ قرآن کریم میں لفظ صلاۃ 83 مرتبہ اور مادۂ صلاۃ 95 مرتبہ استعمال ہوا ہے۔ گزشتہ باب میں اس کے مختلف (7) معانی بھی بیان کیے گئے ہیں۔ ان مختلف صیغوں میں سے امر کا صیغہ بطور مفرد، جمع، مذکر اور

مؤنث 20 مرتبہ مذکور ہے۔ لفظ اقامت صلاۃ کے ساتھ مختلف صیغوں کی صورت میں 42 مرتبہ مذکور ہے۔ ان میں سے امر بصیغہ مفرد پانچ مرتبہ، جمع مذکر بارہ مرتبہ، جمع مؤنث ایک مرتبہ اور لفظ ''مقیمین'' دومرتبہ استعمال ہوا ہے۔ اقامت صلاۃ کی ایجابی تشریح سورۂ معارج کی آیت 22 تا 34 اور سلبی طور پر سورۂ ماعون کی آیت 4 تا 7 میں موجود ہے۔

مختلف آیات میں مومنین کی صفات میں صفت اقامت صلاۃ کا ذکر ہے۔ جبکہ جہنم میں جانے کے اسباب میں سے ایک سبب ترک صلاۃ بھی ہے، چنانچہ ارشاد فرمایا:

﴿ مَا سَلَكَكُمْ فِي سَقَرَ ○ قَالُوا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّينَ ○ ﴾

''(جنتی جہنمیوں سے پوچھیں گے کہ) کون سی چیز تمھیں جہنم میں لے آئی؟ وہ جواب دیں گے ہم نماز نہیں پڑھا کرتے تھے۔''[1]

قرآن کریم میں کثرت سے اقامت صلاۃ کا ذکر اس کی اہمیت کی صریح دلیل ہے۔ اس اہمیت کی وجہ سے قرآن کریم میں صلاۃ کے اجزائے ترکیبی بھی الگ الگ بیان کیے گئے ہیں جن کی تفصیل درج ذیل ہے۔

اوقاتِ نماز کا اثبات

1 اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ إِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ كِتٰبًا مَّوْقُوتًا ○ ﴾

''بے شک نماز مومنوں پر مقررہ اوقات میں فرض ہے۔''[2]

نیز فرمایا:

﴿ حٰفِظُوا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى ۗ وَقُومُوا لِلّٰهِ قٰنِتِينَ ○ ﴾

---

(1) المدثر 74:42,43۔ (2) النسآء 4:103۔

''نمازوں کی پابندی کرو خصوصًا درمیانی نماز کی اور اللہ کے حضور عاجزی اور ادب سے کھڑے ہو جاؤ۔''[1]

اس آیت میں پانچ نمازوں کا تعین کیا گیا ہے۔ قانونِ عربی کے لحاظ سے لفظ ﴿الصَّلَوٰتِ﴾ جمع ہے اور جمع کا اطلاق کم از کم تین پر ہوتا ہے۔ ﴿وَالصَّلٰوةِ﴾ میں واو عاطفہ ہے جس کا لغوی تقاضا مغایرت ہے، یعنی معطوف اپنے معطوف علیہ سے غیر ہوگا اگرچہ درمیان میں مناسبت بھی ہو۔ ﴿الْوُسْطٰى﴾ کا لغوی مقتضا یہ ہے کہ ایک چیز کے دو اطراف متساوی ہوں۔ عربیت کے لحاظ سے ان تینوں تقاضوں کو ضرور پورا کرنا ہو تو ادنیٰ سے شروع کریں گے۔ وہ یہ کہ اگر صلوات کو تین پر محمول کریں گے تو پھر وسطیٰ کا مقتضا پورا نہیں ہوسکتا کیونکہ تین عدد کی درمیانی چیز کے دونوں اطراف متساوی نہیں ہوسکتے بلکہ ایک طرف دو اور دوسری طرف ایک نماز آئے گی، لہٰذا الصَّلَوٰتِ (جمع) سے لازمی طور پر چار مراد لیا جائے گا اور ''اَلصَّلَاةُ'' (واحد) پانچواں عدد ہوگا جو مغایرت کی وجہ سے ہے اور اس طرح ﴿الْوُسْطٰى﴾ کا تقاضا بھی پورا ہوتا ہے، یعنی پانچویں نماز کے دونوں طرف دو دو نمازیں ہیں۔ اس طرح پانچ کی تعداد پوری ہوگئی، لہٰذا لفظ ''صلوات'' میں چار کے عدد سے ساری مقتضیات پوری ہوگئیں اور چار سے آگے جانے کی ضرورت نہیں۔ یہ پانچ نمازیں تب ہوسکتی ہیں جب ان کے پانچ اوقات الگ الگ ہوں۔ اس آیت میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ فرض نماز کا ایک رکن قیام ہے۔

2 اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ

''سورج کے ڈھلنے سے رات کے اندھیرے تک نمازیں پڑھا کرو۔ اور فجر میں

1. البقرة 2:238.

قرآن پڑھا کرو۔"[1]

اس آیت میں اوقات کا طریقۂ اثبات اس طرح ہے کہ "دلوك" لغت میں زوال اور غروب کے لیے مستعمل ہے۔ اکثر زوال کے لیے آتا ہے، یہاں لازماً زوال کا معنی مراد لیا جائے گا۔ کیونکہ اگر غروب کا معنی لیا جائے تو ﴿غَسَقِ الَّيْلِ﴾ بھی غروب ہے، تو پھر کلام کا کوئی فائدہ نہیں رہتا۔ زوال آفتاب سے رات کی تاریکی تک نماز پڑھنے کا مطلب یہ ہے کہ نماز ظہر زوال کے فوراً بعد اور پھر نماز عصر، پھر غروب آفتاب کے فوراً بعد نماز مغرب اور پھر نماز عشاء جبکہ نماز فجر طلوع فجر کے بعد۔ منکرین حدیث اس آیت کو تو مانتے ہیں لیکن اوقات کا تعین حدیث کی رو سے نہیں مانتے۔ آیت پر عمل کرتے ہوئے ان پر لازم ہے کہ وہ زوال سے لے کر رات کی پوری تاریکی چھا جانے تک نماز میں مشغول رہیں۔ درمیان میں وقفہ نہ کریں۔ جبکہ زوال سے عشاء تک نماز میں مشغول رہنا تو درکنار یہ لوگ تو سرے سے نماز پڑھنے کے قائل ہی نہیں، اس کا ثبوت بعد میں پیش کیا جائے گا۔

[3] اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَأَقِمِ الصَّلَوٰةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ﴾

"دن کے دونوں سروں اور رات کی کچھ گھڑیوں میں نماز پڑھا کریں۔"[2]

اس آیت میں بھی پانچوں نمازوں کے اوقات کا بیان ہے کیونکہ دن کے دو اطراف ہیں۔ زوال سے پہلے اور زوال کے بعد۔ زوال سے پہلے نماز فجر اور زوال کے بعد نماز ظہر اور نماز عصر۔ زُلَفًا "زُلْفَةٌ" سے ماخوذ ہے جس کا مطلب ہے نزدیکی، یعنی رات کی وہی گھڑیاں جو دن کے قریب ہیں تو اس سے مراد صرف اول وقت غروب ہے۔ اور دوسرا وہ ہے جب شفق غائب ہو جائے، تو اس طرح مغرب اور عشاء اس وقت میں داخل

[1] بنی إسرآءیل 78:17۔ [2] ھود 114:11۔

ہوگئیں۔ اس حوالے سے بھی منکرین حدیث سے استفسار کیا جا سکتا ہے کہ جب تم احادیث سے تعین اوقات تسلیم نہیں کرتے تو پھر اس آیت پر عمل کرتے ہوئے دن کے دونوں اطراف میں مسلسل نماز پڑھتے رہو اور رات کی ابتدائی ساعات میں مسلسل نماز پڑھو مگر عجیب معاملہ یہ ہے کہ ان کی سرے سے نماز ہی نہیں، اگر ہے تو وہ بھی ان کی اپنی صوابدید پر۔

4 اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوبِهَا ۖ وَمِنْ آنَاءِ اللَّيْلِ فَسَبِّحْ وَأَطْرَافَ النَّهَارِ لَعَلَّكَ تَرْضَىٰ ○ ﴾

''سورج نکلنے سے پہلے اور اس کے غروب ہونے سے پہلے اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کیجیے اور رات کی بعض گھڑیوں میں بھی تسبیح کیا کریں اور دن کے اطراف میں بھی، تاکہ آپ (اس سے) خوش ہوں۔''[1]

اس آیت میں بھی پانچ اوقات کا ذکر ہے۔ طلوع آفتاب سے پہلے نماز فجر اور غروب سے پہلے نماز عصر ﴿ آنَاءِ اللَّيْلِ ﴾ میں مغرب اور عشاء کا ذکر ہے اور اطراف جمع بمعنی تثنیہ ہے اور یہ قانون عربی میں مستعمل ہے۔ اس سے مراد وہ وقت ہے جس میں دن کے دونوں اطراف جمع ہوتے ہیں، یعنی وقت ظہر۔

منکرین حدیث اعتراض کرتے ہیں کہ اس آیت میں تو تسبیح اور حمد پڑھنے کا حکم ہے، نماز کا تو ذکر ہی نہیں ہے۔

اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ زبان سے تسبیح وتحمید کرنا ذکر الٰہی ہے جس کے لیے کوئی وقت مقرر نہیں کیونکہ ذکر الٰہی ایسی عبادات میں سے ہے جس کے وقت کی کوئی قید نہیں،

[1] طٰہٰ 20:130۔

جیسا کہ بہت سی آیات سے ثابت ہے۔ اسی طرح دل میں تسبیح وتحمید، یعنی عقیدۂ توحید کا دوام ضروری ہے۔ اس کے لیے بھی کوئی وقت مقرر نہیں ہوسکتا، لہٰذا معلوم ہوا کہ یہ عملی تسبیح وتحمید ہے اور وہ صرف نماز ہے۔

5 اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ فَسُبۡحٰنَ اللّٰهِ حِیۡنَ تُمۡسُوۡنَ وَحِیۡنَ تُصۡبِحُوۡنَ ۝ وَلَهُ الۡحَمۡدُ فِی السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَعَشِیًّا وَّحِیۡنَ تُظۡهِرُوۡنَ ۝ ﴾

"پس تم اللہ کی تسبیح بیان کرو جب شام کرو اور جب صبح کرو۔ اور آسمانوں اور زمین میں اسی کی ستائش ہے۔ اور اس کی تسبیح کرو پچھلے پہر بھی اور جب تم ظہر کرو۔"[1]

اس آیت میں بھی پانچوں نمازوں کے اوقات کی مکمل تصریح ہے۔ ﴿تُمۡسُوۡنَ﴾ سے مغرب اور عشاء ﴿تُصۡبِحُوۡنَ﴾ سے وقت صبح ﴿عَشِیًّا﴾ سے وقت عصر اور ﴿تُظۡهِرُوۡنَ﴾ سے وقت ظہر مراد ہے۔

ان آیات سے پوری طرح واضح ہوگیا کہ اللہ تعالیٰ نے نماز کے لیے پانچ اوقات مقرر کیے ہیں۔ لیکن ان اوقات کی پوری وضاحت اور ان کی ابتدا و انتہا کے بارے میں تفصیل کتب احادیث میں موجود ہے، یعنی ان آیات پر عمل کرنے کے لیے احادیث کی لازمی ضرورت ہے تاکہ اوقات کی ابتدا و انتہا کے بارے میں کوئی کمی بیشی نہ ہو۔

قرآن کی روشنی میں نماز کے ارکان وشرائط

شرائطِ نماز قرآن کی روشنی میں

❁ طہارت: اس کی تین اقسام ہیں: وضو، غسل اور تیمّم۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

[1] الروم 30:17، 18۔

﴿ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا قُمْتُمْ إِلَى الصَّلَاةِ فَاغْسِلُوا وُجُوهَكُمْ وَأَيْدِيَكُمْ إِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوا بِرُءُوسِكُمْ وَأَرْجُلَكُمْ إِلَى الْكَعْبَيْنِ ﴾

''اے ایمان والو! جب تم نماز کے لیے اٹھو تو اپنے چہرے اور کہنیوں تک ہاتھ دھو لیا کرو، اور اپنے سروں کا مسح کیا کرو اور ٹخنوں تک دونوں پاؤں دھو لیا کرو۔''[1]

اس آیت میں وضو کا بیان ہے۔ جبکہ احادیث میں کلی کرنا، ناک میں پانی چڑھانا، ناک جھاڑنا، ڈاڑھی کا خلال کرنا، انگلیوں کا خلال کرنا اور کانوں کا مسح کرنا کی تفصیل بطور تکمیل فرض بیان کی گئی ہے اور یہ تمام چیزیں مذکورہ چار اعضاء سے خارج نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَإِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوا ﴾

''اور اگر تم جنبی ہو تو پھر نہا کر اچھی طرح پاک ہو جاؤ۔''[2]

آیت کے اس حصے میں غسل کا ذکر کیا گیا ہے، نیز فرمایا:

﴿ وَإِنْ كُنْتُمْ مَرْضَى أَوْ عَلَى سَفَرٍ أَوْ جَاءَ أَحَدٌ مِنْكُمْ مِنَ الْغَائِطِ أَوْ لَامَسْتُمُ النِّسَاءَ فَلَمْ تَجِدُوا مَاءً فَتَيَمَّمُوا صَعِيدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوا بِوُجُوهِكُمْ وَأَيْدِيكُمْ مِنْهُ ﴾

''اور اگر تم مریض ہو یا سفر میں ہو یا تم میں سے کوئی قضائے حاجت سے فارغ ہو کر آیا ہو یا تم نے عورتوں سے صحبت کی ہو اور تمھیں پانی میسر نہ ہو تو پھر پاک صاف مٹی سے تیمّم کر لو، پھر اس سے اپنے چہرے اور ہاتھوں کا مسح کرو۔''[3]

آیت کے اس حصے میں تیمّم کے جواز کے اسباب اور اس کی کیفیت بیان کی گئی ہے۔

❁ دوام: یعنی ہمیشہ پانچوں نمازیں پڑھنا، کسی وقت کی بھی نماز نہ چھوڑنا۔ ارشاد باری

---

(1) المآئدة 6:5. (2) المآئدة 6:5. (3) المآئدة 6:5.

تعالیٰ ہے:

﴿ اِلَّا الْمُصَلِّيْنَ ۝ الَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ ۝ ﴾

''مگر وہ نمازی، جو اپنی نمازیں ہمیشہ ادا کرتے ہیں۔''[1]

❁ محافظت: یعنی ہمیشہ پڑھنے کے ساتھ ساتھ ارکان اور شرائط کی پابندی کرنا اور مکروہات ومفسدات نماز سے بچنا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ ﴾

''نمازوں کی حفاظت کرو۔''[2]

اور فرمایا:

﴿ وَ الَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ۝ ﴾

''اور جو اپنی نمازوں کی حفاظت و پابندی کرتے ہیں۔''[3]

سورۂ معارج میں ﴿ دَآئِمُوْنَ ﴾ کے بعد ﴿ يُحَافِظُوْنَ ﴾ کا بیان اس بات کی دلیل ہے کہ محافظت، دوام سے الگ مستقل صفت ہے اور یہ دوام کو بھی محیط ہے، نیز یہ دوام اور محافظت دونوں حقیقت میں اقامت نماز کے ہم معنی ہیں۔

ارکان نماز قرآن کی روشنی میں

❁ قیام: اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ ۝ ﴾

''اور اللہ کے حضور عاجزی اور ادب سے کھڑے ہو جاؤ۔''[4]

❁ استقبال قبلہ: ارشاد ربانی ہے:

[1] المعارج 23,22:70. [2] البقرة 238:2. [3] المعارج 34:70. [4] البقرة 238:2.

﴿فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ﴾

''اپنا چہرہ مسجد حرام کی طرف پھیر لو اور تم جہاں کہیں بھی ہو تو اپنے چہروں کو اسی کی طرف پھیرو۔''[1]

بالاجماع یہ آیت دورانِ نماز قبلہ رو ہونے کے متعلق ہے۔

❀ قراءت: اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَرَتِّلِ الْقُرْآنَ تَرْتِيلًا ۝﴾

''اور خوب ٹھہر ٹھہر کر قرآن پڑھا کرو۔''[2]

نیز فرمایا:

﴿فَاقْرَءُوا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْآنِ﴾

''جتنا آسانی سے ہوسکے قرآن پڑھ لیا کرو۔''[3]

❀ رکوع وسجود: اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ارْكَعُوا وَاسْجُدُوا وَاعْبُدُوا رَبَّكُمْ﴾

''اے ایمان دارو! رکوع کرو، سجدہ کرو اور اپنے رب کی عبادت کرو۔''[4]

❀ قنوت: عاجزی، سکون اور ادب کے التزام کے بارے میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَقُومُوا لِلَّهِ قَانِتِينَ ۝﴾

''اللہ کے حضور عاجزی اور ادب سے کھڑے ہو جاؤ۔''[5]

❀ اخلاص: اخلاص ہر عبادت کی شرط اور رکن ہے، یعنی دل میں اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کی طرف خیال وقصد نہ ہو، چنانچہ فرمایا:

﴿قُلْ إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۝﴾

① البقرة 2:144. ② المزمل 73:4. ③ المزمل 73:20. ④ الحج 22:77. ⑤ البقرة 2:238.

''کہہ دیجیے: میری نماز، میری قربانی (عبادت) میرا جینا اور میرا مرنا اللہ ہی کے لیے ہے، جو تمام جہانوں کا رب ہے۔''[1]

❁ خشوع: دل کی توجہ اور اعضاء کا سکون و حرکت شریعت کے موافق ہو اور آدمی کو قراءت کا فہم ہو۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ۝﴾

''یقیناً مومن کامیاب ہوئے، جو اپنی نمازوں میں خشوع اختیار کرتے ہیں۔''[2]

یہاں تک نماز کے اوقات، شرائط اور ارکان قرآن کی روشنی میں بیان کیے گئے۔ ان شرائط و ارکان کو صحیح طور پر ادا کرنے کے لیے احادیث کی طرف عملی طور پر رجوع کرنا پڑے گا کیونکہ ان کی تفصیل احادیث ہی میں دستیاب ہے اور اسی کو نماز نبوی کہا جاتا ہے۔ صحیح طریقے سے وضو کرنے کے بعد نماز کی نیت کر کے قبلہ رخ کھڑے ہوں۔ زبان سے نیت کے الفاظ ادا کرنا شریعت سے ثابت نہیں، پھر کندھوں یا کانوں کی لو کے برابر ہاتھ اٹھائیں اور اَللّٰهُ أَكْبَرُ کہتے ہوئے دایاں ہاتھ بائیں ہاتھ پر رکھ کر دونوں ہاتھ سینے پر باندھ لیں، پھر اس کے بعد دعائے استفتاح اَللّٰهُمَّ بَاعِدْ بَيْنِي یا سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وغیرہ پڑھیں، پھر سورۂ فاتحہ اور اس کے ساتھ کوئی سورت یا چند آیات ملا کر پڑھ لیں۔ اس کے بعد اَللّٰهُ أَكْبَرُ کہہ کر رفع الیدین کرتے ہوئے رکوع میں جائیں۔ رکوع میں ہاتھ گھٹنوں پر رکھیں اور کمر اور گردن کو برابر رکھیں۔ رکوع میں کم از کم تین مرتبہ سُبْحَانَ رَبِّيَ الْعَظِيمِ پڑھیں، پھر سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهُ کہہ کر رکوع سے سر اٹھائیں اور رفع الیدین کریں۔ رکوع کے بعد کھڑے ہو کر اطمینان کے ساتھ رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ حَمْدًا كَثِيرًا...... دعا پڑھیں، پھر اَللّٰهُ أَكْبَرُ کہتے ہوئے سجدے میں جائیں۔ پہلے ہاتھ زمین پر

[1] الأنعام 162:6. [2] المؤمنون 2,1:23.

لگائیں اور اس کے بعد گھٹنے لگائیں۔ سات اعضاء (دو ہاتھ، دو پاؤں، دو گھٹنے اور ناک سمیت پیشانی) پر سجدہ کریں۔ سجدے میں کم از کم تین مرتبہ سُبْحَانَ رَبِّيَ الْأَعْلٰى پڑھیں، پھر اللّٰهُ أَكْبَرُ کہتے ہوئے سجدے سے سر اٹھائیں اور قعدے میں رَبِّ اغْفِرْلِي...... دعا پڑھیں۔ پھر اللّٰهُ أَكْبَرُ کہتے ہوئے دوسرا سجدہ کریں۔ دوسرا سجدہ مکمل کرنے کے بعد اللّٰهُ أَكْبَرُ کہتے ہوئے جلسۂ استراحت کے لیے بیٹھیں، پھر کھڑے ہوکر پہلی رکعت کی طرح دوسری رکعت پوری کریں۔ دوسری رکعت کے دوسرے سجدے کے بعد تشہد میں بیٹھیں، اس میں اَلتَّحِيَّات درود شریف اور مسنون دعائیں پڑھیں اور پھر دونوں طرف سلام پھیر دیں۔ نبی ﷺ نے اسی طریقے سے نماز پڑھی ہے، نیز آپ ﷺ نے فرمایا:

«صَلُّوا كَمَا رَأَيْتُمُونِي أُصَلِّي»

''نماز اسی طرح پڑھو جیسے تم مجھے پڑھتے ہوئے دیکھتے ہو۔''[1]

قرآن و حدیث کے مطابق تمام مسلمانوں کے لیے نماز کا عام طریقہ یہی ہے۔ قرآنِ کریم میں اجزائے ترکیبی بیان کیے گئے ہیں جبکہ ان اجزاء کی ترکیب و ترتیب احادیث میں بیان کی گئی ہے۔ اگر بعض کیفیات میں اتباع حدیث کی بنا پر اختلاف کیا جائے تو کوئی حرج نہیں اور مسلمانوں پر لازم ہے کہ ایسے اختلافات کی بنا پر آپس میں تشدد، تعصب اور کفر کے فتوے جاری کرنے سے احتراز کریں تاکہ دشمنان اسلام، خصوصاً غلام احمد پرویز کی قبیل کے لوگوں کو امت پر طعن زنی کا کوئی موقع نہ مل سکے۔

اب منکرین حدیث پرویزی گروہ کا اقامت نماز کے متعلق عقیدہ اور چند استفسارات پیش خدمت ہیں تاکہ معلوم ہوجائے کہ یہ لوگ قرآنی نماز کے قائل ہیں نہ ان کے پاس

[1] صحيح البخاري، الأذان، باب الأذان للمسافرين......، حديث:631.

نماز پڑھنے کا کوئی طریقہ ہے۔

① اقامت صلاۃ کے متعلق پرویز صاحب کا ایک نظریہ: وہ سلیم کے نام خط میں سورۂ اعراف کی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

﴿ وَالَّذِيْنَ يُمَسِّكُوْنَ بِالْكِتٰبِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ؕ اِنَّا لَا نُضِيْعُ اَجْرَ الْمُصْلِحِيْنَ ۝ ﴾

''جو لوگ کتاب کو مضبوطی سے پکڑتے ہیں اور انھوں نے نماز قائم کی، یقیناً ہم اصلاح کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتے۔''[1]

''متقی وہ ہے جو قانون خداوند کے ساتھ پورا پورا تمسک رکھتے ہوں، یعنی صلاۃ قائم کرتے ہوں۔ یہی وہ ہمواریاں پیدا کرنے والے مصلحین ہیں جن کے اعمال ضرور نتیجہ خیز ہوتے ہیں۔''[2]

یہاں انھوں نے تمسک قانون خداوندی کو اقامت صلاۃ کہا ہے۔ اگرچہ آیت میں ﴿ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ﴾ بطور عطف ﴿ يُمَسِّكُوْنَ ﴾ پر ہے اور عطف مغایرت چاہتا ہے لیکن پرویز صاحب نے شاید اس کو عطف تفسیر سمجھ لیا ہے۔ اُن سے پوچھا جاسکتا ہے کہ تمام روئے زمین پر جتنے مسلمان نماز پڑھتے ہیں وہ قانون خداوندی کے ساتھ تمسک اختیار کرتے ہیں یا نہیں؟ لیکن پرویز صاحب کے بقول تمام عالم میں قانون خداوندی یا قرآنی نظام نہیں تو کسی مسلمان کی کوئی نماز ہی نہیں۔

② اقامت صلاۃ کے متعلق جناب پرویز کا دوسرا نظریہ: اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ قَالُوْا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ ۝ ﴾

''وہ کہیں گے ہم نماز نہیں پڑھا کرتے تھے۔''[3]

① الأعراف 170:7. ② مکتوبات، ص: 200. ③ المدثر 43:74.

اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے سلیم کے نام خط میں لکھتے ہیں: وہ کہیں گے ہم ان کے ساتھ شامل نہ ہوئے جنھوں نے نظام صلاۃ کو قائم کیا تھا۔ نظام صلاۃ کیا ہے اس کے متعلق بہت کچھ لکھ چکا ہوں لیکن قرآن نے ان تمام تفاصیل کو سمیٹ کر ایک فقرے میں رکھ دیا ہے، یعنی:

﴿ وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِيْنَ ﴾

''ہم مساکین کے رزق کا انتظام نہیں کرتے تھے۔''[1]

یہ قرآن میں سراسر تحریف ہے، اس لیے کہ مساکین کو کھلانا الگ مستقل صفت ہے۔ لیکن انھوں نے تو مساکین کو کھلانے کے انتظام کو اقامت صلاۃ قرار دیا، پھر اللہ تعالیٰ کے فرمان: ﴿ وَكُنَّا نُكَذِّبُ بِيَوْمِ الدِّيْنِ ﴾ ''اور ہم حساب کے دن کو جھٹلاتے تھے۔''[2] کی تفسیر کرتے ہوئے کہتے ہیں: عملاً حالت یہ تھی کہ ہم اسے باور ہی نہیں کیا کرتے تھے کہ اس غلط معاشرت کا انجام جس میں مسکین کی روٹی کا انتظام نہیں ہوتا ہلاکت اور بربادی کے سوا کچھ نہیں ہمیں اس پر بالکل ایمان نہیں تھا۔[3]

یہاں ''یوم الدین'' کی تفسیر مسکین کی روٹی کا انتظام کرنے سے کی گئی ہے۔ ایسی عقل و دانش پر اظہار حیرت و تعجب کے سوا کیا کیا جا سکتا ہے؟

پرویز صاحب نے اقامت صلاۃ کے لیے قرآنی حکومت کو شرط قرار دیا ہے۔ اس کے بغیر وہ عام نمازوں کو رسمی نمازیں قرار دیتے ہیں۔ سلیم کے نام خط لکھتے ہیں: غور کرو سلیم اگر قیام صلاۃ سے مقصود یہ ہماری رسمی نمازیں ہی ہوں تو ان کے لیے تَمَكُّنْ فِي الْأَرْضِ یعنی ملک میں قرآنی حکومت قائم کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ یہ نمازیں تو ہم انگریز کی غلامی میں بھی پڑھا کرتے تھے اور آج بھی ہندوستان کے مسلمان اسی طرح پڑھ رہے

[1] المدثر 44:74. [2] المدثر 46:74. [3] مکتوبات، ص:274.

ہیں، پھر یہ بھی سوچو کہ قرآن نے اقامت صلاۃ کا فطری نتیجہ ''اِسْتِخْلَاف فِي الْأَرْضِ'' بتایا ہے۔ ہماری ان نمازوں میں کب ''اِسْتِخْلَاف فِي الْأَرْضِ'' ملا۔ سورۂ بقرہ میں دیکھو اقامت صلاۃ اورایتائے زکاۃ کا لازمی نتیجہ یہ بیان کیا گیا۔ ﴿ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۝ ﴾[1] ذرا غور کریں کہ ہماری نمازیں اوراڑھائی فی صد زکاۃ یہ نتیجہ پیدا کررہی ہے کہ ہمیں کسی قسم کا خوف وحزن نہ ہو۔[2]

جناب پرویز نے اس تحریر میں مسلمانوں کے دلوں میں کیسے وسوسے اور خدشات ڈال دیے ہیں۔ مسلمانوں کی عام نمازوں کو رسمی نمازوں سے تعبیر کر کے کہتے ہیں: قرآن نے اقامت صلاۃ کا فطری نتیجہ اِسْتِخْلَاف فِي الْأَرْض بتایا ہے۔

ہم پوچھتے ہیں کہ اس مضمون کی کوئی آیت قرآن کریم میں سے ہمیں بھی بتادو! اسی طرح پرویز صاحب کا یہ جملہ بھی دیکھو جو سورۂ بقرہ میں اقامت صلاۃ اورایتائے زکاۃ کا لازمی نتیجہ یہ بیان کیا گیا ہے: ﴿ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۝ ﴾ یہاں بھی ہم وہی سوال کرتے ہیں کہ سورۂ بقرہ میں سے ہمیں بھی کوئی ایسی آیت بتاؤ جو اس مضمون پر دلالت کرتی ہو۔ مثال مشہور ہے ''چہ دلاوراست دزدے کہ بکف چراغ دارد'' الحمدللہ قرآن کریم مسلمانوں کے سامنے موجود ہے اور پرویز صاحب نہایت دیدہ دلیری سے تحریف قرآن کی ناکام کوشش کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھنے میں لگے ہوئے ہیں۔

صلاۃ کے متعلق سلیم کے نام خط میں لکھتے ہیں: الصلوۃ صراط مستقیم پر چلنے کا نام ہے، پھر لکھتے ہیں: ''سجدہ سے مراد ہی قانون خداوندی کی اطاعت ہے'' اس کے بعد لکھتے ہیں: ''رکوع کا معنی قانون خداوندی کی عملی تصدیق اوراس کے سامنے جھک جانا ہے۔''[3]

آپ نے دیکھا کہ لوگوں کو گمراہ کرنے کے لیے کیسے کیسے کرتب دکھاتے ہیں؟ اس

[1] البقرۃ 2:288. [2] مکتوبات، ص: 211. [3] مکتوبات، ص: 210,209.

ساری کاوش کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کے ذہنوں سے صلاۃ رسول کا نقشہ نکال دیا جائے۔ آخر میں ہم پرویزی جماعت سے درج ذیل سوالات پوچھتے ہیں اور لازم ہے کہ ان کے جوابات صرف قرآنی آیات ہی سے دیے جائیں۔

1. قرآن کریم میں بار بار ﴿ وَأَقِيمُوا الصَّلَوٰةَ ﴾ کا حکم ہے، بتائیں الصلاۃ کیا ہے؟
2. اسے کس طرح قائم کریں؟
3. یہ نماز دن اور رات میں کتنی بار قائم کریں؟
4. اس کے اوقات کیا ہیں؟
5. اوقات نماز کی ابتدا اور انتہا کی حد بندی کیسے ہوگی؟
6. ہر نماز کی کتنی رکعتیں ہیں؟
7. اور ہر رکعت میں کیا پڑھنا چاہیے؟

کیا ان سوالات کے جوابات قرآن کریم سے دیے جاسکتے ہیں؟ یقیناً نہیں دیے جاسکتے اور احادیث کو آپ مانتے نہیں، لہٰذا نماز سے چھٹی ہوگئی اور یہی آپ کا مقصد ہے۔

② ادائے زکاۃ

ارکان اسلام میں سے صلاۃ کے بعد ادائے زکاۃ کا مسئلہ بہت اہم ہے۔ اس کی اہمیت کی دلیل یہ ہے کہ قرآن کریم میں مختلف تعبیرات کی کثرت کے ساتھ اس کا تذکرہ موجود ہے۔ زکاۃ، صدقہ، تصدق اور انفاق کے مختلف صیغوں کے ساتھ اس کا استعمال ہوا ہے۔ پہلی تعبیر (زکاۃ) فرض کے ساتھ خاص ہے اور باقی تعبیرات فرض اور نفل دونوں کے لیے مستعمل ہیں۔ زکاۃ عربی زبان میں طہارت و پاکیزگی کے معنی میں آتا ہے۔ قرآن کریم میں یہ لفظ تطہیر معنوی اور روحانی تطہیر کے لیے بھی استعمال کیا گیا ہے۔ ارشاد

باری تعالیٰ ہے:

﴿ خَيْرًا مِّنْهُ زَكٰوةً وَّاَقْرَبَ رُحْمًا ۝ ﴾

"پاکیزگی میں اس سے بہتر اور شفقت میں اس سے قریب تر ہو۔"[1]

نیز فرمایا:

﴿ وَحَنَانًا مِّنْ لَّدُنَّا وَزَكٰوةً ﴾

"اور اپنے ہاں سے رحم دلی اور پاکیزگی عطا کی۔"[2]

یہ مادہ مختلف صیغوں سے اس معنی میں مستعمل ہے اور زکاۃ کا شرعی معنی اللہ تعالیٰ اور رسول ﷺ کے حکم کے مطابق مال کا مقرر حصہ ادا کرنا ہے۔ قرآن کریم میں اس کا 30 مرتبہ ذکر ہوا ہے اور مندرجہ ذیل مختلف طریقوں سے اس کی اہمیت بیان کی گئی ہے:

1. فرضیت کے لیے صیغہ امر کے ساتھ 9 مرتبہ۔
2. زکاۃ مؤمنین کی صفات میں سے ہے۔(البقرۃ 177:2و277، النسآء 162:4، المآئدۃ 55:5 التوبۃ 71:9، المؤمنون 60:23، النور 37:24)
3. زکاۃ سابقہ امتوں پر بھی فرض تھی۔ سارے انبیاء علیہم السلام میں سے ہر ایک کی ملت میں (الأنبیاء 73:21)، ملت اسماعیل علیہ السلام میں (مریم 55:19)، ملت بنی اسرائیل میں (البقرۃ 43:2 و 83)، (البیّنۃ 5:98) اور ملت عیسیٰ علیہ السلام میں (مریم 31:19) فرض تھی۔
4. زکاۃ ادا کرنے کے فوائد اور منافع: یہ نیک اعمال میں سے ہے: (البقرۃ 177:2) یہ اسبابِ اجر میں سے ہے: (البقرۃ 277:2) سیئات اور گناہوں کا کفارہ اور جنت میں داخلے کا سبب ہے: (المآئدۃ 12:5)، اللہ تعالیٰ کی خصوصی رحمت کے حصول کا ذریعہ ہے: (الأعراف 156:7)

[1] الکھف 81:18. [2] مریم 13:19.

5. جان و مال کی حفاظت کا باعث ہے۔ (التوبة 5:9)

6. مال کی زیادتی اور فراوانی کا باعث ہے۔ (الروم 39:30)

7. محسنین کی صفات میں سے ہے۔ (لقمان 4:31)

8. زکاۃ ادا نہ کرنا مشرکین کی صفات میں سے ہے۔ (حٰمٓ السجدة 7:41)

تصدق اور انفاق کے مختلف صیغوں سے بھی مستعمل ہے۔ قرآن کریم نے زکاۃ کے آٹھ مصارف بھی لفظ صدقات کے ساتھ بیان کیے ہیں، جیسا کہ سورۂ توبہ 60:9 میں مذکور ہیں۔

شریعت میں مال کا ایک خاص حصہ ادا کرنے کا نام فرض زکاۃ ہے۔ اس کے لیے دلیل یہ ہے کہ قرآن کریم کی اکثر آیات میں مومنوں کی صفت انفاق کے حوالے سے بیان کی گئی ہے، جیسا کہ ارشاد فرمایا گیا:

﴿ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝ ﴾

"اور ہم نے جو رزق انھیں عطا کیا ہے وہ اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔"[1]

عربیت کے لحاظ سے یہاں ﴿مِمَّا﴾ تبعیض کے لیے ہے، یعنی بعض اور کچھ حصے کو بیان کرتا ہے۔ اس طرح قرآن مجید میں احکام میراث بیان کرنا اور مال کے متعلق وصیت کا ذکر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ مسلمان زکاۃ ادا کرنے کے بعد اپنے پاس مال رکھ سکتے ہیں۔ یہاں تک کہ ایک مسلمان اس کے کچھ حصے کے بارے میں کسی کے حق میں وصیت بھی کر سکتا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ شریعت میں یہ طریقہ نہیں کہ انسان اپنی ضروریات سے زائد سارا مال اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کر دے۔ اس قسم کا نظریہ غلط ہے۔ ہاں! مستحب جان کر

[1] البقرة 3:2.

بعض افراد ایسا کر سکتے ہیں جو ان کے لیے کمال کا درجہ رکھتا ہے۔ اسی طرح قرآن کریم میں تجارت، صنعت اور ملازمت کے ذریعے سے کمائے ہوئے مال اور زمین کی آمدنی میں انفاق کے فریضے کا ذکر کیا گیا ہے، چنانچہ ارشاد ہوا:

﴿ يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَنفِقُوا مِن طَيِّبَاتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّا أَخْرَجْنَا لَكُم مِّنَ الْأَرْضِ ﴾

''اے ایمان والو! اپنی حلال کمائی میں سے اور ان حلال اشیاء میں سے جو ہم نے تمھارے لیے زمین سے پیدا کی ہیں ہماری راہ میں خرچ کرو۔''[1]

یہاں تک زکاۃ کے متعلق قرآنی احکام کی تفصیلات بیان ہوئیں۔ ان احکامات پر پوری طرح عمل کرنے کے لیے احادیث کی طرف رجوع کرنا لازم ہے۔ احادیث سے ثابت شدہ تفصیلات کچھ یوں ہیں۔

1 سونا چاندی اور اس کی مصنوعات پر شرح زکاۃ چالیسواں حصہ ہے۔ جس کو عربی میں ربع العشر کہا جاتا ہے، یعنی اڑھائی فی صد۔

2 سونے کا نصاب تقریباً ساڑھے سات تولے جبکہ چاندی کا نصاب ساڑھے باون تولے۔

3 چاندی کے نصاب کے حساب سے نقد روپوں پر شرح زکاۃ اڑھائی فی صد ہے۔

4 اونٹوں کا نصاب یہ ہے: پانچ اونٹوں پر ایک بکری، دس پر دو بکریاں، پندرہ اونٹوں پر تین بکریاں، بیس پر چار بکریاں اور پچیس اونٹوں پر اونٹ کا ایک سالہ بچہ۔ مزید تفصیل کتب احادیث میں دیکھی جا سکتی ہے۔

5 بھیڑ بکریوں میں چالیس پر ایک بھیڑ یا بکری۔

6 گائے بیل کی صورت میں تیس پر ایک گائے کا بچہ۔ مزید تفصیل کے لیے کتب حدیث

[1] البقرة 2:267.

ملاحظہ فرمائیں۔

7 مال تجارت روپوں کے حساب سے اڑھائی فی صد، چالیسواں حصہ۔

اس تفصیل کے بغیر قرآن کریم میں مذکور حکم زکاۃ پر عمل نہیں ہوسکتا۔ اب منکرین حدیث پرویزیوں کا نظریۂ زکاۃ ملاحظہ فرمائیں:

1 سلیم کے نام خط میں لکھا ہے: قرآن نے زکاۃ کا حکم دے کر اس کی شرح و قیود کو غیر متعین چھوڑ دیا ہے تاکہ ہر دور کی اسلامی حکومت اپنی اپنی ضروریات کے مطابق اسے خود متعین کرتی رہے۔ قرون اولیٰ میں اگر خلافت راشدہ نے اپنے زمانے کی ضرورت کے مطابق اڑھائی فی صد مناسب سمجھا تھا اس وقت یہی شرح شرعی تھی۔ اگر آج کوئی اسلامی حکومت کہے کہ اس کی ضروریات کا تقاضا بیس فی صد ہے تو یہی بیس فی صد شرعی شرح قرار پائے گی۔[1]

پرویز صاحب کے اس نرالے اجتہاد میں پہلی کذب بیانی یہ ہے کہ خلافت راشدہ نے نصاب اڑھائی فی صد مقرر کیا تھا۔ یہ بات جھوٹ کا پلندہ ہے۔ خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم نے ہرگز ایسے نہیں کیا تھا بلکہ یہ تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث مرفوعہ میں مذکور ہے، لہٰذا یہ نصاب خلفاء نے اپنی طرف سے قطعاً مقرر نہیں کیا تھا۔

ہم پرویز صاحب سے یہ بھی پوچھتے ہیں کہ شرح مقرر کرنا اسلامی حکومت کے اختیار میں ہے، یہ قرآن کریم کی کون سی آیت میں ہے؟

ہم یہ بھی سوال کرتے ہیں کہ آپ کہتے ہیں کہ ہم وہ احادیث مانتے ہیں جو قرآن کے خلاف نہ ہوں۔ زکاۃ کی شرح میں وارد احادیث قرآن کریم کی کون سی آیت سے متصادم ہیں؟

1 مکتوبات، ص: 83,82.

آج تک مسلمانوں کا زکاۃ اور اس کی شرح کے متعلق (جو احادیث صحیحہ میں مذکور ہے) اجماع ثابت ہے۔ لیکن پرویز صاحب نے خود ساختہ شرح مقرر کرنے کی جسارت کر کے مسلمانوں کے درمیان تفرق اور الحاد پھیلانے کی مذموم وملعون حرکت کی ہے۔

2 ایک جگہ لکھتے ہیں: زکاۃ کے لیے قرآن میں حکومت کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ مسلمانوں سے زکاۃ وصول کرے:

﴿خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً﴾

''ان کے مالوں سے صدقہ قبول کر۔''[1]

اس لیے زکاۃ اس ٹیکس کے سوا اور کچھ نہیں جو اسلامی حکومت مسلمانوں پر عائد کرے۔ اس ٹیکس کی کوئی شرح متعین نہیں کی گئی، اس لیے کہ شرح زکاۃ کا انحصار ضروریات ملی پر ہے حتی کہ وہ ہنگامی صورتوں میں سب کچھ وصول کر سکتی ہے جو کسی کی ضرورت سے زائد ہو۔

﴿وَيَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۥ قُلِ الْعَفْوَ﴾

''وہ آپ سے پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں؟ کہہ دیجیے: جو ضروریات سے زائد ہو۔''[2]

''لہٰذا جب کسی جگہ اسلامی حکومت نہ ہو تو زکاۃ بھی باقی نہیں رہتی۔''[3]

دیکھیے پرویز صاحب نے اس عبارت میں زکاۃ کے لیے اسلامی حکومت کی شرط عائد کر دی۔ یہ شرط کس آیت میں مذکور ہے؟ زکاۃ اور اس کے معلوم شدہ متعین حق ہونے کا تذکرہ مکی سورتوں میں ہے، مثلاً: سورۂ معارج، ذاریات، مومنون اور حٰم سجدہ۔ اب سوال یہ ہے کہ مکے میں تو اسلامی حکومت نہیں تھی تو پھر زکاۃ فرض کرنے کا کیا فائدہ تھا؟

مزید برآں پرویز صاحب نے زکاۃ کو ٹیکس کہا ہے۔ یہ ایک اسلامی فریضے کا مذاق

[1] التوبة 103:9. [2] البقرة 219:2. [3] قرآنی فیصلے، ص:35.

اڑانے اور اسے غیر اسلامی عمل کے ساتھ تشبیہ دینے کے مترادف ہے، حالانکہ شریعت میں زکاۃ مسلمانوں سے وصول کی جاتی ہے، جبکہ ٹیکس تو وہ جزیہ اور خراج ہے جو غیر مسلموں سے وصول کیا جاتا ہے۔

پرویز صاحب نے حکومت کو شرح کی تبدیلی کا بھی حق دیا ہے، حالانکہ یہ اس آیت کریمہ کی صریح خلاف ورزی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَالَّذِيْنَ فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ ○ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ○ ﴾

''اور ان کے اموال میں معین حصہ مقرر ہے سوال کرنے والوں اور محتاجوں کے لیے۔''[1]

لفظ ﴿ مَّعْلُوْمٌ ﴾ دلیل ہے کہ مقادیر زکاۃ کا علم اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ کو دیا اور وہ علم احادیث میں موجود ہے۔ جب زکاۃ کا حق معین ہے تو پھر حکومت کو اس کی تبدیلی کا حق کس نے دیا اور کیسے ملا؟

مزید برآں ﴿ قُلِ الْعَفْوَ ﴾، ''کہہ دیجیے: جو زائد ہے''[2] سے استدلال کرتے ہوئے پرویز صاحب کہتے ہیں کہ ہنگامی حالت میں اسلامی حکومت سب کچھ حاصل کرسکتی ہے۔ یہ استدلال سراسر غلط ہے۔ سب سے پہلے یہ سوال ذہن میں ابھرتا ہے کہ یہاں آیت میں ہنگامی صورت کا ذکر کس لفظ سے معلوم ہوتا ہے؟ دوم یہ کہ ﴿ الْعَفْوَ ﴾ سے مراد ﴿ مِنَ الْعَفْوَ ﴾ ہے، یعنی اس مال سے جو زائد ہو کچھ خرچ کیا کرو اور اس کے لیے قرینہ وہی آیات ہیں جن میں ﴿ مِنْ ﴾ تبعیض کے لیے آیا ہے، مثلاً: ﴿ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ ﴾[3] ﴿ خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ ﴾[4]

یہ تھا فریضۂ زکاۃ کے متعلق پرویزی نظریہ جبکہ اس کے برعکس قرآن وسنت کے مطابق نظام پر نظر ڈالنے سے صریحًا معلوم ہوجاتا ہے کہ قرآن وسنت کا جو اسلام ہے، پرویز

[1] المعارج 70:24,25. [2] البقرة 2:219. [3] البقرة 2:3. [4] التوبة 9:103.

صاحب کا اسلام اس سے یکسر مختلف ہے۔

③ حج

اسلام میں اعمال کے لحاظ سے ایک عظیم فریضہ اور ارکان اسلام میں سے ایک اہم رکن کی حیثیت سے حج کی حیثیت مسلمہ ہے۔ قرآن کریم میں دو مرتبہ اس کا ذکر آیا ہے۔ اور اس کی فرضیت کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا ۭ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ۝ ﴾

''اور اللہ کے لیے اس گھر (بیت اللہ) کا حج کرنا لوگوں پر فرض ہے، جو اس کی طرف راہ چلنے کی طاقت رکھے اور جو کوئی (اس حکم کی پیروی سے) انکار کرے اسے معلوم ہو جانا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ تمام دنیا والوں سے بے نیاز ہے۔''①

حج کی ادائیگی کا طریقہ قرآن کریم کی دو سورتوں (البقرۃ اور الحج) میں تفصیل کے ساتھ مذکور ہے۔

1. حج کا اعتبار چاند کے حساب سے ہے۔ (البقرۃ 2:189)
2. حج اور عمرے کا پورا کرنا صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہے۔ (البقرۃ 2:196)
3. اسی آیت میں حج تمتع، ہدی (قربانی) کا وجوب اور حالت احصار (حج و عمرے سے کسی کو روک دیا جائے تو کس حد تک اسے حج و عمرے کی تکمیل کرنی چاہیے اس کے احکام) کا ذکر بھی ہے۔
4. احرام حج کے لیے ''أشھر معلومات'' (معین مہینے، یعنی شوال، ذوالقعدہ، ذوالحجہ) کا وقت مقرر ہے اور اس میں تین منہیات ہیں۔ (البقرۃ 2:197)
5. وقوف عرفات اور وقوف مزدلفہ۔ (البقرۃ 2:198,199)

① آل عمرٰن 3:97.

6 وقوف منیٰ اور ذکرِ الٰہی (جمرۂ عقبہ کی رمی کے ساتھ تکبیر)۔ (البقرۃ 2:200)

7 وقوف منیٰ تین دن (گیارھویں، بارھویں اور تیرھویں تاریخ کو) جمرات کی رمی (کنکریاں مارنے) کے ساتھ ذکر الٰہی۔ (البقرۃ 2:203)

8 ذبح یوم النحر اور ایام تشریق مع ذکر الٰہی۔ (الحج 22:28)

9 طواف زیارۃ۔ (الحج 22:29)

10 صفا و مروہ کے درمیان سعی۔ (البقرۃ 2:158)

11 طوافِ وداع۔ (الحج 22:33)

12 اونٹ کے ذبح کے متعلق احکام، قربانی کے گوشت کے مصارف، ذبح و نحر کے وقت بسم اللہ اور تکبیر۔ (الحج 22:36,37)

حج کے متعلق یہ قرآنی احکام کی تفصیل ہے۔ اس میں تشریح طلب امور صحیح احادیث میں مذکور ہیں، مثلاً:

1. استطاعت سبیل (حج کے راستے) کی شرح کیا ہے؟
2. احصار کس چیز سے ہوتا ہے؟
3. احرامِ حج کے مہینوں کے نام کیا ہیں؟
4. وقوف عرفات، وقوف مزدلفہ اور وقوف منیٰ کا دن اور وقت کون سا ہے؟
5. جمرات کتنے ہیں اور کتنی کنکریاں ماری جائیں؟
6. رمیِ جمرات کے وقت کون سا ذکر کرنا چاہیے؟
7. ذبح کا کیا مقصد ہے؟
8. رمی جمرات کا کیا مقصد ہے؟
9. ہدی اور قربانی کو ذبح کرنے کے بعد سخت بھوکے فقیر، صبر کرنے والوں اور سوال کرنے

والوں کو کھلانا۔

⑩ جنایات کے احکام۔

یہ تمام تفاصیل احادیث میں موجود ہیں۔

لیکن اس کے برعکس پرویز صاحب کے نزدیک حج کیا ہے؟ بظاہر انھوں نے اسے تسلیم کیا ہے لیکن حقیقت میں وہ حج کو ایک سیاسی معاملہ سمجھتے ہیں بلکہ اسے امراء کی ایک کانفرنس کی صورت میں پیش کرتے ہیں۔[1] ان کی بعض تحریریں ملاحظہ فرمائیں:

فرماتے ہیں: ''جس کا مقصود تمام نوع انسانی کو ایک برادری تصور کر کے جمعیت اقوام کے بجائے جمعیت آدم کی عملی تشکیل کرنا ہے اگرچہ اسلام کے تمام احکام اور فرائض اسی نقطہ کی طرف قدم اٹھاتے ہیں لیکن اس کی تکمیل حج کے اجتماع میں ہوتی ہے جو اسلام کا آخری رکن ہے۔''

آگے فرماتے ہیں: ''اپنے اپنے ملکوں سے اپنے نمائندے چن لیں۔ یہ نمائندے اپنے میں سے ایک منتخب کردہ امیر کی زیر قیادت مرکز وحدت انسانیت، یعنی کعبۃ اللہ کی طرف روانہ ہوں۔ عرفات کے میدان میں ان تمام نمائندگان کا باہمی تعارف ہو، پھر یہ تمام امرائے ملت اپنے میں سے ایک امیر الامراء کا انتخاب کر لیں اور مختلف ممالک کے احوال وظروف کو سامنے رکھ کر باہمی مشاورت سے ایک ایسا پروگرام مرتب کر لیں۔''

آگے لکھا ہے: ''مقامِ منیٰ میں جمع ہو کر اس اصولی پروگرام کی تفصیلات و جزئیات پر غور کریں اور یہ سوچیں کہ ایک دوسرے ملک پر اس کا عملی اثر اور ردعمل کیا ہوگا۔ وہاں باہمی مذاکرات بھی ہوں، دعوتیں اور ضیافتیں بھی ہوں جس کے لیے قربانی تجویز کی گئی ہے۔''

آگے لکھا ہے: ''قرآن کریم نے حج کے اس مقصد اور عنایت کو دو مقامات پر دو دو

① قرآنی فیصلے، ص: 65-71.

الفاظ میں بیان کیا ہے۔ ایک جگہ ارشاد ہے کہ حج کے اجتماع سے مقصود یہ ہے: ﴿ لِيَشْهَدُوا مَنَافِعَ لَهُمْ ﴾ تاکہ وہ اپنے فوائد کے لیے آموجود ہوں۔" دوسری جگہ فرمایا: ﴿ قِيٰمًا لِّلنَّاسِ ﴾[1] "یعنی اس سے دنیا میں انسانیت قائم رہے۔"[2]

ان تمام عبارتوں پر غور کریں اور قرآنی آیات بھی سامنے رکھ کر سوچیں کہ آخران آیات اور پرویزی خرافات کے درمیان کیا مناسبت ہے اور یہ مفہوم کہاں سے اخذ کیا گیا ہے؟ اور پھر اسے قرآنی فیصلے کا نام دینا بہت بڑی تلبیس اور دھوکا نہیں تو اور کیا ہے؟ یہ طریقہ پرویز صاحب کا اپنا تجویز کردہ ہے، تاہم حج کے متعلق قرآنی آیات کا یہ مقصد ہرگز نہیں۔

حج کے لیے نمائندگان کا انتخاب کس نے کیا؟ وہاں تو سب لوگ اپنی مالی استطاعت کی وجہ سے حج میں شامل ہوتے ہیں۔ کیا تمام حاجی امرائے ملت ہوسکتے ہیں؟ کیا وہاں کا خطیب انھی حجاج کے انتخاب سے امیر الامراء بن جاتا ہے؟ کیا وہاں حجاج صاحبان آپس میں اپنے ممالک کے متعلق مشورے کرتے ہیں؟ وہ تو اذکار مسنونہ اور ادعیۂ ماثورہ وغیرہ میں مشغول رہتے ہیں۔ مقام منیٰ میں جمع ہوکر لوگ کون سی تفصیلات و جزئیات پر غور کرتے ہیں وہاں تو وہ جمرات کو کنکریاں مارنے، جانوروں کو ذبح اور نحر کرنے، بالوں کو کترانے یا منڈوانے اور اذکار کرنے میں مشغول رہتے ہیں۔

کیا منیٰ میں قربانی کا مقصد باہمی دعوتیں اور ضیافتیں ہے۔ قرآنی آیات میں ﴿ الْبَآئِسَ الْفَقِيْرَ ﴾ "بھوکے فقیر کو" اور ﴿ الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ ﴾ "قناعت صفت غرباء اور مانگنے والے فقراء" کا ذکر کیا گیا ہے۔ پرویز صاحب کی یہ ساری باتیں احکام حج سے اخذ کردہ نہیں بلکہ ان کے اپنے ذہن کی اختراع ہیں۔ اسی لیے انھوں نے حج میں عبادت کا پہلو

[1] المآئدة 5:97 . [2] قرآنی فیصلے، ص:67-71.

بیان نہیں کیا اور مقاصد حج میں درج ذیل مقاصد پیش نظر نہیں رکھے، جو مندرجہ ذیل فرامینِ الٰہی سے واضح ہوتے ہیں۔ فرمایا:

﴿ وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللهِ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ ﴾

''اورتا کہ معین دنوں میں ان چوپائے مویشیوں (کو ذبح کرتے وقت ان) پر اللہ کا نام پڑھیں۔''[1]

نیز فرمایا:

﴿ وَاَطْعِمُوا الْبَآئِسَ الْفَقِيْرَ ﴾

''اور تم بھوکے فقیر کو (قربانی کا گوشت) کھلاؤ۔''[2]

اور فرمایا:

﴿ فَاذْكُرُوا اسْمَ اللهِ عَلَيْهَا ﴾

''لہٰذا اونٹوں (کو ذبح کرتے وقت ان) پر اللہ کا نام لو۔''[3]

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَاَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ ﴾

''اور قناعت کرنے والے اور (محتاج) سوالی کو بھی (ان کا گوشت) کھلاؤ۔''[4]

نیز فرمان الٰہی ہے:

﴿ وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ ﴾

''بلکہ اللہ تعالیٰ تک تمھارا تقویٰ پہنچتا ہے۔''[5]

اور ارشاد الٰہی ہے:

﴿ لِتُكَبِّرُوا اللهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ ﴾

[1] الحج 22:28. [2] الحج 22:28. [3] الحج 22:36. [4] الحج 22:36. [5] الحج 22:37.

”تاکہ تم اللہ کی بڑائی بیان کرو کہ اس نے تمھیں ہدایت دی۔“[1]

پرویز صاحب نے ان عظیم مقاصد کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔ بالخصوص قابل ذکر بات یہ ہے کہ سائل کے سوال میں یہ جملہ موجود ہے کہ ”وہ (حج) کس طرح پورا ہوتا ہے۔اس سوال کا جواب ان کی تحریر میں موجود ہی نہیں۔ حج کے ارکان اور وہ اعمال جو قرآن اور احادیث میں مذکور ہیں وہی فریضۂ حج کا اصل مقصد ہیں۔“ لیکن پرویز صاحب نے ان اعمال کا تذکرہ نہیں کیا۔[2]

پرویز صاحب نے حج کا جو مقصد بیان کیا ہے وہ تو کسی زمانے میں بھی پورا نہیں ہوا اور نہ ہوسکتا ہے۔ ثابت ہوا کہ ان کے نزدیک لوگ صرف رسمی حج ادا کرتے ہیں جن میں سے کسی کا بھی حج قبول نہیں بلکہ ان کے نزدیک مقاصد حج سے صراحتًا معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بندے دین اسلام کے اس انتہائی اہم رکن سے بالکل چھٹی کرلیں۔

④ قربانی

دس ذوالحجہ کو حسب استطاعت کوئی حلال جانور (اونٹ، گائے، بھیڑ، بکری) ذبح کرنا اور ذبح کے وقت ”بِسْمِ اللّٰهِ، اَللّٰهُ أَكْبَر“ پڑھنا اور یہ سارا عمل اخلاص کے ساتھ کرنا۔ یہ عمل، خواہ منٰی میں ہو یا دیگر ممالک میں یہ ایک مالی عباوت ہے جو مال کی استطاعت کے ساتھ مشروط ہے۔ اس سے قطع نظر کہ یہ فرض ہے یا سنت مؤکدہ، یہ بات قطعی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی مدنی زندگی میں کسی سال بھی اس عباوت کو مہمل جان کر نہیں چھوڑا۔ قرآن کریم میں اس کے لیے ﴿وَانْحَرْ﴾ ”قربانی کرو۔“[3] کا لفظ مذکور ہے۔

① الحج 37:22. ② قرآنی فیصلے، ص:65. ③ الکوثر 2:108.

جبکہ دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

﴿وَلِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنسَكًا لِّيَذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ عَلَىٰ مَا رَزَقَهُم مِّن بَهِيمَةِ الْأَنْعَامِ﴾

''اور ہم نے ہر امت کے لیے ایک قربانی مقرر کی ہے تاکہ وہ ان پالتو چوپاؤں پر اللہ کا نام ذکر کریں جو اس نے انھیں دیے ہیں۔''[1]

احادیث میں اس عبادت کے لیے مشروط اوقات اور ذبح کرنے کا شرعی طریقہ بیان کیا گیا ہے۔ لیکن پرویز صاحب نے اس قربانی کے متعلق اپنے فریب کارانہ ذہن کی وجہ سے تمام اہل اسلام کے خلاف فیصلہ دیا ہے۔ وہ ایک سوال کے جواب میں لکھتے ہیں: ''یہ بالکل درست ہے کہ حضرت خلیل اکبر اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کے تذکار جلیلہ کے ضمن میں قرآن نے کہیں نہیں کہا کہ اس واقعۂ عظیم کی یاد میں جانوروں کو ذبح کیا کرو حتی کہ اسماعیل علیہ السلام کی جگہ مینڈھا ذبح کرنے کا واقعہ بھی قرآن میں نہیں تورات میں ہے۔''[2]

یہ سراسر جھوٹ ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کی اس قربانی کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا:

﴿وَفَدَيْنَاهُ بِذِبْحٍ عَظِيمٍ ۝﴾

''اور ہم نے ایک بڑی قربانی کے عوض اسے (اسماعیل کو) بچالیا۔''[3]

لفظ فِدَاء کا معنی ہے کہ کسی کی جانب سے کچھ دے کر اسے مصیبت سے بچا لینا اور یہاں ''ذِبْحٍ'' بمعنی مذبوح (ذبح کیا گیا) ہے۔ یہ بالکل صریح ہے کہ اسماعیل علیہ السلام کے بدلے میں ایک عظیم شان والا مذبوح دیا گیا۔ اگر اس مذبوح کے نام کا ذکر قرآن میں نہ ہو اور تورات میں ہو تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟

[1] الحج 34:22. [2] قرآنی فیصلے، ص: 54. [3] الصّٰفّٰت 107:37.

پرویز صاحب نے ذبح عظیم کا مفہوم تولیتِ بیت اللہ بیان کیا ہے۔[1] کیا کوئی عقل مند شخص یہ ماننے کے لیے تیار ہوگا کہ ذبح کا معنی تولیت ہے۔ یہ کس لغت اور کس محاورے میں ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ یہ صاحب تو تحریف میں یہود سے بھی آگے نکل گئے ہیں۔

مزید لکھتے ہیں: مقام حج کے علاوہ کسی دوسری جگہ (اپنے اپنے شہروں میں) قربانی کے لیے کوئی حکم نہیں۔ تاریخ سے پتا چلتا ہے کہ نبی ﷺ نے مدینہ میں قربانی نہیں کی۔[2] پھر مزید یہ بھی لکھا ہے: اس لیے یہ ساری دنیا میں اپنے اپنے طور پر قربانی کرنا ایک رسم ہے۔[3]

اس تحریر میں اعلانیہ اسلام دشمنی کا ثبوت دیا گیا ہے۔ ہم پوچھتے ہیں کہ وہ تاریخ کی کون سی کتاب ہے جس میں لکھا ہو کہ نبی ﷺ نے مدینہ میں کوئی قربانی نہیں کی۔ تمام کتب حدیث اور خصوصاً کتب ستہ میں تو صاف مذکور ہے کہ نبی ﷺ اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم مدینہ میں قربانی کیا کرتے تھے، البتہ پرویز صاحب نے یہاں بھی تلبیس سے کام لیا ہے۔ وہ اس طرح کہ حج کے موقع پر جو قربانی کی جاتی ہے، قرآن و حدیث میں اسے ''ہدی'' کہتے ہیں اور وہ حج کے علاوہ کسی دوسری جگہ ثابت نہیں۔ دیگر شہروں میں جو قربانی کی جاتی ہے اسے ''أُضْحِيَة'' اور ''أَضَاحِي'' کہتے ہیں اور وہ بے شمار احادیث سے ثابت ہے، نیز قرآن کریم میں ﴿ وَانْحَرْ ﴾ ''اور قربانی کیجیے۔''[4] کے لفظ سے ثابت ہے۔

پرویز صاحب مزید لکھتے ہیں: ''سارے قرآن میں ایک جگہ بھی نہیں کہ مکہ کے علاوہ کسی اور جگہ قربانی کی جائے گی۔ قربانی کا لفظ بھی قرآن میں نہیں۔''[5] یہ تو بالکل جہالت ہے، لگتا ہے پرویز صاحب نے قرآن دیکھا ہی نہیں۔

قرآن کریم میں ہے:

[1] قرآنی فیصلے، ص: 97. [2] قرآنی فیصلے، ص: 56. [3] قرآنی فیصلے، ص: 56. [4] الکوثر 2:108. [5] قرآنی فیصلے، ص: 63.

﴿ اِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا فَتُقُبِّلَ مِنْ اَحَدِهِمَا وَلَمْ يُتَقَبَّلْ مِنَ الْاٰخَرِ ﴾

’’جب ان دونوں (آدم علیہ السلام کے بیٹوں) نے قربانی پیش کی تو ان میں سے ایک کی قربانی تو قبول ہوگئی مگر دوسرے کی قبول نہ ہوئی۔‘‘[1]

اس آیت سے مندرجہ ذیل باتیں معلوم ہوئیں:

1. قربانی کا لفظ ﴿ قُرْبَانًا ﴾ قرآن کریم میں ہے اور قربانی کا لفظ اس کا عجمی معنی ہے۔
2. قربانی کا عمل آدم علیہ السلام کے زمانے سے شروع ہوا۔
3. صرف مکہ میں قربانی کی تخصیص کا کوئی ثبوت نہیں۔
4. اس آیت کی تفسیر سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں قربانی کی قبولیت کا طریقہ یہ تھا کہ آسمان سے آگ آتی اور اس قربانی کو جلا دیتی۔ یہ بظاہر مال کا ضیاع اور بربادی تھی لیکن اللہ تعالیٰ کی جانب سے قبولیت کا ایک اشارہ تھا۔

دوسری آیت میں فرمایا:

﴿ اَلَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ عَهِدَ اِلَيْنَآ اَلَّا نُؤْمِنَ لِرَسُوْلٍ حَتّٰى يَاْتِيَنَا بِقُرْبَانٍ تَاْكُلُهُ النَّارُ ۭ قُلْ قَدْ جَاۗءَكُمْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِيْ بِالْبَيِّنٰتِ وَبِالَّذِيْ قُلْتُمْ ﴾

’’جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ بے شک اللہ نے ہم سے عہد لے رکھا ہے کہ ہم کسی رسول پر ایمان نہ لائیں حتی کہ ہمارے پاس ایسی قربانی لے آئے جسے آگ کھا جائے، ان سے کہہ دیجیے: مجھ سے پہلے کئی رسول کھلی نشانیاں اور وہ چیز لے کر تمھارے پاس آئے جو تم نے (مجھے) کہی۔‘‘[2]

اس آیت میں مندرجہ ذیل باتیں واضح ہوتی ہیں۔

[1] المآئدۃ 27:5. [2] اٰل عمرٰن 183:3.

① سابقہ امتوں میں بھی قربانی کا طریقہ تھا۔

② ﴿بِقُرْبَانٍ﴾ (قربانی) کا لفظ قرآن میں موجود ہے۔

③ قربانی کا حکم اللہ تعالیٰ کی طرف سے تھا جسے انبیاء علیہم السلام اور ان کی امتیں بجالاتیں۔

④ اس کی قبولیت کی علامت یہ تھی کہ آگ اسے کھا جاتی۔ بظاہر یہ مال کا ضیاع تھا۔

پرویز صاحب مزید لکھتے ہیں: ''اگر حکومت عادل کو یہ رقم (قربانی کی رقم) اکٹھی کر کے دے دی جائے تو حکومت بڑے مفید کام کر سکتی ہے۔''[1]

یہاں ہم یہ سوال کرنے میں حق بجانب ہیں کہ جب آپ قربانی کا حکم ہی نہیں مانتے تو پھر اس طرح کا مشورہ دینے کی کیا ضرورت ہے اور آپ نے یہ موقف قرآن کریم کی کون سی آیت سے اخذ کیا ہے؟ پرویز صاحب کی یہ عجیب وغریب منطق ملاحظہ فرمائیں کہ ایک طرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کو حجت نہیں مانتے لیکن دوسری طرف اپنے مقصد کے لیے انھوں نے ایک جگہ ''المحلّٰی'' میں مذکور بلال رضی اللہ عنہ کے سنداً ضعیف قول سے اور صاحب ہدایہ کے قول سے استدلال کیا ہے۔

ان مثالوں سے صریحًا ثابت ہوگیا کہ قرآن کے اوامر پر عمل کرنا علم حدیث پر منحصر ہے۔ ہم نے صلاۃ، زکاۃ، حج اور قربانی کے احکام قرآن وحدیث کی روشنی میں بیان کیے ہیں۔ اگر ان احکام کی شرح میں وارد احادیث حجت نہیں تو پھر ان احکام قرآنی کی تعمیل کس طرح ہوگی؟ اب ایک طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عملی شرح موجود ہے اور دوسری طرف پرویز صاحب کی تحریفات اور تاویلات سے ان عبادات کے خود ساختہ معانی اور عملی طریقے ہیں۔ کیا کوئی مسلمان نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقوں پر پرویز صاحب کے دجل وفریب کو ترجیح دے سکتا ہے؟ اگر کوئی ترجیح دیتا ہے تو یہ صریح کفر ہوگا۔ نعوذ باللہ من ذٰلك.

① قرآنی فیصلے، ص: 112.

قرآن کریم کی رو سے سنت نبوی کا محفوظ ہونا

قرآن کریم سے یہ ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی احادیث محفوظ وحی ہیں۔ اس باب میں دو فصلیں ہیں۔ پہلی فصل میں حفاظت قرآن کا بیان ہے جبکہ دوسری فصل میں احادیث صحیحہ کی حفاظت کا اثبات بیان کیا جائے گا۔ ان شاء اللہ!

فصل اول

قرآن کریم کی حفاظت

دوسری الہامی کتابوں (تورات، زبور، انجیل اور صحیفوں) کی نسبت قرآن کریم کی یہ خصوصیت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی حفاظت کی ذمہ داری بذات خود لی ہے، چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ ۝ ﴾

''بے شک ہم نے اس ذکر (قرآن) کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔''[1]

دوسری کتابوں بالخصوص تورات کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

﴿ بِمَا اسْتُحْفِظُوا مِن كِتَابِ اللَّهِ وَكَانُوا عَلَيْهِ شُهَدَاءَ ﴾

''ان علمائے یہود کی حفاظت میں اللہ کی کتاب دی گئی تھی اور وہ اس پر گواہ تھے۔''[2]

[1] الحجر 15:9. [2] المآئدة 5:44.

یعنی یہود کے علماء کو تورات کی حفاظت کی ذمہ داری سونپی گئی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ کتاب ایک مدت تک رہنے والی تھی اور اس مدت تک علمائے یہود اس کی حفاظت کر سکتے تھے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ تورات، زبور، اور انجیل کتابی (لکھی ہوئی) صورت میں انبیاء علیہم السلام کو عطا کی گئی تھیں، اس لیے مکتوب چیز کو تو علم اور کتابت سمجھنے والے ہی محفوظ کر سکتے تھے جبکہ عام لوگ اس سے بے خبر رہتے۔ ان دو وجوہ کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے ان کتابوں کی حفاظت کی ذمہ داری انبیاء علیہم السلام اور علماء کے سپرد کی تھی جبکہ قرآن کریم قیامت تک باقی رہنے والی کتاب تھی اور اس کے اولین مخاطب ان پڑھ لوگ تھے۔ وہ بطور کتابت اس کی حفاظت نہیں کر سکتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے اس کی حفاظت کی ذمہ داری بذات خود قبول فرمائی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں ایک منظم پروگرام کے تحت کاتبین وحی کا تقرر ہوا اور انھوں نے تحریری طور پر قرآن کریم کو محفوظ کیا۔

قرآن کریم کی صفات میں اس کا محفوظ ہونا بھی شامل ہے، لہٰذا قرآن کریم میں لفظاً و معناً کسی بھی طریقے سے تبدیلی واقع نہیں ہوسکتی۔ ارشاد الٰہی ہے:

﴿ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ۭ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ﴾

”آپ کے رب کی بات صدق و عدل کے اعتبار سے کامل ہے اس کی باتوں کو کوئی بدلنے والا نہیں۔“[1]

نیز فرمایا:

﴿ وَاتْلُ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنْ كِتَابِ رَبِّكَ ڄ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ﴾

”اور اپنے رب کی کتاب پڑھتے رہیں جو آپ کی طرف وحی کی گئی ہے، اس کے کلمات کو کوئی تبدیل کرنے والا نہیں۔“[2]

[1] الأنعام 115:6. [2] الكهف 27:18.

نیز فرمایا:

﴿ قُلْ مَا يَكُونُ لِيٓ أَنْ أُبَدِّلَهُۥ مِن تِلْقَآئِ نَفْسِيٓ ﴾

''کہہ دیجیے کہ مجھے یہ حق نہیں کہ میں اسے اپنی طرف سے بدل ڈالوں۔''[1]

نیز فرمایا:

﴿ لَّا يَأْتِيهِ ٱلْبَٰطِلُ مِنۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِۦ ﴾

''اس تک باطل (تبدیلی) کو آگے سے رسائی ہے نہ پیچھے سے۔''[2]

مجاہد رحمہ اللہ نے اس آیت میں ''باطل'' کا معنی ''تبدیلی'' کیا ہے۔

لہٰذا قرآن کریم کی حفاظت کا معنی یہ ہے کہ قرآن کریم کے الفاظ میں کوئی تغیر و تبدل آ سکتا ہے نہ اس کے معانی میں کوئی تحریف و تغیر ہو سکتی ہے، البتہ کچھ باطل پرست لوگ یہ ناپاک کوشش کرتے ہیں کہ قرآن کریم کی آیات و الفاظ یا معانی و مفاہیم میں تبدیلی لے آئیں، جیسا کہ ہم نے پرویز صاحب کی سازش کو آشکار کیا۔ ان کی یہ کوشش و سازش ان شاء اللہ مسلمانوں میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔ ہر دور میں مسلمانوں نے اس قبیل کے باطل پرستوں کی ہر کوشش کو ناکام بنایا۔ اب بھی منکرین حدیث اس اسلام سے جو محمد ﷺ نے پیش کیا تھا مسلمانوں کو بہکانے کے لیے مختلف قسم کی معنوی تحریفات و تاویلات کرتے رہتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کی سازشوں اور جعل سازیوں سے امت کو آگاہ کرنے کے لیے ہر دور میں علمائے حق پیدا فرمائے جو انھیں ان کے مذموم مقصد میں کامیاب نہیں ہونے دیتے اور سادہ لوح مسلمانوں کو ان کے جھوٹے جال میں پھنسنے نہیں دیتے۔

[1] یونس 15:10۔ [2] حٰمٓ السجدۃ 42:41۔

حفاظت قرآن کے مراحل

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ ○

''اس کو جمع کرنا اور اس کو پڑھانا ہمارا کام ہے۔''[1]

ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا: ''اس کتاب کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سینہ مبارک میں جمع کرنا اور جبریل علیہ السلام کی وساطت سے اس کا پڑھنا یا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک پر اس کی قراءت کو چلانا اللہ تعالیٰ کا کام ہے۔''

اس تفسیر کے لحاظ سے قرآن کریم کو جمع کرنے کا یہ پہلا دور ہے لیکن اس لفظ کے اطلاق سے معلوم ہوتا ہے کہ بعد میں آنے والے ادوار (جنھیں ہم بیان کریں گے) میں بھی جمع کرنا اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہے۔

جمع قرآن کے ادوار

1 دور نبوی: اس دور میں قرآن کی حفاظت کے دو طریقے تھے، حفظ اور کتابت، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں میں سے حفظ قرآن پر زیادہ زور دیا تھا، اس کی چند وجوہ تھیں:

1 قرآن کریم کتابی شکل میں نہیں بلکہ بواسطۂ جبریل علیہ السلام صوتی انداز میں (آواز کے ذریعے سے) نازل ہوا، یعنی جس طرح جبریل علیہ السلام نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو پڑھایا ویسے ہی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابۂ کرام کو سنایا اور حفظ کرایا۔ اس طریقے میں کسی رسم الخط، نقطوں اور اعراب وغیرہ کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ یہ بالکل سادہ اور فطری طریقہ تھا۔

2 اہل عرب کا حافظہ بہت قوی تھا اور ان میں پڑھے لکھے لوگ پانچ فی صد سے بھی کم تھے۔

[1] القيامة 75:17.

[3] تورات لکھی ہوئی صورت میں نازل ہوئی تھی، لہٰذا یہ پڑھے لکھے لوگوں کے ساتھ خاص ہوئی۔ رفتہ رفتہ انھوں نے اس میں تحریف کر ڈالی اور عوام کو اس کا علم بھی نہ ہوا کیونکہ تورات کو حفظ کرنے والے نہیں تھے۔ جبکہ قرآن کریم میں حفاظت قرآن بذریعۂ حفظ کا خصوصی طور پر ذکر ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ ﴾

''بلکہ یہ کھلی اور روشن آیتیں ہیں ان لوگوں کے سینوں میں جنھیں علم دیا گیا ہے۔''[1]

اس لیے نبی ﷺ کی وفات کے وقت سینکڑوں حفاظِ کرام موجود تھے۔ معرکۂ بئر معونہ جو 4 ہجری میں ہوا اس میں تقریباً ستر حفاظ شہید ہوئے اور ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ابتدائی دورِ خلافت میں لڑی جانے والی جنگ یمامہ میں تقریباً سات سو حفاظ قرآن شہید ہوئے تھے۔

کتابت کا طریقہ یہ تھا کہ جب بھی نبی ﷺ پر کوئی آیت یا کوئی سورت نازل ہوتی تو آپ ﷺ زید بن ثابت رضی اللہ عنہ یا کسی دوسرے کاتب وحی کو بلا کر فرماتے کہ یہ آیت فلاں جگہ اور یہ آیت فلاں جگہ لکھ دو۔[2]

چنانچہ صحابۂ کرام حفظ کے ساتھ ساتھ کتابت بھی کررہے تھے۔ اس دور میں کتابت کے لیے درج ذیل چیزیں استعمال کی جاتی تھیں:

[1] دباغت دی ہوئی باریک کھال۔

[2] پتھر کی سلیں۔

[3] اونٹ کے شانے۔

[4] کھجور کی شاخوں کے چھلکے۔

---

[1] العنکبوت 49:29۔ [2] سنن أبي داود، الصلاة، باب من جهربها، حديث: 786، وجامع الترمذي، تفسير القرآن، باب ومن سورة التوبة، حديث: 3086.

5 اونٹ کے کجاوے کی چھوٹی لکڑیاں۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے دور میں سارے کا سارا قرآن، آیات اور سورتیں، ترتیب کے ساتھ ٹکڑوں کی صورت میں محفوظ تھا لیکن کتابی شکل میں ایک جگہ جمع نہیں تھا۔ حفاظِ کرام نے بھی اس مجموعے کو حفظ کیا تھا اور یوں مجموعی طور پر تمام قرآن کریم کے حفاظ موجود تھے۔ اس کے علاوہ جبریل علیہ السلام بھی ہر سال رمضان میں نبی ﷺ کے ساتھ قرآن کریم کا دور کیا کرتے تھے۔

2 دورِ صدیقی: امام بخاری رحمہ اللہ دیگر محدثینِ کرام اور مؤرخین نے تفصیل کے ساتھ دورِ صدیقی میں جمع قرآن کا ذکر کیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ جب جنگ یمامہ میں تقریباً سات سو حفاظِ کرام شہید ہوگئے تو یہ خطرہ محسوس ہوا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان حفاظ کے ختم ہونے سے قرآن کریم سارے کا سارا یا اس کا کچھ حصہ ضائع ہوجائے۔ عمر رضی اللہ عنہ نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کو رائے پیش کرتے ہوئے قرآن کریم کو کتابی شکل میں ایک جگہ جمع کرنے کی اشد ضرورت ہونے پر زور دیا۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ابتدا میں عمر رضی اللہ عنہ کی رائے کی مخالفت کرنے کے بعد ان کی رائے پر رضامندی ظاہر کردی، پھر زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو اس کام پر آمادہ کیا۔ صحابۂ کرام کے پاس قرآن کریم کا جو جو حصہ لکھا ہوا تھا زید رضی اللہ عنہ نے بہت محنت اور جدو جہد سے اسے دودو حافظوں کی شہادت وگواہی کے بعد اکٹھا کیا اور اس مجموعے کو ایک کتابی صورت میں مصحف بنا کر حکومت کی نگرانی میں رکھ دیا جو ابوبکر رضی اللہ عنہ کی وفات تک ان کے پاس رہا اور ان کے بعد عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے پاس رہا۔ عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد یہ مصحف ام المؤمنین حفصہ بنت عمر رضی اللہ عنہما کے پاس رہا۔[1]

مختصر یہ کہ اس دور میں یہ کام کیا گیا کہ قرآن کریم جو مختلف حصوں میں مختلف صحابۂ کرام

[1] صحيح البخاري، تفسير القرآن، باب قوله تعالیٰ: لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ ...... ، حديث: 4679.

کے پاس تھا اسے زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کی نگرانی میں اکٹھا کر کے ایک کتابی صورت میں جمع کیا گیا۔ آیات اور سورتوں کی ترتیب وہی تھی جو رسول اللہ ﷺ کے دور میں تھی۔اس کی تفصیل بعد میں آئے گی۔

3 دورِ عثمانی: ائمہ حدیث اور مؤرخینِ اسلام نے دورِ عثمانی میں جمعِ قرآن کا تذکرہ بھی اپنی کتابوں میں تفصیل کے ساتھ کیا ہے۔اس کی تفصیل یہ ہے، جب عثمان رضی اللہ عنہ خلیفہ بنے تو اسلام عرب سے نکل کر روم اور ایران کے دور دراز علاقوں تک پہنچ چکا تھا۔ ہر نئے علاقے کے لوگ جب مسلمان ہوتے تو وہ ان مجاہدین اسلام یا ان تاجروں سے قرآن کریم سیکھتے جن کی بدولت انھیں اسلام کی نعمت حاصل ہوئی تھی۔ اور یہ بات تو آپ کے علم میں بھی ہے کہ قرآن کریم سات حروف پر نازل ہوا تھا اور مختلف صحابہ کرام نے اسے نبی ﷺ سے مختلف قراءتوں کے مطابق سیکھا تھا، اس لیے ہر صحابی نے اپنے شاگردوں کو اسی قراءت کے مطابق پڑھایا جس کے مطابق خود اس نے نبی ﷺ سے پڑھا تھا، اس طرح قراءتوں کا یہ اختلاف دور دراز ممالک تک پہنچ گیا۔ جب تک لوگ اس حقیقت سے واقف تھے کہ قرآن کریم سات حروف پر نازل ہوا ہے اس وقت تک اس اختلاف سے کوئی خرابی پیدا نہیں ہوئی۔لیکن جب یہ اختلاف دور دراز ممالک میں پہنچا اور یہ بات ان میں پوری طرح مشہور نہ ہوسکی کہ قرآن کریم سات حروف پر نازل ہُوا ہے۔تو اس وقت لوگ آپس میں جھگڑنے لگے، بعض لوگ اپنی قراءت کو صحیح اور دوسرے کی قراءت کو غلط قرار دینے لگے، ان جھگڑوں سے ایک طرف تو یہ خطرہ تھا کہ لوگ قرآن کریم کی متواتر قراءتوں کو غلط قرار دینے کی سنگین غلطی میں مبتلا ہوں گے، دوسرے سوائے زید رضی اللہ عنہ کے لکھے ہوئے ایک نسخے کے جو مدینہ منورہ میں موجود تھا، پورے عالمِ اسلام میں ایسا کوئی اور معیاری نسخہ موجود نہیں تھا جو پوری امت کے لیے تصحیح کا معیار بن سکے، کیونکہ دوسرے

نسخے انفرادی طور پر لکھے ہوئے تھے اور ان میں ساتوں حروف کو جمع کرنے کا کوئی اہتمام نہیں تھا، اس لیے ان جھگڑوں کے تصفیہ کی قابلِ اعتماد صورت یہی تھی کہ ایسے نسخے پورے عالمِ اسلام میں پھیلا دیے جائیں جن میں ساتوں حروف جمع ہوں اور انھیں دیکھ کر یہ فیصلہ کیا جاسکے کہ کونسی قراءت صحیح ہے اور کونسی غلط؟ عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنی نگرانی میں یہی عظیم الشان کارنامہ انجام دیا۔

ترتیبِ قرآن

ترتیبِ قرآن کی تین قسمیں ہیں:

- ترتیبِ نزولی: حسب واقعہ کوئی آیت یا کوئی سورت نازل ہوتی تھی۔ چونکہ واقعات کا آپس میں کوئی ربط وتناسب نہیں ہوتا تھا، اس لیے ترتیب نزولی میں بھی ربط وتناسب کا لحاظ نہیں ہے کوئی آیت یا سورت مکہ میں نازل ہوئی تو کوئی مدینہ میں، کوئی سفر میں تو کوئی حضر میں اور کوئی رات کے وقت نازل ہوئی تو کوئی دن کے وقت۔
- ترتیبِ کتبی: اس سے مراد قرآن کریم کے لکھنے کی ترتیب ہے۔ نزول کے وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اہتمام کیا کہ فلاں آیت فلاں آیت کے بعد فلاں سورت میں اور فلاں سورت فلاں سورت کے بعد لکھی جائے۔ اگرچہ یہ مختلف ٹکڑے تھے مگر حقیقت میں ان میں پوری ترتیب تھی۔ حفاظِ کرام نے بھی اسی ترتیب سے قرآن کریم حفظ کیا تھا۔ اور جبریل علیہ السلام بھی رمضان میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اسی ترتیب کے ساتھ دور کیا کرتے تھے، لہٰذا ترتیب آیات بالاجماع توقیفی ہے اور صحیح قول کے مطابق سورتوں کی ترتیب بھی توقیفی ہے۔ اس کے دلائل درج ذیل ہیں۔

1. امام بیہقی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں قرآن کریم کی سورتیں اور آیتیں،

سورۂ انفال اور سورۂ توبہ کے سوا سب اسی (موجودہ) ترتیب کے ساتھ مرتب تھیں۔[1]

2 نبی ﷺ نے فرمایا: زہراوین (سورۂ بقرہ اور سورۂ آل عمران) پڑھا کرو۔[2]

3 نبی ﷺ نے ایک مرتبہ ایک رکعت میں سات لمبی سورتیں (بقرہ، آل عمران، نساء، انعام، اعراف اور انفال مع التوبہ) پڑھی تھیں۔ مصنف ابن ابی شیبہ

4 ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے تھے: سورۂ بنی اسرائیل، کہف، مریم، طٰہٰ اور انبیاء (مرتب طریقے سے) کھری کھری پرانی سورتوں میں سے ہیں۔[3]

5 نبی ﷺ سونے سے پہلے اپنے بستر پر (ترتیب وار) سورۂ اخلاص اور معوذتین پڑھا کرتے تھے۔[4]

6 ابو جعفر نحاس نے کہا: مختار قول یہ ہے کہ سورتوں کی یہ ترتیب رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے۔ انھوں نے حدیث واثلہ رضی اللہ عنہ سے استدلال کیا ہے جس میں درج ہے کہ مجھے تورات کے بدلے میں سبع طوال (سات لمبی سورتیں) دی گئی ہیں۔[5]

7 ابن حجر رحمہ اللہ نے مسند احمد اور سنن ابو داود کی اوس بن ابی اوس رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث سے استدلال کیا ہے کہ سورتوں کی ترتیب توقیفی ہے۔ انھوں نے کہا: صحابۂ کرام نے قرآن کریم کو سات منزلوں میں تقسیم کیا تھا۔[6] جس کا طریقہ کار یہ تھا۔

❁ تین سورتیں ❁ پانچ سورتیں

---

① الإتقان في علوم القرآن للسيوطي: 196/1. (حقیقت میں یہ دونوں سورتیں بھی مرتب تھیں مگر اس وقت صحابۂ کرام کے ذہنوں سے ان کی یہ حقیقی ترتیب اوجھل رہی) ② صحيح مسلم، صلاة المسافرين و قصرها، باب فضل قراءة القرآن وسورة البقرة، حديث: 804. ③ صحيح البخاري، فضائل القرآن، باب تأليف القرآن، حديث: 4994. ④ صحيح البخاري، الطب، باب النفث في الرقية، حديث: 5748. ⑤ مسند أحمد: 107/4، حديث: 17107. ⑥ سنن أبي داود، الصلاة، تحزيب القرآن، حديث: 1393، و مسند أحمد: 9/4، حديث: 16266. (اوس بن حذیفہ) فيه رجل مقبول اسمه عثمان.

* سات سورتیں
* نو سورتیں
* گیارہ سورتیں
* تیرہ سورتیں
* اور حزب المفصل (سورۂ قٓ سے ناس تک)

پھر انھوں نے کہا کہ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ قرآن کریم کی سورتوں کی موجودہ ترتیب نبی ﷺ کے زمانے میں تھی۔

امام سیوطی رحمہ اللہ نے فرمایا: سات حوامیم "حٰمٓ" اور تین طواسین "طٰسٓمٓ" کو ایک ترتیب سے لکھا گیا اور مُسبّحات سورتوں کو ایک ترتیب سے نہیں لکھا گیا۔ اگر یہ ترتیب اجتہادی ہوتی تو حوامیم کی طرح مسبحات کو بھی اکٹھا رکھنا مناسب تھا۔

ان روایات سے معلوم ہوا کہ سورتوں کی موجودہ ترتیب نبی ﷺ کے زمانے میں موجود تھی، نیز آپ ﷺ اور صحابۂ کرام اسی ترتیب سے قرآن کریم پڑھا کرتے تھے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پرویز صاحب کا بھی یہی نظریہ ہے تو پھر فرق کیا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ پرویز صاحب کے نظریے اور مذکورہ بیان میں بہت فرق ہے۔

انھوں نے لکھا ہے: "اس کتاب کی ایک مستند کاپی مسجد نبوی میں ایک ستون کے قریب صندوق میں رکھی رہتی تھی۔ یہ وہ نسخہ تھا جس میں نبی ﷺ سب سے پہلے وحی لکھوایا کرتے تھے۔ اسے ام یا امام کہا کرتے تھے۔ اور اس ستون کو استوانۂ مصحف کہا جاتا تھا۔ صحابہ اس ستون کے پاس بیٹھ کر نبی ﷺ کی زیر نگرانی اس مصحف سے اپنے اپنے مصاحف نقل کیا کرتے تھے۔"[1] پرویز صاحب مزید لکھتے ہیں: اس کتاب کے متعلق عمر رضی اللہ عنہ نے نبی ﷺ کی حیات طیبہ کے آخری لمحات میں کہا تھا: حَسْبُنَا كِتَابُ اللّٰهِ.

پرویز صاحب کے اس کلام پر ایک ناقدانہ نظر ڈالتے ہیں۔

[1] طلوع اسلام، فروری، 1982ء، ص: 112۔

1. وہ لاکھوں افراد جن کے پاس اس کاپی سے نقل شدہ مصاحف موجود تھے ان میں سے چند اصحاب کا نام تحریر کرنا چاہیے۔

2. امام دراصل وہ مستند مصحف ہے جو عثمان رضی اللہ عنہ نے سات کی تعداد میں نقل کروا کر مختلف شہروں میں ارسال کیے۔

3. عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانے میں جو نسخہ مدینہ میں رکھا گیا تھا اسے انھوں نے اس استوانہ (ستون) کے ساتھ رکھا تھا، جو بعد میں استوانۂ مصحف کے نام سے مشہور ہوا۔

4. عمر رضی اللہ عنہ کے قول ''حَسْبُنَا كِتَابُ اللّٰهِ'' میں کتاب سے مراد اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام ہیں کیونکہ لفظ کتاب قرآن کریم میں مختلف معانی میں استعمال ہوا ہے، مثلاً:

- فرض شدہ چیز یا معاملہ (النسآء 4:103)
- حجت اور دلیل (الصّٰفّٰت 37:157)
- موت کا مقرر شدہ وقت (الحجر 15:4)
- غلام اور لونڈی کو مکاتب بنانا (النور 24:33)
- لکھنا (النبا 78:29)
- اعمال نامہ (بنیٓ إسرآء یل 17:13)
- لوح محفوظ (الواقعة 56:78)

عمر رضی اللہ عنہ کے قول سے مراد وہ مکتوب ہے جو صحابۂ کرام کے پاس مختلف رقعات وغیرہ میں لکھا ہوا تھا یا قرآن کا وہ حصہ جو مختلف صحابۂ کرام کے سینوں میں جمع تھا یا وہ احکام مراد ہیں جو قرآن وسنت میں فرض قرار دیے گئے ہیں۔

ترتیبِ تلاوت: اگرچہ اس میں علماء کا اختلاف ہے کہ یہ ترتیب ضروری ہے یا نہیں، تاہم صحیح یہ ہے کہ تلاوت کے وقت قرآن مجید کی موجودہ ترتیب کی پابندی کرنا ضروری

نہیں، خواہ تلاوت نماز میں ہو یا نماز کے علاوہ عام اوقات میں۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے بہت سے صحابۂ کرام اور سلف صالحین سے نقل کیا ہے کہ وہ سورتوں کی ترتیب کے مطابق تلاوت کرنا ضروری نہیں سمجھتے تھے۔

اسی طرح ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی تالیف سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی تلاوت کے وقت موجودہ ترتیب کتبی کا لحاظ نہیں کیا کرتے تھے۔ اگرچہ اکثر حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سورتوں کی ترتیب سے تلاوت فرمایا کرتے تھے، (جیسا کہ ترتیب کتبی کے اثبات کے لیے دلائل پیش کیے گئے) لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کبھی کبھی اس ترتیب کو اس لیے چھوڑ دیا کرتے تھے کہ یہ لازمی نہیں، البتہ امر مستحب ہے اور ترتیب کا لحاظ نہ کرنے میں کوئی کراہت نہیں، تاہم اس ترتیب کے متعلق یہ کہنا کہ اس کی کوئی شرعی حیثیت نہیں (جیسا کہ مولانا عبدالرحمٰن کیلانی رحمہ اللہ نے کہا ہے) درست نہیں۔ یہ کسی فتنے کا پیش خیمہ بن سکتا ہے اور اس وجہ سے عوام الناس کے دلوں میں مرتب شدہ قرآنِ کریم کے متعلق شکوک وشبہات پیدا ہوجانے کا خطرہ ہے۔

پرویز صاحب نے اپنے اس نظریے (کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پورا مرتب شدہ قرآن کتابی شکل میں موجود تھا) کے اثبات کے لیے صحیح بخاری، کتاب فضائل القرآن کے حوالے سے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث پیش کی ہے کہ کسی نے ان سے پوچھا: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کے لیے کیا چھوڑا ہے؟ تو انھوں نے فرمایا:

«مَا تَرَكَ إِلَّا ما بَيْنَ الدَّفَّتَيْنِ»

''آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف یہ دو گتوں کے مابین (مجلد) کتاب چھوڑی ہے۔''[1]

اس کا جواب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی عمر تیرہ یا

[1] صحیح البخاري، فضائل القرآن، باب من قال لم يترك النبي إلّا......، حدیث: 5019.

چودہ برس تھی۔ آپ نے خلفائے راشدین کا زمانہ پایا اور 65 ہجری میں وفات پائی۔ ان کے مذکورہ جواب کا مطلب یہ ہے کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ یا عثمان رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں قرآنِ کریم کو کتابی شکل میں جمع کیا گیا اور وہ دو گتوں کے مابین مجلد صورت میں تیار ہوگیا۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس کی طرف اشارہ فرمایا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی کتاب چھوڑی تھی۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ قرآنِ کریم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں اس طرح مجلد صورت میں موجود تھا۔

عثمان رضی اللہ عنہ کے دور سے لے کر آج تک قرآنِ کریم کسی تغیر و تبدل کے بغیر تمام اہلِ اسلام کے پاس موجود اور حفاظِ کرام کے سینوں میں محفوظ ہے۔ اگر کوئی شخص قصداً یا سہواً کوئی لفظ غلط پڑھے یا قرآن کی طباعت میں کوئی لفظی غلطی آجائے تو پھر اس قراءت اور طباعت کی غلطی درست کرنے کے لیے ہر طرف سے آواز بلند ہوجاتی ہے۔ طباعت کرنے والے کو تنبیہ کی جاتی ہے اور اس غلطی کی تصحیح کی جاتی ہے۔ یہ ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے قرآنِ کریم کی حفاظت اور یہی:

﴿ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ﴾

''اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔'' کا مصداق ہے۔

فصل دوم

حفاظتِ احادیث

حفاظتِ حدیث کے اثبات کے لیے قرآنِ کریم سے استدلال

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ ﴾

’’پھر اس کو بیان کرنا بھی ہماری ذمہ داری ہے۔‘‘[1]

نیز فرمایا:

﴿ وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ ﴾

’’اور ہم نے آپ کی طرف ذکر نازل کیا تا کہ آپ لوگوں کے لیے واضح کر دیں جو ان کی طرف نازل کیا گیا۔‘‘[2]

ان آیات سے استدلال اس طرح سے ہے کہ قرآن کریم بالاتفاق الفاظ اور معانی کا نام ہے۔ معانی اس وجہ سے کہ اگر معانی نہ ہوں تو سارے الفاظ مہمل رہ جاتے ہیں اور مہمل چیز اللہ تعالیٰ کی کتابِ ہدایت نہیں بن سکتی۔ الفاظ اس وجہ سے قرآن ہیں کہ نازل ہونا الفاظ کی صفت ہے۔ پہلی فصل میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم کی حفاظت کی ہے، کر رہا ہے اور کرتا رہے گا، لہٰذا اس سے الفاظ اور معانی دونوں کی حفاظت مراد ہے، پھر ہر لغت میں ہر لفظ کے معنی کے لیے مستقل لفظ استعمال کیا جاتا ہے، مثلاً: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ کا معنی الحمدللہ نہیں بلکہ عربی لغت میں اس کا معنی ’’اَلثَّنَاءُ الْحَسَنُ‘‘ اردو میں ’’تعریف اور صفت بیان کرنا‘‘ جبکہ فارسی میں ’’ستودن‘‘ یا ’’ستائش کردن‘‘ ہے۔ یہ معانی بھی الفاظ ہیں۔ سورۂ قیامہ کی مذکورہ آیت میں اللہ تعالیٰ نے قرآن کا بیان اپنے ذمے لیا ہے، یعنی بیان کے مقصد، معنی اور مفہوم کو واضح کرنا بھی اپنے ذمہ لیا ہے۔ جبکہ سورۂ نحل کی مذکورہ آیت میں تبیان کی ذمہ داری نبی ﷺ کو سونپی گئی ہے اور تبیان کا مطلب ہے ’’تشریح کرنا‘‘ اس طرح اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم کا مفہوم اور معنی رسول اللہ ﷺ کی احادیث کی صورت میں محفوظ فرمایا۔ قرآن کریم کی شرح جو رسول اللہ ﷺ کے ذمے لگائی گئی وہ رسول اللہ ﷺ کی احادیث میں ہے، مثلاً: قرآنِ کریم میں اقامتِ

[1] القیامة 19:75. [2] النحل 44:16.

صلاۃ اور ایتائے زکاۃ کا تذکرہ اجمالی طور پر ہے اوران کی شرح اور مفہوم نبی ﷺ کی احادیث میں ہے، اس لیے قرآن کریم کی شرح اور معانی کے لحاظ سے حفاظت، حفاظتِ حدیث سے عبارت ہے، یعنی حفاظتِ قرآن، حفاظتِ حدیث کے بغیر ممکن ہی نہیں۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّكۡرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوۡنَ ۝ ﴾

''بلاشبہ ہم نے اس ذکر کو نازل فرمایا اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔''[1]

اس آیت سے حفاظتِ حدیث کے لیے دو طرح سے استدلال کیا جا سکتا ہے۔

1 آیت میں لفظ ﴿ اَلذِّكۡرَ ﴾ استعمال کیا گیا ہے جس کا معنی قرآن ہے۔ عام مفسرین نے یہی معنی لیا ہے اور پرویز صاحب بھی اسی معنی کے قائل ہیں، چنانچہ آیت میں حفاظتِ قرآن کا وعدہ کیا گیا ہے اور پہلے یہ واضح کیا جا چکا ہے کہ قرآن الفاظ اور معانی دونوں کا نام ہے اور معانی احادیث کی صورت میں موجود ہیں تو اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ اللہ تعالیٰ نے حدیث کی حفاظت کا بھی وعدہ کیا ہے۔

2 ﴿ اَلذِّكۡرَ ﴾ سے مراد صرف قرآن نہیں بلکہ ﴿ اَلذِّكۡرَ ﴾ بمعنی وحی ہے اور یہ بھی ثابت کیا جا چکا ہے کہ احادیث بھی وحیِ الٰہی ہیں، لہٰذا آیت مذکورہ حفاظتِ حدیث کے لیے بھی نص کا درجہ رکھتی ہے۔ اور ﴿ اَلذِّكۡرَ ﴾ سے مطلق وحی مراد لینے کی وجہ یہ ہے کہ اگر اس سے مراد صرف قرآن ہوتا تو پھر ﴿ اَلذِّكۡرَ ﴾ کے بجائے قرآن یا فرقان یا کتاب کا لفظ استعمال کرنا چاہیے تھا کیونکہ حفاظت کا مسئلہ بہت اہم ہے اور اہمیت کے مقام میں صریح لفظ استعمال کرنا ضروری ہوتا ہے، لہٰذا معلوم ہوا کہ یہاں ﴿ اَلذِّكۡرَ ﴾ سے صرف قرآن مراد نہیں بلکہ مطلق وحی مراد ہے۔ قرآنِ کریم میں لفظ ﴿ اَلذِّكۡرَ ﴾ کے متعدد معانی ہیں۔ امام

[1] الحجر 9:15.

سیوطی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ''اَلْإِتْقَانُ فِي عُلُومِ الْقُرْآن'' میں اس کے 22 معانی نقل کیے ہیں جبکہ ان سے ایک معنی رہ گیا ہے اور وہ ہے ''ذکر'' بمقابلہ نسیان، یعنی ''یاد کرنا''۔

چنانچہ ارشاد ہوا:

﴿فَالتّٰلِيٰتِ ذِكْرًا ۝﴾

''پس ان کی قسم جو ذکر (وحی، قرآن) کی تلاوت کرتے ہیں۔''[1]

پھر فرمایا:

﴿فَسْـَٔلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ﴾

''پس اہلِ ذکر (وحی والوں) سے پوچھو۔''[2]

ان آیات میں ذکر بمعنی وحی ہے تو سورۂ حجر کی آیت کا معنی یہ ہے کہ ہم نے وحی نازل فرمائی ہے اور ہم ہی اس وحی کی حفاظت کرنے والے ہیں اور یہ ثابت کیا جا چکا ہے کہ احادیثِ صحیحہ بھی وحیِ الٰہی ہیں، لہٰذا ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے جس طرح قرآن کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے؟ اسی طرح حدیث کی حفاظت کا بھی ذمہ لیا ہے اور جس طرح قرآن کی دو طریقوں، حفظ اور کتابت کے ذریعے سے حفاظت کی گئی اسی طرح حدیث کی حفاظت بھی انھی دو طریقوں سے کی گئی ہے۔

حفاظت حدیث بذریعہ سماع اور حفظ

اگر غور کیا جائے تو کسی بات، خبر اور قصے وغیرہ کی حفاظت کی پہلی بنیاد حفظ ہے، یعنی اسے اپنے دل و دماغ میں محفوظ کر کے یاد کر لینا جبکہ ضبط تحریر میں لانے کی اہمیت اس کے بعد ہے۔ حفظ میں تغیر آنے کا امکان کم اور کتابت میں زیادہ ہے، اسی لیے نبی ﷺ کتابتِ حدیث کی نسبت حفظِ حدیث کی زیادہ ترغیب دیا کرتے تھے، چنانچہ وفد عبدالقیس

[1] الصّٰفّٰت 3:37. [2] النحل 43:16.

کے واقعے میں ہے کہ نبی ﷺ نے جب انھیں چار چیزوں کا حکم فرمایا اور چار چیزوں سے منع کیا تو ارشاد ہوا:

«اِحْفَظُوهُنَّ وَأَخْبِرُوا بِهِنَّ مَنْ وَّرَاءَكُمْ»

''اسے یاد کرو اور اپنے پیچھے والے لوگوں کو اس کے متعلق بتاؤ۔''[1]

اور آپ ﷺ نے ترغیب کے طور پر فرمایا:

«نَضَّرَ اللهُ عَبْدًا سَمِعَ مَقَالَتِي فَوَعَاهَا ثُمَّ أَدَّاهَا إِلٰى مَنْ لَّمْ يَسْمَعْهَا»

''اللہ اس بندے کو خوش وخرم رکھے: جس نے میرے فرامین سنے، پھر انھیں یاد کیا اور پھر جنھوں نے نہیں سنا ان تک پہنچا دیا۔''[2]

اور ایک روایت میں ہے:

«رَحِمَ اللهُ امْرَءًا سَمِعَ مِنِّي حَدِيثًا فَحَفِظَهُ»

''اللہ تعالیٰ اس آدمی پر رحم فرمائے جس نے مجھ سے حدیث سن کر یاد کی۔''[3]

انھی اوامر اور ترغیبات کی وجہ سے صحابۂ کرام نے نبی ﷺ کے ہر فرمان کو سننے کے بعد یاد کیا اور آپ کے ہر فعل کو دیکھ کر اس کے مطابق اپنی عملی زندگی بنائی اور تمام افعالِ نبوی ذہن نشین کر لیے۔

قوتِ حافظہ اور صحابۂ کرام

عرب کے باشندے قدرتی طور پر قوی الحافظہ واقع ہوئے ہیں۔ ان کے شعراء اور خطباء کے بہت سے ایسے واقعات ہیں جنھیں سن کر انسان حیرت میں پڑ جاتا ہے۔ اہلِ

[1] صحيح البخاري، الإيمان، باب أداء الخمس من الإيمان، حديث: 53. [2] مسند أحمد: 82/4، وجامع الترمذي، العلم، باب ماجاء في الحث على تبليغ السماع، حديث: 2657.
[3] صحيح ابن حبان: 270/1، حديث: 67.

عرب ہزاروں اشعار، قصیدے اور امثال ایک ہی وقت میں زبانی سنا دیا کرتے تھے۔ ابن عبدالبر نے لکھا ہے:

''اہلِ عرب میں سے بعض لوگ ایسے بھی تھے جو کسی کے اشعار صرف ایک ہی دفعہ سن کر یاد کر لیا کرتے تھے۔''

صحابۂ کرام کی قوتِ حافظہ کے دو خصوصی اسباب تھے: ایک ظاہری اور طبی سبب، یعنی کم کھانا، کم سونا اور کم گوئی، ان معمولات سے انسان کی قوتیں مزید بیدار ہو جاتی ہیں کیونکہ زیادہ کھانا اور زیادہ سونا بہت سے امراض کا سبب بنتا ہے۔ دورِ حاضر میں یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہو چکی ہے۔ مزید برآں دنیوی مشاغل اور کثرتِ اموال بھی صحابۂ کرام کی صفت نہیں تھی جو حافظے کے لیے نقصان دہ ہے۔

ایک اور معنوی اور روحانی سبب تقویٰ ہے۔ اس کے علاوہ نبی ﷺ کی دعائیں، آپ کی بابرکت مجالس، دین داری اور گناہوں سے بچنا قوتِ حافظہ کے لیے انتہائی اہم اسباب ہیں۔ گناہ گار قسم کے لوگ زیادہ تر نسیان کے مریض ہوتے ہیں جبکہ صحابۂ کرام کی دیانت اور تقویٰ تو ساری امت کے لیے عظیم نمونہ ہے۔ قرآنِ کریم اور رسول اللہ ﷺ کی سنت کے اتباع نے ان کی روحانی قوت میں بے پناہ اضافہ کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ وہ نبی ﷺ کی مجالس مبارکہ سے مستفیض ہوتے رہتے تھے۔ بسا اوقات برکاتِ نبویہ کا بطور خرقِ عادت ظہور بھی ان کے لیے ہوتا تھا، چنانچہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے ان لوگوں کے جواب میں جنھوں نے ان پر کثرت روایات کا طعن کیا تھا، فرمایا: میں اس لیے کثرت سے روایات بیان کرتا ہوں کہ ایک دفعہ نبی ﷺ نے ایک مجلس میں فرمایا: وہ کون شخص ہے جو اس مجلس میں اپنا کپڑا بچھائے اور پھر اختتام مجلس پر وہ اپنا کپڑا جمع کر کے اپنے سینے سے لگا لے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: یہ سعادت مجھے نصیب ہوئی کہ میں نے جلدی

سے چادر بچھائی اور مجلس کے اختتام پر وہ چادر اپنے سینے سے لگائی۔ اس کے بعد مجھے کوئی حدیث نہیں بھولی۔[1]

محدثین نے بیان کیا ہے کہ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے 5374 احادیث نقل کی ہیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے صحیح بخاری میں ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی امتیازی شان میں ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا اپنے بارے میں قول نقل کیا ہے۔

«يَحْفَظُ مَا لَا يَحْفَظُونَ»

''ابوہریرہ رضی اللہ عنہ وہ احادیث بھی یاد کرتے تھے جو دوسرے نہیں یاد کرتے تھے۔''[2]

دوسرا قول ہے:

«حَفِظْتُ مِنْ رَّسُولِ اللهِ ﷺ وِعَائَيْنِ فَأَمَّا أَحَدُهُمَا فَبَثَثْتُهُ»

''میں نے رسول اللہ ﷺ سے علم کی دو انواع حفظ کی ہیں، جن میں سے ایک کو میں نے لوگوں میں پھیلایا ہے۔''[3]

ان کے علاوہ باقی صحابۂ کرام نے بھی اپنی استطاعت کے مطابق رسول اللہ ﷺ سے احادیث حفظ کیں۔

قوتِ حافظہ اور تابعین وائمۂ محدثین رحمہم اللہ

حفظِ حدیث کا سلسلہ جاری رکھنے کے لیے تابعین میں بھی بڑے بڑے علماء اور حفاظِ حدیث پیدا ہوئے جنھوں نے حفاظتِ حدیث میں بہت محنت کی ہے۔ ان میں سے چند حفاظِ حدیث درج ذیل ہیں:

---

(1) صحيح مسلم، فضائل الصحابة، باب من فضائل أبي هريرة رضي الله عنه، حديث: 2492.
(2) صحيح البخاري، العلم، باب حفظ العلم، حديث: 118. (3) صحيح البخاري، العلم، باب حفظ العلم، حديث: 120.

ابراہیم بن یزید تیمی، ابراہیم نخعی، احنف بن قیس، اسماعیل بن ابو خالد، اسود بن یزید، عروہ ابن زبیر، سلیمان بن مہران اعمش، اویس قرنی، ایوب بن ابوتمیمہ، بسر بن سعید، بکر بن عبداللہ قرنی، ثابت بن اسلم، جابر بن زید، جعفر بن محمد، حسن بن حسن، حسن بصری، خالد بن معدان، سعید بن جبیر، سعید بن میتب اور سالم بن عبداللہ رحمۃ اللہ علیہم۔

ان کے علاوہ بے شمار تابعین اصاغر و اکابر نے حفظِ حدیث کا اہتمام کیا۔ ان میں سے ایک امام ابن شہاب زہری رحمہ اللہ ہیں۔ امام ذہبی رحمہ اللہ نے ان کی قوتِ حافظہ کا ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ خلیفہ ہشام بن عبدالملک نے امام ابن شہاب زہری کی قوت حافظہ کا امتحان لینے کے ارادے سے انھیں کہا: میرے بیٹے کے لیے کچھ احادیث لکھ کر بھیج دیں۔ ابن شہاب نے کاتب سے چار سو احادیث تحریر کرائیں اور مسودہ خلیفہ کو بھیج دیا۔ کچھ مدت بعد ابن شہاب خلیفہ سے ملاقات کے لیے تشریف لے گئے تو خلیفہ نے افسوس ظاہر کرتے ہوئے کہا: آپ نے جو احادیث بھیجی تھیں ان کا مسودہ گم ہوگیا ہے۔ امام زہری نے فرمایا: پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ اسی وقت کاتب کو بلوایا اور وہی چار سو احادیث دوبارہ لکھوادیں۔ امام زہری رحمہ اللہ کے رخصت ہوجانے کے بعد خلیفہ نے چار سو احادیث کے پرانے مسودے کا اس نئے مسودے سے موازنہ کیا تو انھیں معلوم ہوا کہ امام زہری رحمہ اللہ نے کہیں بھی کوئی غلطی نہیں کی۔[1]

قوت حافظہ اور تبع تابعین

یہ تابعین کے شاگرد تھے۔ ان کا دور 180 ہجری سے 300 ہجری تک ہے۔ اس دور میں بڑے بڑے حفاظِ حدیث اور ائمۂ حدیث پیدا ہوئے۔ اسی دور کے حفاظِ حدیث میں سے امام محمد بن اسماعیل بخاری، ابن اسحاق، امام مالک، حماد بن سلمہ، سفیان ثوری، امام

[1] تذکرۃ الحفاظ: 1/84,83.

اوزاعی، عبداللہ بن مبارک، سفیان بن عیینہ، لیث بن سعد، شعبہ بن حجاج، محمد بن حسن، امام احمد بن حنبل، اسحاق بن راہویہ، ابن ابی شیبہ، امام محمد بن ادریس الشافعی، امام مسلم، امام ابوداود، امام ترمذی، امام نسائی، امام ابن ماجہ اور امام دارمی رحمہم اللہ قابل ذکر ہیں۔

یہ تمام ائمہ کرام حفاظِ حدیث کے ساتھ ساتھ مؤلفینِ کتب بھی تھے جس کا تذکرہ بعد میں آئے گا۔ ان میں سے سفیان ثوری رحمہ اللہ کو تیس ہزار، شعبہ کو دس ہزار، یزید بن ہارون کو چوبیس ہزار اور اسحاق بن راہویہ رحمہم اللہ کو ایک لاکھ احادیث یاد تھیں۔[1]

ابن کثیر رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ امام شافعی رحمہ اللہ نے فرمایا: ''میں نے دس سال کی عمر میں موطا امام مالک رحمہ اللہ حفظ کر لی تھی۔''

گزشتہ صفحات میں حفظ وسماع کے ذریعے سے حفاظتِ حدیث پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس سے واضح ہوا کہ سماع اور نقلِ حدیث کا سلسلہ مذکورہ قرون میں کبھی بھی منقطع نہیں ہوا۔ عرب وعجم کے تمام اطراف میں حفظِ حدیث، سماعِ حدیث اور درسِ حدیث کا چرچا اور دور دورہ تھا۔

کتابت اور تالیف وتدوین کے ذریعے سے حفاظتِ حدیث

حفاظتِ حدیث کا یہ دوسرا طریقہ ہے، یعنی نبی ﷺ کے دور سے لے کر قرونِ ثلاثہ (جس کے بھلائی پر ہونے کی خبر نبیٔ اکرم ﷺ نے دی تھی) میں یہ سلسلہ جاری تھا۔ ہر کاتب ومؤلفِ حدیث نے اپنی سند کو سماعِ صحابہ کی سند سے نبی ﷺ تک پہنچایا ہے۔

دورِ نبوی میں کتابتِ حدیث

امام بخاری رحمہ اللہ نے ''کتاب العلم، باب کتابة العلم'' میں چار احادیث درج کی

[1] تذکرة الحفاظ: 153/1 و 232/1۔

ہیں جن سے نبی ﷺ کے دور میں کتابتِ حدیث کا ثبوت ملتا ہے۔

① علی رضی اللہ عنہ کی روایت جس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا: کیا آپ کے پاس کوئی (خاص) کتاب ہے (جیسا کہ شیعوں کا باطل عقیدہ ہے)۔ آپ نے فرمایا: ہمارے پاس صرف کتاب اللہ ہے، دوسری وہ سمجھ ودانائی جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی مسلمان آدمی کو دی جائے۔ تیسری چیز ایک خاص رسالہ ہے جو میرے پاس ہے اور اس کے اندر دیت دینے اور قیدی چھڑانے کے تفصیلی احکام ہیں۔ اس میں یہ حکم بھی ہے کہ کسی کافر کے بدلے میں مسلمان کو قتل نہیں کیا جائے گا۔[1]

② ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فتح مکہ کے موقع پر بہت لمبا خطبہ ارشاد فرمایا، جس میں بہت سے آدابِ واحکام بیان فرمائے۔ ایک یمنی شخص ابوشاہ نے آپ کے قریب آکر عرض کیا: یہ احکام میرے لیے لکھوا دیں تو نبی ﷺ نے فرمایا: ''ابوفلاں، یعنی ابوشاہ کو لکھ دو۔''[2]

③ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی دوسری حدیث میں ہے کہ عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کے سوا مجھ سے زیادہ احادیث نقل کرنے والا کوئی نہیں ہے کیونکہ وہ احادیث لکھ لیا کرتے تھے جبکہ میں نہیں لکھا کرتا تھا۔[3]

④ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث ہے جس میں نبی ﷺ نے مرض الموت میں فرمایا تھا:

''ایک کتاب لاؤ تاکہ میں تمھارے لیے ایسی چیز لکھوں جس کے بعد تم گمراہ نہیں ہوگے۔''[4]

یہی چیز جو صحابہ کے اختلاف کی وجہ سے آپ نے نہ لکھی زبانی طور پر صحابہ کو بیان فرما دی:

① صحيح البخاري، العلم، باب كتابة العلم، حديث: 111. ② صحيح البخاري، العلم، باب كتابة العلم، حديث: 112. ③ صحيح البخاري، العلم، باب كتابة العلم، حديث: 113. ④ صحيح البخاري، العلم، باب كتابة العلم، حديث: 114.

1 جب کوئی وفد آئے تو اس کا احترام کرو۔

2 مشرکین کو جزیرۃ العرب سے نکال دو۔

3 میری قبر کو وثن (ایسا بت جس کی عبادت کی جائے) نہ بنانا کہ اس کی عبادت کی جائے۔

4 امام بخاری رحمہ اللہ نے کتاب الجهاد والسير میں باب كتابة العلم للناس کے زیرعنوان بیان کیا ہے کہ پندرہ سو صحابہ کے نام رجسٹر میں لکھے گئے تھے۔ اور اس وقت یہ ضروری تھا کہ پورا نام مع ولدیت اور کنیت لکھا جائے۔

بخاری کے علاوہ دیگر کتب میں کتابتِ حدیث کے حکم کا ثبوت

5 عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما کا ایک ہزار احادیث پر مشتمل الصحيفة الصادقة یا الرسالة الصادقة تھا۔[1]

6 رافع رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ میں نے عرض کیا: اللہ کے رسول! ہم آپ سے احادیث سنتے ہیں تو کیا انھیں لکھ لیا کریں؟ آپ نے فرمایا:

«أُكْتُبُوا وَلَا حَرَجَ»

''لکھ لیا کرو کوئی حرج نہیں۔''[2]

7 فتح الباری اور سیرت ابن ہشام میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ثمامہ بن اثال رضی اللہ عنہ کے نام خط بھیجا کہ اپنے ملک یمامہ سے اہلِ مکہ کو غلہ بھیجنا بند نہ کریں۔[3]

8 عبداللہ بن عکیم کی روایت میں ہے کہ

''نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی وفات سے ایک ماہ قبل أهل جهينه کو خط لکھا جس میں لکھا ہوا تھا: ''مردار سے نفع حاصل نہ کرو۔''[4]

[1] أسد الغابة: 346/3. [2] المعجم الكبير للطبراني: 276/4. [3] سیرت ابن ہشام: 269/4.

[4] سنن أبي داود، اللباس، باب من روى أن لا يستنفع......، حديث: 4128، وجامع الترمذي،

9 نبی ﷺ نے یمن کے شہر جرش کے لوگوں کو کھجور اور کشمش کو اکٹھا بھگونے سے لکھ کر منع کیا تھا۔[1]

اسی طرح نسائی کی روایت میں ہے کہ آپ نے ایسا ہی خط أهل هجر کے نام بھی لکھا تھا۔[2]

10 معاذ رضی اللہ عنہ یمن میں بطور گورنر مقرر تھے۔ مدینہ میں ان کے بیٹے وفات پا گئے تو نبی ﷺ نے انھیں تعزیتی خط لکھا۔[3]

11 نبی ﷺ نے معاذ رضی اللہ عنہ کے نام یمن خط لکھا کہ ہر بالغ مرد وعورت (اہلِ ذمہ) سے ایک دینار جزیہ لیں۔ یہ بھی لکھا کہ بارانی علاقے سے دسویں حصے کی شرح سے عشر لیں اور جو کھیتیاں کنویں وغیرہ سے سیراب کی جائیں ان کی پیداوار سے بیسواں حصہ وصول کریں، نیز گندم، جو، کھجور اور کشمش سے زکاۃ لیا کریں۔[4]

12 حسن بن عمرو سے مروی ہے کہ ایک مرتبہ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اپنے گھر لے گئے، نبی ﷺ کی حدیثوں کی بہت سی کتابیں دکھائیں اور فرمایا کہ یہ میرے پاس لکھی ہوئی کتاب ہے۔[5]

13 نبی ﷺ نے عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے فرمایا تھا:

''میری حدیثیں لکھا کرو۔ اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! اس منہ سے صرف حق ہی نکلتا ہے۔''[6]

اللباس، باب ماجاء في جلود الميتة إذا دبغت، حديث: 1729. (1) صحيح مسلم، الأشربة، باب كراهة انتباذ التمروالزبيب مخلوطين، حديث: 1990. (2) سنن النسائي، الأشربة، باب خليط البسر والتمر، حديث: 5559. (3) تاريخ بغداد: 89/2، وحلية الأولياء: 307/1. (4) مراسيل أبي داود، ص: 134,133، حديث: 117، والمحلى لابن حزم: 12/6,222/5. (5) فتح الباري: 207/1، تحت حديث: 113. (6) سنن أبي داود، العلم، باب كتابة العلم، حديث: 3646.

14 معبد بن ہلال فرماتے ہیں : ہم حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے بکثرت مسائل پوچھتے تھے، پھر ایک دفعہ انھوں نے ایک رجسٹر نکال کر فرمایا: یہ وہ احادیث ہیں جو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی تھیں اور پھر لکھ کر آپ کو پیش کی تھیں۔[1]

15 ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے اور جو کچھ آپ سے سنتے اسے لکھ لیا کرتے تھے۔[2]

16 ایک انصاری (صحابی) احادیث سنتے مگر انھیں یاد نہیں رہتی تھیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں فرمایا: ''اپنے دائیں ہاتھ سے مدد لیا کرو۔''[3] یعنی آپ نے لکھنے کی طرف اشارہ فرمایا۔

منکرین حدیث نے بھی ان احادیث کا سہارا لیا ہے جن میں حدیث لکھنے کی ممانعت ہے۔ وہ روایات درج ذیل ہیں:

1 ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے قرآنِ کریم کے علاوہ مجھ سے کچھ لکھا ہے وہ اسے مٹا دے اور مجھ سے حدیث بیان کرتے رہو، کوئی حرج نہیں۔''[4]

2 صحابہ رضی اللہ عنہم فرماتے ہیں کہ ہم نے (قرآن کریم کے علاوہ) مکتوبات جمع کر کے جلا دیے۔[5]

3 نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک مرتبہ باہر تشریف لائے تو فرمایا: ''کیا لکھتے ہو؟'' ہم نے عرض کیا: احادیث جو آپ سے سنتے ہیں۔ آپ نے فرمایا: ''کیا اللہ تعالیٰ کی کتاب کے علاوہ دوسری کتاب؟

[1] المستدرك للحاكم: 574,573/3، حديث: 6452. [2] مجمع الزوائد: 150/1، حديث: 672. [3] جامع الترمذي، العلم، باب ماجاء في الرخصة فيه، حديث: 2666. [4] صحيح مسلم، الزهد، باب التثبت في الحديث ......، حديث: 3004. [5] مجمع الزوائد : 151/1، حديث: 672.

پچھلی امتیں اسی وجہ سے گمراہ ہوئیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی کتاب کے ساتھ دوسری کتابیں لکھتے تھے۔''[1]

4 زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث ہے اس میں بھی کتابت حدیث سے منع کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔[2]

اسی طرح پرویز صاحب نے ابوبکر رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ آپ نے اپنے مکتوبات احادیث جلا دیے تھے۔ عمر رضی اللہ عنہ بھی استخارہ کرنے کے بعد احادیث کا مجموعہ لکھنے سے رک گئے۔ علی رضی اللہ عنہ نے اپنے خطبے میں احادیث مٹانے کا حکم دیا تھا۔ ان تمام روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ احادیث کی کتابت ممنوع ہے اور جو کتابت ہو چکی تھی اسے مٹایا یا جلایا گیا۔

1 منکرینِ حدیث کی یہ عجیب منطق ہے کہ ایک طرف تو کہتے ہیں کہ احادیث حجت نہیں اور دوسری طرف اپنا مُدّعا ثابت کرنے کے لیے احادیث ہی سے استدلال کرتے ہیں۔

2 ہم نے کتابتِ حدیث کے اثبات کے لیے جو روایات بیان کی ہیں وہ احادیث ممانعتِ کتابت کے ساتھ متعارض ہیں۔ علم اور عقل کا تقاضا یہ ہے کہ تعارض کے وقت جب ایک روایت پر عمل کیا جائے تو دوسری روایت کی ضرور کوئی توجیہ یا وجہ ترجیح بیان کی جاتی ہے لیکن منکرینِ حدیث نے ان روایات سے جن میں کتابتِ حدیث کا ذکر ہے بالکل صرفِ نظر کیا ہے۔ ان احادیث کا ان کے پاس کوئی جواب بھی نہیں۔ یہ بڑی علمی خیانت ہے ہاں، ان کے پاس ایک عذرِ لنگ ہے۔ پرویز صاحب کے مطابق صحابۂ کرام سے جو کتابتِ حدیث کی روایات نقل ہیں ان کے ساتھ نبی ﷺ کی تصدیق نہیں۔ یہ تو

(1) تقييد العلم للخطيب بغدادي:34,33/1. (2) سنن أبي داود، العلم، باب كتابة العلم، حديث:3647.

سراسر جہلِ مرکب کی بات ہے۔ اثباتِ کتابتِ حدیث کے بارے میں جو روایات ہیں ان میں سے بعض کے لیے نبی ﷺ کا حکم موجود ہے۔ بعض میں صحابۂ کرام کا اپنے تحریری ذخیرۂ احادیث کو آپ ﷺ کی خدمت میں پیش کرنے کا ذکر ہے اور بعض میں نبی ﷺ کی طرف سے تشریعی احکام کا تذکرہ ہے۔ اس سے زیادہ تصدیق کی کیا ضرورت ہے؟

3 علمائے امت اور شارحینِ حدیث نے اتفاق کیا ہے کہ احادیث کی کتابت سے ممانعت کا حکم شروع میں دیا گیا تھا تاکہ لوگوں کو قرآنِ کریم کے متعلق کوئی اشتباہ نہ ہو، تاہم بعد میں وہ حکم منسوخ ہو گیا۔[1]

4 احادیث لکھنے کی ممانعت کے متعلق احادیث اکثر ضعیف ہیں جبکہ اثباتِ کتابت کے متعلق احادیث اکثر صحیح ہیں۔

ابو بکر رضی اللہ عنہ کے متعلق روایت، کہ آپ نے اپنی تحریری احادیث کو جلا دیا، کی سند میں علی بن صالح مجہول، محمد بن موسی ضعیف اور موسیٰ بن عبداللہ متکلم فیہ راوی ہے۔

عمر رضی اللہ عنہ کی روایت، کہ انھوں نے اپنی احادیث جلا دی تھیں، بھی سند کے لحاظ سے منقطع ہے۔ اس کے مقابلے میں عمر رضی اللہ عنہ کی صحیح روایت موجود ہے۔ جس میں منقول ہے کہ عمر رضی اللہ عنہ کی لکھی ہوئی احادیث، ان کی اولاد کی طرف منتقل ہوئیں[2]، نیز عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے اس کتاب سے احادیث نقل کر کے ان پر عمل کیا۔ امام دارقطنی نے فرمایا: یہ روایت سند کے لحاظ سے صحیح ہے۔[3]

علی رضی اللہ عنہ کے اس فرمان ''مکتوب احادیث مٹا دو'' والی روایت کا راوی جابر جعفی، کذاب ہے۔ اس کے مقابلے میں علی رضی اللہ عنہ سے مروی صحیح حدیث پہلے بیان کی گئی ہے کہ ان کے پاس صحیفہ تھا جس میں بعض احکام تحریر تھے، لہٰذا منعِ کتابت کے متعلق اس حدیث کو صحیح

---

[1] فتح الباري: 208/1، تحت حديث: 113. [2] الموطأ للإمام مالك، ص: 109. [3] سنن الدارقطني، ص: 200.

روایت کے مقابلے میں پیش کرنا جہل اور حماقت کے سوا کچھ نہیں۔

حدیث مسلم جو ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، وہ اگرچہ امام مسلم رحمہ اللہ کی شرط کے مطابق صحیح ہے لیکن امام بخاری رحمہ اللہ نے اس کی تخریج نہیں کی ہے۔ اس لیے کہ یہ ان کی شرط کے مطابق نہ تھی۔ بہر صورت اس کا اصل جواب وہی ہے جو پہلے ذکر ہُوا کہ احادیث کے لکھنے سے ممانعت کا حکم ابتدا میں تھا بعد میں منسوخ ہوگیا۔

عہدِ صحابہ کرام کے بعد تدوین حدیث

جس طرح حفظِ حدیث کا تسلسل جاری رہا اسی طرح کتابتِ حدیث بھی مسلسل جاری رہی یہاں تک کہ تدوینِ حدیث نے مختلف اقسام کی کتب، مثلاً: مصنفات، مسانید، جوامع، سنن اور معجمات وغیرہ کی صورت اختیار کی اور امت کو احادیثِ رسول کا مجموعہ محفوظ طریقے سے پہنچ گیا۔ ذیل میں جمعِ احادیث کے چند ادوار بیان کیے جاتے ہیں۔

تدوینِ حدیث کا پہلا دور (صحابہ کرام رضی اللہ عنہم)

صحابہ کرام کے تحریری مجموعے

1. صحیفہ صادقہ: عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما کا ہزار احادیث پر مشتمل صحیفہ صادقہ۔ یہ اب مسند احمد میں مکمل طور پر موجود ہے۔ اس صحیفے کی روایت عمرو بن شعیب بن محمد بن عبداللہ بن عمرو بن عاص کے توسط سے پوری طرح منقول ہے اور اکابر محدثین نے اس روایت پر اعتماد کرکے اپنی کتابوں میں نقل کیا ہے۔[1]

[1] تاريخ الحديث والمحدثين، ص: 210.

2 صحیفۂ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ: اس میں صدقات اور زکاۃ کے احکامات درج ہیں۔ امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں: میں نے یہ صحیفہ پڑھا ہے۔ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے جب تدوینِ حدیث کا کام شروع کیا تو یہ صحیفہ انھیں عمر رضی اللہ عنہ کے خاندان سے موصول ہوا۔[1]

3 صحیفۂ عثمان رضی اللہ عنہ: اس صحیفے میں زکاۃ کے احکام درج تھے۔ اس کے متعلق امام بخاری رحمہ اللہ نے کتاب الجہاد میں واقعہ بیان کیا ہے۔

4 صحیفۂ علی رضی اللہ عنہ: اس میں زکاۃ، صدقات، دیت، قصاص، حرمتِ مدینہ، خطبۂ حجۃ الوداع اور اسلامی دستور کے نکات درج تھے۔ یہ صحیفہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بیٹے محمد بن حنفیہ کے پاس تھا، پھر امام جعفر کے پاس آیا اور انھوں نے حارث کو لکھ کر دیا۔[2]

5 مسندِ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ: اس کے بہت سے نسخے عہدِ صحابہ میں لکھے گئے تھے۔ اس کی ایک نقل عمر بن عبدالعزیز کے والد عبدالعزیز بن مروان والیٔ مصر کے پاس تھی۔ عبدالعزیز بن مروان نے کثیر بن مرہ کو لکھا تھا کہ آپ کے پاس صحابۂ کرام کی جتنی مرویات ہیں وہ ہمیں لکھ کر بھیج دیں مگر ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی مرویات بھیجنے کی ضرورت نہیں کیونکہ وہ پہلے ہی ہمارے پاس موجود ہیں۔[3]

اس کے علاوہ صحیفۂ انس، خطبۂ فتح مکہ (جو ابو شاہ کے لیے لکھا گیا تھا)، صحیفۂ جابر بن عبداللہ، مرویات ابن عباس، مرویات عائشہ اور صحیفۂ عمرو بن حزم (جب نبی ﷺ نے یمن کا گورنر مقرر کیا تو انھیں یہ لکھ کر دیا گیا۔ اس صحیفے میں فرائض، سنن، صدقات و دیات اور دیگر 21 فرامین نبویہ شامل ہیں۔) مزید براں رسالۂ سمرہ بن جندب، رسالۂ سعد بن عبادہ اور صحیفۂ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم جس کے بارے میں ان کے بیٹے عبدالرحمٰن نے حلفاً کہا

---

1 الموطأ للإمام مالك، ص: 109. 2 تدوین حدیث برہان دہلی، و صحيح البخاري، العلم، باب كتابة العلم، حديث:111. 3 الطبقات الكبرى لابن سعد: 448/7.

تھا کہ یہ ان کے باپ (عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ) نے اپنے ہاتھ سے لکھا تھا۔[1]

یہ تمام صحیفے، رسالے اور کتب صحابۂ کرام کی تحریریں تھیں جن میں انھوں نے مرفوع احادیث جمع کی تھیں۔

تدوینِ حدیث کا دوسرا دور

خلفائے اربعہ رضی اللہ عنہم کے زمانے میں کثرت سے غزوات کے وقوع اور بعض فتنوں کے ظہور کی بنا پر وہ تدوینِ احادیث کی طرف توجہ نہ کر سکے۔ صرف انفرادی طور پر ان کے پاس مندرجہ بالا صحیفے موجود تھے۔ خلافتِ راشدہ کے بعد عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ صفر 99 ہجری میں خلیفہ بنے جنھیں خلفائے راشدین میں شمار کیا جاتا ہے۔ آپ نے دین کی حفاظت کے لیے تدوین اور جمع حدیث کی طرف توجہ مبذول فرمائی، چنانچہ آپ نے مدینہ طیبہ کے حاکم ابوبکر محمد بن عمرو بن حزم کے نام خط لکھا کہ عمرۃ بنت عبدالرحمٰن اور قاسم بن محمد (دونوں عائشہ رضی اللہ عنہا کے شاگرد تھے اور قاسم بھتیجے بھی تھے۔) کے پاس جو احادیث کا ذخیرہ ہے اسے قلم بند کر لیں۔ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی مرویات ہمارے پاس موجود ہیں انھیں لکھنے کی ضرورت نہیں۔ آپ نے اس کام کے لیے بارہ ماہر محدثین کی ایک کمیٹی بنائی جس کا سربراہ ابن شہاب زہری کو مقرر کیا، اس لیے انھیں مدوّنِ اوّل کہا جاتا ہے۔ ان بارہ محدثین نے احادیث کے الگ الگ مجموعے تیار کر کے عمر بن عبدالعزیز کے پاس بھیج دیے۔ چونکہ ان کا زمانۂ خلافت مختصر تھا، اس لیے آپ ان مجموعات کی تنقیح و تدوین اور انھیں اطراف میں تقسیم کا کام نہ کر سکے۔ جس طرح زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے بذاتِ خود جمعِ قرآن کو ناگوار سمجھا تھا، لیکن پھر اسی کام کے سربراہ رہے، اسی طرح کہا جاتا ہے کہ امام زہری رحمہ اللہ جمعِ حدیث

[1] جامع بیان العلم: 300/1.

کو پسند نہیں کرتے تھے لیکن بایں ہمہ یہی کام انھوں نے بہت محنت سے سرانجام دیا۔ اس کے بعد سلسلۂ تدوین جاری رہا یہاں تک کہ 101 ہجری سے 190 ہجری تک متعدد کتبِ حدیث تیار ہوئیں جن میں سے موطأ امام مالک، جامع سفیان ثوری، جامع ابن مبارک، جامع امام اوزاعی، جامع ابن جریج، کتاب الخراج از امام ابو یوسف اور کتاب الآثار از امام محمد بن حسن شیبانی زیادہ مشہور ہیں اور ان میں سے موطأ اور آخری دو کتب تو اب بھی محفوظ ہیں۔ جب موطأ امام مالک تیار ہوئی تو مدینہ کے ستر علماء اور فقہاء نے اس کی صحت پر اتفاق کیا، اس لیے اس کا نام موطأ رکھا گیا، پھر یہ کتاب امام مالک رحمہ اللہ سے تقریباً ایک ہزار شاگردوں نے سنی اور اسے ضبط تحریر میں لائے۔ فی الوقت وہ تمام مسودات موجود نہیں بلکہ ان میں سے صرف 16 باقی رہ گئے ہیں۔ اب جو متداول نسخہ ہے وہ سب نسخوں سے زیادہ قابل اعتماد ہے۔ یہ یحییٰ بن یحییٰ مصمودی کا مرتب کردہ ہے۔ دوسری صدی ہجری میں چند مسانید منظر عام پر آئیں: مسند ابی ہریرہ، یہ مسند احمد میں مکمل موجود ہے۔ مسند احمد، مسند شافعی، مسند البزار، مسند امام موسیٰ کاظم بن جعفر، مسند ابوسفیان وکیع بن جراح اور مسند امام اوزاعی جو مسند الشامیین کے نام سے مشہور ہے۔ یہ مسانید وہ ہیں جو دوسری صدی ہجری کے اختتام سے پہلے مرتب ہو چکی تھیں۔

تیسری صدی ہجری کا دور

دوسری صدی میں مرفوع اور موقوف دونوں قسم کی احادیث کو جمع کیا گیا تھا لیکن تیسری صدی میں ایسے اہلِ علم اور ائمۂ حدیث پیدا ہوئے جنھوں نے اس بات کا اہتمام کیا کہ مرفوع احادیث کو مستقل حیثیت دی جائے، چنانچہ انھوں نے اپنی کتابوں میں صرف مرفوع احادیث کو جمع کیا۔ ان ائمۂ کرام میں سے چند درج ذیل ہیں۔

امام احمد بن حنبل (متوفی 231 ہجری)، عبداللہ بن موسیٰ، مسدد بصری، اسحاق بن راہویہ، عثمان بن ابی شیبہ، امام محمد بن اسماعیل بخاری (متوفی 256 ہجری) آپ کے شاگردرشید امام مسلم (متوفی 261 ہجری) امام ابوداود (متوفی 275 ہجری) امام ترمذی (متوفی 279 ہجری) امام نسائی (متوفی 302 ہجری) امام دارمی (متوفی 255 ہجری) اور امام ابن ماجہ (متوفی 275 ہجری)۔ اس دور میں سینکڑوں بلکہ ہزاروں کی تعداد میں چھوٹی بڑی کتابیں لکھی گئیں۔

دوسری اور تیسری صدی ہجری میں اللہ تعالیٰ نے ایسے ائمہ بھی پیدا فرمائے جنھیں اللہ تعالیٰ نے نقدو جرح کی پوری استعداد سے نوازا۔ انھوں نے حدیث کے راویوں کی پوری جانچ پرکھ کرتے ہوئے صحیح اور ضعیف احادیث کو الگ الگ کردیا اور اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے بے شمار محدثین پیدا فرمائے جنھوں نے ضعیف اور موضوع روایات کو الگ الگ جمع کیا۔

حاصل بحث: اس تفصیل سے واضح ہوا کہ جیسے اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کی حفاظت، حفظ اور کتابت کے ذریعے سے فرمائی، اسی طرح احادیث کی حفاظت بھی انھی دوطریقوں سے فرمائی۔ فرق صرف یہ ہے کہ ہم قرآن کریم کے الفاظ کی تلاوت کے مکلّف ہیں، جیسا کہ لفظ ''اِقْرَأْ'' ''اُتْلُ'' ''رَتِّلْ'' اور ''اُتْلُو الْقُرْآنَ'' اس پر دلیل ہیں۔ قرآنی الفاظ کی جگہ معنی ادا کرنا اور دوسری لغت میں تبدیل کرنا جائز نہیں۔ اس کے برعکس احادیث کے الفاظ کی تلاوت کے ہم مکلّف نہیں کیونکہ یہ ایک استحبابی حکم ہے، لہٰذا الفاظِ حدیث کی جگہ روایت بالمعنی اکثر محدثین کے نزدیک جائز ہے لیکن اس کے لیے خاص شرائط ہیں۔ اصولِ حدیث کے علماء نے وہ شرائط تفصیل کے ساتھ لکھی ہیں۔ مضمونِ حدیث تبدیل کرنا ہرگز جائز نہیں۔

پرویزی فرقے سے سوال کیا جاسکتا ہے کہ قرآن کی حفاظت، اس کا جمع کرنا اور اس کی تدوین، احادیث سے ثابت کرنا درست ہے تو پھر احادیث کی حفاظت بذریعۂ حفظ و کتابت کیوں قابل اعتراض ہے؟ اس کی مثال ایک عالم نے اس طرح پیش کی ہے کہ کوئی شخص کسی کنویں سے ایک ڈول پانی نکال کر پیئے اور کہے کہ پانی صاف اور میٹھا ہے لیکن جب وہ دوسرا ڈول اسی کنویں سے نکالے تو کہے کہ پانی گندا اور کھارا ہے۔ کیا یہ شخص دیوانہ اور پاگل نہیں کہلائے گا؟ اسی لیے ہم کہتے ہیں کہ جب ثابت ہوا کہ قرآن اور حدیث دونوں محفوظ ہیں اور اللہ تعالیٰ نے ان کی حفاظت کی ہے تو پھر حفاظت کا مقصد صرف تلاوت ہی نہیں بلکہ اس کو حجت سمجھ کر اس کے احکام پر عمل کرنا مسلمانوں کے لیے لازمی ہے۔

حجیتِ حدیث سے انکار، قرآن کی حجیت سے انکار ہے

گزشتہ ابواب میں ثابت کیا گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی اطاعت اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے۔ رسول اللہ ﷺ قرآن کریم کے شارح ہیں، اور قرآن کریم کی طرح حدیث بھی محفوظ ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی احادیث دین میں حجت ہیں اور یہ حجیتِ حدیث قرآن کریم نے ثابت کی ہے۔ جو شخص حجیتِ حدیث نہیں مانتا وہ دراصل قرآن کریم کو نہیں مانتا۔

حجیتِ حدیث قرآن کریم کی روشنی میں

1 اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ﴾

"ان سب رسولوں کو ہم نے خوش خبری دینے اور (منکروں کو عذاب سے) ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے تاکہ رسولوں کے آنے کے بعد لوگوں کے پاس اللہ کے خلاف کوئی اعتراض باقی نہ رہے۔"[1]

آیت کا ظاہری مقصد یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ رسول نہ بھیجتا تو اللہ تعالیٰ اور اس کے

[1] النسآء 165:4.

احکام کے منکر لوگ اللہ تعالیٰ کے خلاف اعتراض کرتے کہ اس نے رسول نہیں بھیجا تھا جس کی وجہ سے ہم گمراہ ہو گئے، لہٰذا آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں کو لوگوں پر حجت بنا کر بھیجا لیکن رسولوں کی ذات بطور ذات حجت نہیں بلکہ وہ رسالت کی جس صفت سے متصف ہیں وہ حجت ہے اور آپ کی رسالت میں آپ کی تمام احادیث داخل ہیں۔ مذکورہ آیت میں کتاب اللہ کا ذکر نہیں کیونکہ رسالت، وحی جلی اور وحی خفی دونوں کو شامل ہے، لہٰذا معلوم ہوا کہ جو شخص احادیثِ رسول کو حجت نہیں مانتا وہ اس آیت کریمہ کا بھی منکر ہے۔

2 اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ ﴾

”اور کسی مومن مرد اور کسی مومن عورت کے لیے جائز نہیں کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی بات کا فیصلہ کر دیں تو وہ اپنے کسی معاملے میں اپنی طرف سے کوئی اختیار استعمال کریں۔“[1]

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کے حکم و فیصلہ کو مسلمانوں کے اختیارات پر حاکم اور غالب قرار دیا، یعنی آپ ﷺ کے حکم کے سامنے کسی کا اختیار نہیں چلتا۔ اس حاکمیت اور غلبے کا مقصد حجیت ہے، لہٰذا رسول اللہ ﷺ کا حکم و فیصلہ لوگوں پر حجت ہے اس سے نافرمانی کرنے کی کوئی اجازت نہیں۔ اس آیت کی تفسیر میں مفسرین نے زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ زینب رضی اللہ عنہا کے نکاح کا تذکرہ کیا ہے۔ نبی ﷺ کا حکم تھا کہ زینب رضی اللہ عنہا کا نکاح زید رضی اللہ عنہ سے کیا جائے اور یہ حکم حدیث ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے حجت قرار دیا

[1] الأحزاب 36:33.

ہے، لہٰذا جو شخص حجیتِ حدیث کو نہیں مانتا وہ اس آیت کریمہ کو بھی نہیں مانتا۔

3 اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا ۝ ﴾

''اور ہم ہرگز عذاب نہیں بھیجتے حتی کہ کوئی رسول بھیج دیں۔''[1]

یعنی اللہ تعالیٰ پہلے رسول مبعوث کرتا ہے اور اگر کوئی قوم رسول کی نافرمانی کرتی ہے تو پھر اللہ تعالیٰ اس نافرمان قوم پر عذاب بھیجتا ہے۔ اللہ تعالیٰ رسول کی رسالت کو ان پر حجت بناتا ہے۔ اگر وہ اس حجت سے انکار کردیں تو اللہ تعالیٰ ان پر عذاب نازل کرتا ہے۔ سابقہ آیت میں کتاب اللہ کا ذکر نہیں فرمایا بلکہ صرف رسول کا ذکر کیا ہے۔ پہلے بیان کیا جاچکا ہے کہ رسول کی صفتِ رسالت میں وحی جلی اور وحی خفی دونوں شامل ہیں، لہٰذا اس سے ثابت ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کی رسالت اور آپ کی احادیث پوری امت پر حجت ہیں اور جو شخص اس کی حجیت سے انکار کرتا ہے وہ دراصل اس آیت کا منکر اور عذاب کا مستحق ہے۔

4 اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ﴾

''اور جو کوئی رسول کی مخالفت کرے۔ اس کے بعد کہ اس کے لیے سیدھا راستہ خوب واضح ہو چکا اور مومنوں کی راہ کے علاوہ کسی دوسری راہ پر چلنے لگے تو ہم اسے اسی طرف پھیر دیں گے جس طرف وہ پھرے گا اور اسے جہنم میں داخل کریں گے۔''[2]

اس آیت میں صرف رسول اور اس کی ہدایت کا ذکر کیا گیا ہے، کتاب اللہ کا ذکر نہیں کیا گیا کیونکہ ''مُشاقَّة'' دراصل عملی مخالفت کو کہا جاتا ہے، یعنی رسول اللہ ﷺ نے جو

[1] بنیٓ إسرآءیل 15:17۔ [2] النسآء 115:4۔

اعمال کیے اگر کوئی شخص ان کی خلاف ورزی کرتا ہے تو اس کے لیے وعید اور تخویف ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے اعمال احادیث میں مذکور ہیں۔ لفظ ﴿الْهُدٰى﴾ بھی عام ہے اور کتاب اللہ اور حدیث دونوں ہدایت کے سرچشمے ہیں۔ اس ہدایت کی مخالفت جہنم میں داخل ہونے کا سبب بنتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے اعمال اور ہدایت کی مخالفت کرنے والا اس کی حجیت سے انکار کرتا ہے، لہٰذا منکرینِ حجیتِ حدیث اس آیت کے منکر ہیں۔

5 اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖٓ اَنْ تُصِيْبَهُمْ فِتْنَةٌ اَوْ يُصِيْبَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝﴾

”پس وہ لوگ جو اس (رسول) کے حکم کی مخالفت کرتے ہیں انھیں اس بات سے ڈرنا چاہیے کہ ان پر کوئی مصیبت آ پہنچے یا انھیں دردناک عذاب آ پہنچے۔“[1]

اس آیت میں لفظ ﴿اَمْرِهٖٓ﴾ پر غور فرمائیں۔ ابن کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا کہ یہ لفظ نبی ﷺ کی شریعت، سنت اور آپ کی احادیث قولیہ وفعلیہ سب کو شامل ہے۔ یہاں بھی کتاب اللہ کی تخصیص نہیں فرمائی، لہٰذا اس آیت کا مقصد یہ ہے کہ جو شخص بھی آپ کے امر، یعنی آپ ﷺ کی کسی سنت یا حدیث کی مخالفت کرے گا وہ ضرور کسی نہ کسی آفت اور عذاب سے دوچار ہوگا۔ امرِ رسول ﷺ (حدیث وسنت) دین میں حجت نہیں تو پھر اس کی مخالفت عذاب کا باعث کیونکر ہوسکتی ہے؟ ثابت ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کی احادیث دین میں حجت ہیں اور جو شخص اس حجیت کا منکر ہے، وہ اس آیت اور قرآن کا منکر ہے۔

6 اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

[1] النور 63:24.

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَن كَانَ يَرْجُو اللَّهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ﴾

''بلاشبہ تمھارے لیے رسول (ﷺ) کی زندگی میں بہترین نمونہ ہے، (پیروی کے لیے) ایسے شخص کے لیے جو اللہ تعالیٰ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتا ہے۔''[1]

اس آیت میں لفظ ﴿رَسُولِ اللَّهِ﴾ ایک جامع لفظ ہے جو نبی ﷺ کی ساری زندگی کو محیط ہے۔ اس میں آپ کی قولی اور فعلی تمام احادیث شامل ہیں۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتا ہے، اس پر یہ لازم ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی پوری زندگی کو نمونہ بنائے اور یہ تب ممکن ہے کہ وہ نبی ﷺ کی احادیث کو حجت کی حیثیت سے مان لے۔ اگر وہ انھیں حجت تسلیم نہیں کرتا یا اپنی خواہش کے تابع ''تحقیق'' کرتا ہے تو ایسا شخص اس آیت کریمہ کا منکر ہے۔

7 اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَيَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلَىٰ يَدَيْهِ يَقُولُ يَا لَيْتَنِي اتَّخَذْتُ مَعَ الرَّسُولِ سَبِيلًا﴾

''اور جس روز نافرمان شخص اپنے ہاتھ کاٹے گا اور کہے گا: اے کاش! میں نے رسول اللہ (ﷺ) کا راستہ اختیار کیا ہوتا۔''[2]

اس آیتِ کریمہ میں اس شخص کے افسوس اور حسرت کا ذکر کر کے اسے ظالم قرار دیا جس نے اپنی زندگی میں رسول اللہ ﷺ کا راستہ چھوڑ دیا۔ یہاں سبیلِ رسول کا ذکر کیا گیا ہے جو آپ کی تمام زندگی کو محیط ہے اور آپ کی اس زندگی کی تفصیلات آپ کی احادیث میں موجود ہیں۔ یہ صریح دلیل ہے کہ سبیلِ رسول حجت ہے لیکن جس نے اسے حجت تسلیم نہیں کیا اور اس کا اتباع نہیں کیا وہ حجیتِ احادیث کا منکر ہے اور اس آیت کا منکر اور ظالم ہے، نیز ارشاد فرمایا:

[1] الأحزاب 21:33. [2] الفرقان 27:25.

﴿يَوَيْلَتٰى لَيْتَنِيْ لَمْ أَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِيْلًا ۝﴾

''ہائے میری کم بختی! کاش! میں نے فلاں کو دوست نہ بنایا ہوتا۔''[1]

''فلاں'' سے وہ شخص مراد ہے جس نے رسول اللہ ﷺ کی حدیث کی حجیت سے انکار کر کے لوگوں کو گمراہ کیا۔

حجیتِ حدیث عقلی دلائل کی روشنی میں

ہم نے نقلی دلائل کے طور پر چند آیات کریمہ پیش کیں، اب کچھ عقلی دلائل ملاحظہ فرمائیں:

① **احادیث قرآن کی عملی تفسیر:** قرآن کریم نبی ﷺ پر نازل ہوا، آپ نے اسے امت تک پہنچایا، اسے سکھایا اور اس پر عمل کر کے دکھایا۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ عملی تفسیر جو ذخیرۂ احادیث میں موجود ہے اللہ تعالیٰ کے منشا کے مطابق تھی یا مخالف؟ اگر مخالف ہو تو پہلا اعتراض اللہ تعالیٰ پر وارد ہوتا ہے کہ اس نے ایسا رسول کیوں بھیجا جس نے عمدًا یا سہوًا اللہ تعالیٰ کے منشا کے خلاف کام کیا؟ اس طرح تمام مسلمان بھی اس کی زد میں آتے ہیں کہ جب ان کے دین اسلام کی بنیاد غلط ہے تو کیا اسلام صحیح دین ہو سکتا ہے؟ لہٰذا ہمیں لازمًا کہنا پڑے گا کہ عملی تفسیر اللہ تعالیٰ کے منشا کے عین مطابق ہے۔ اب جو شخص (منکرینِ حدیث کی طرح) اس تفسیر سے اختلاف کرتا ہے، اس کا انکار کرتا ہے یا اسے حجت تسلیم نہیں کرتا تو ایسا شخص یقینًا دیوانہ، عقل سلیم سے عاری اور پاگل ہے۔ وہ اپنی بے جا تاویلات کی بنا پر امت میں انتشار پیدا کرتا ہے۔ یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ احادیث قرآن کریم کی تفسیر ہیں، لہٰذا وہ حجت ہیں اور ان کا انکار قرآن سے انکار ہے۔

① الفرقان 28:25.

2 **تعامل امت یا اجماع امت:** مطلب یہ ہے کہ دورِ نبوی سے لے کر آج تک ہر دور میں کروڑوں مسلمان احادیثِ نبویہ پر عمل کرتے چلے آئے ہیں۔ ان کے درمیان اصول ومبادی میں کوئی اختلاف نہیں۔ اگر کوئی فروعی اختلاف ہے تو وہ اجتہاد کے ساتھ تعلق رکھتا ہے، یعنی ایسے مسائل میں اختلاف جو کتاب وسنت سے نص صریح کے ذریعے سے ثابت نہ ہوں یا احادیث کے دفعِ تعارض میں مجتہدین میں اختلاف ہے کہ کسی نے ایک حدیث کو معمول بہ قرار دیا تو کسی نے دوسری حدیث کو لیکن وہ سب حجیتِ حدیث میں متفق ہیں۔

3 **موضوع احادیث کا وجود:** موضوع احادیث کا وجود حجیتِ احادیث کے لیے ایک قوی دلیل ہے جس کا منکرینِ حدیث بھی انکار نہیں کر سکتے۔ وہ اس طرح کہ اگر احادیث شرعی حجت نہ ہوتیں تو پھر احادیث گھڑنے کا کیا فائدہ؟ جب اصلی سکے کی بازار میں قدر و قیمت ہوگی تو کھوٹے سکے بنائے جائیں گے۔ منکرینِ حدیث بھی اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ ایک دور ایسا آیا کہ جب موضوع روایات کا سیلاب امڈ آیا تھا جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اس وقت تک امت کی اکثریت حجیتِ احادیث کی قائل تھی، ابتدائی دور میں منکرینِ حدیث کا مشہور خطیب جاحظ معتزلی موضوع احادیث گھڑا کرتا تھا تاکہ اس کے ذریعے سے اپنا بدعی عقیدہ ثابت کرے۔ اسی طرح اب ادارۂ طلوعِ اسلام نے اپنی غلط باتوں کو مستند بنانے کے لیے کئی من گھڑت احادیث کا سہارا لیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے وہ معاشرہ متشکل کیا جو قرآنی نظام ربوبیت کا حامل تھا۔[1]

یہ اصطلاح احادیث یا تاریخ کی کون سی کتاب میں ہے؟ یہ وضع کردہ لفظ رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کرنا موضوع احادیث کے زمرے میں آتا ہے، اسی طرح پرویز

[1] قرآنی نظام ربوبیت، ص:180.

صاحب نے کہا: یہ قرآن بعینہ اسی شکل وترتیب میں جو اس وقت ہمارے پاس موجود ہے لاکھوں مسلمانوں کے پاس موجود تھا اس کی مستند کاپی مسجد نبوی میں ایک ستون کے قریب صندوق میں رکھی رہتی تھی جس میں آپ سب سے پہلے وحی لکھوایا کرتے تھے۔[1]

اس بات کا ذکر تاریخِ اسلام یا حدیث کی کس کتاب میں ہے؟ یہ من گھڑت اور بے سروپا بات اپنی طرف سے وضع کر کے نبی ﷺ کی طرف منسوب کر دی، لہٰذا یہ بھی موضوع روایت ہے۔

[1] طلوع اسلام، فروری 1982ء، ص: 112.

باب 8

قرآن کی تفسیر اور حدیث کی تصحیح میں عقل پرستی باعثِ گمراہی ہے

عقل اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک عظیم نعمت ہے جس کی وجہ سے انسان دوسرے حیوانات سے خاص امتیاز رکھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حیوانات کو بھی کچھ سمجھ بوجھ دے رکھی ہے جسے شعور کہتے ہیں، یعنی ظاہری حواس سے چیزوں کو معلوم کرنا۔ ان چیزوں میں تو انسان دیگر حیوانات کے ساتھ شریک ہے لیکن حواس سے ماورا چیزوں کو معلوم کرنا عقل کا کام ہے جو حیوانات میں موجود نہیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ہر نعمت کے استعمال کا طریقہ بھی بتادیا ہے۔ اگر اسے صحیح طریقے سے استعمال کیا جائے تو وہ چیز فائدہ مند ہو جاتی ہے اور انسان اس نعمت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کا شکرگزار بن جاتا ہے اور اگر استعمال میں بتائے ہوئے طریقے سے انحراف کیا جائے تو وہ حقیقت میں اس نعمت کا ضیاع بن جاتا ہے۔ اس وقت اس نعمت کا صرف نام ہی باقی رہ جاتا ہے بلکہ کبھی تو اللہ تعالیٰ اس نعمت کو سلب بھی کرلیتا ہے۔ عقل کے استعمال کے دو طریقے ہیں۔ ایک وہ طریقہ ہے جس سے عقل کے منافع وفوائد حاصل کیے جاتے ہیں جبکہ دوسرا طریقہ وہ ہے جس میں مفاسد عقل کا ظہور ہوتا ہے۔ پہلا طریقۂ استعمال یہ ہے کہ عقل کو آسمانی وحی کے تابع بنایا جائے بلکہ یہ عادت الٰہیہ ہے کہ نفسی قوتوں کو آفاقی قوتوں کے ساتھ مربوط کیا ہے جیسا کہ آواز سننے کا تعلق ہوا کے ساتھ ہے، یعنی ہوا کے ذریعے سے آواز کان تک پہنچتی ہے اور اگر ہوا بند

ہو جائے تو قوت سامعہ کام نہیں کر سکتی۔ اسی طرح آنکھ کے ذریعے سے چیزوں کو دیکھا جاسکتا ہے لیکن شرط یہ ہے کہ بیرونی روشنی حاصل ہو۔ دن میں سورج کی روشنی کے ساتھ اور رات میں چاند ستاروں یا مصنوعی روشنی کے ساتھ ہی دیکھا جا سکتا ہے۔ اگر بیرونی روشنی نہ ہو تو آنکھ کی قوت بصر بھی کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتی۔

اسی طرح عقل بھی ایک نفسی قوت ہے جو بصیرت اور باطنی روشنی کا کام دیتی ہے بشرطیکہ اسے وحیِ الٰہی کا تعاون حاصل ہو، یعنی عقل روشنی کا کام دے سکتی ہے بشرطیکہ وحی کی روشنی موجود ہو، لہٰذا اگر عقل کو وحی کی روشنی میں استعمال کیا جائے تو بہت فائدہ ہے اور اگر اسے وحی کے بغیر استعمال کیا جائے تو اس پر بہت سے مفاسد مرتب ہوتے ہیں۔ اب یہاں دو عنوان قائم کر کے اس مسئلے کو مزید واضح کیا جاتا ہے۔

عقل کے منافع

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں تعقل، تفکر اور تدبر کی طرف بہت سی ترغیبات دی ہیں۔ تعقل کا مطلب یہ ہے کہ عقل سے کام لیا جائے، تفکر کا مطلب یہ ہے کہ عقل استعمال کرنے کے کچھ نتائج برآمد ہوں اور تدبر یہ ہے کہ ان برآمدہ نتائج کے تمام اطراف و جوانب، پس و پیش، عواقب اور حکمتوں کو ظاہر کیا جائے۔ درج ذیل آیات میں اللہ تعالیٰ نے تعقل کی ترغیب دلائی ہے۔

1 فرمایا:

﴿وَيُرِيكُمْ آيَاتِهِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ﴾

”وہ تمھیں اپنی آیات (نشانیاں) دکھاتا ہے تاکہ تم عقل سے کام لو۔“[1]

[1] البقرة 73:2.

یعنی وہ تمھیں بعث بعد الموت کے لیے دنیوی زندگی میں سے بعض نمونے دکھاتا ہے تاکہ تم عقل سے کام لو۔

2 فرمایا:

﴿ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝ ﴾

''یہ وہ باتیں ہیں جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ تمھیں حکم دیتا ہے تاکہ تم سمجھو۔''[1]

3 نیز فرمایا:

﴿ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝ ﴾

''بے شک ہم نے اس قرآن کو عربی زبان میں اتارا ہے تاکہ تم سمجھو۔''[2]

4 نیز فرمایا:

﴿ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝ ﴾

''اسی طرح اللہ تمھارے لیے احکام کھول کھول کر بیان کرتا ہے تاکہ تم سمجھو۔''[3]

ان آیات اوران کے سیاق وسباق سے واضح طور پر معلوم ہوا کہ آیات الٰہیہ دکھانے، دینی احکام بتانے، انسانی آداب بیان کرنے اور قرآن کریم نازل کیے جانے کے بعد انسان اپنی عقل استعمال کرے، یعنی وحی کی حدود میں رہتے ہوئے عقل سے کام لیا جائے۔

درج ذیل آیات کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے فکر کرنے کی ترغیب دلائی ہے۔فرمایا:

﴿ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ۝ ﴾

''اسی طرح اللہ تمھارے لیے اپنے احکام کھول کھول کر بیان کرتا ہے تاکہ تم غورو فکر کرو۔''[4]

یعنی اللہ تعالیٰ نے شراب اور جوئے کے منافع اور مفسدات خود بیان کیے، پھر مفسدات

[1] الأنعام 151:6. [2] یوسف 2:12. [3] النور 61:24. [4] البقرة 219:2.

کی کثرت بیان کی اور اس کے بعد منافع ومفسدات کی تفصیل معلوم کرنے کے لیے تفکر کی طرف ترغیب دلائی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿قُلْ هَلْ يَسْتَوِى الْأَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ ۭ اَفَلَا تَتَفَكَّرُوْنَ ۝﴾

''کہہ دیجیے: کیا اندھا اور بینا برابر ہو سکتے ہیں؟ تو کیا تم غور وفکر نہیں کرتے؟''[1]

یعنی اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں کافروں اور مومنوں کے احوال کا تقابل فرمایا ہے۔ اب تمھاری ذمہ داری ہے کہ فکر کرو اور کافروں کے طرز عمل سے اپنے آپ کو بچاؤ۔ ایک جگہ فرمایا:

﴿وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ۝﴾

''اور ہم نے آپ پر ذکر (قرآن) اتارا تاکہ آپ لوگوں کے لیے واضح کردیں جو کچھ ان کی طرف نازل کیا گیا اور تاکہ وہ غور وفکر کریں۔''[2]

اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ترتیب کے ساتھ تین چیزوں کا ذکر فرمایا ہے: قرآن کریم، نبی ﷺ کی طرف سے اس کی تشریح، یعنی قولی اور فعلی احادیث اور غور وفکر، یعنی اجتہاد۔

ان ساری آیات میں اللہ تعالیٰ نے وحی کے بعد فکر کرنے کی دعوت دی ہے اور یہ عقل استعمال کرنے کا دوسرا مقام ہے۔

درج ذیل آیات کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے تدبر کرنے کی ترغیب دی ہے۔ فرمایا:

﴿كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝﴾

''ہم نے یہ بابرکت کتاب آپ کی طرف نازل کی ہے تاکہ وہ (لوگ) اس کی آیات میں تدبر کریں اور عقل مند لوگ اس سے نصیحت حاصل کریں۔''[3]

[1] الأنعام 50:6. [2] النحل 44:16. [3] صٓ 29:38.

یعنی قرآن کریم کی آیات پر یقین کرکے تدبر کریں اور صرف تدبر پر ہی اکتفا نہ کریں بلکہ اس سے نصیحت قبول کریں۔ مزید فرمایا:

﴿ اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ؕ وَلَوْ کَانَ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِیْهِ اخْتِلَافًا کَثِیْرًا ۝ ﴾

''تو کیا وہ قرآن میں غور وفکر نہیں کرتے؟ اور اگر اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو وہ یقیناً اس میں بہت زیادہ اختلاف پاتے۔''[1]

یعنی قرآن کریم کی فصاحت و بلاغت، حق گوئی و کمال ہدایت، اس کے معانی اور غیر متناقض مقاصد میں تدبر کرنے سے یقیناً واضح ہوتا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے۔

مزید فرمایا:

﴿ اَفَلَمْ یَدَّبَّرُوا الْقَوْلَ ﴾

''کیا پھر انھوں نے اس کلام میں تدبر نہیں کیا؟''[2]

نیز فرمایا:

﴿ اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ﴾

''کیا پھر یہ لوگ قرآن میں تدبر نہیں کرتے؟''[3]

مندرجہ بالا آیات سے واضح ہوا کہ تفکر اور تدبر کے لیے عقل سے کام لینا آیات الٰہیہ کی حقانیت، قرآن کریم اور رسول اللہ ﷺ کی صداقت کے لیے یقیناً مفید کام ہے لیکن سورۂ نحل کی آیت نمبر 44 کی ترتیب کا لحاظ رکھنا ضروری ہے، یعنی قرآن کریم کی شرح (حدیث وسنت) تسلیم کرنے کے بعد سمجھ بوجھ اور غور وفکر مفید ہوگا اور یہ عقل کا جائز اور مناسب مقام ہے۔

[1] النسآء 4:82۔ [2] المؤمنون 23:68۔ [3] محمد 47:24۔

عقل کے مفاسد

وحی کے بغیر اگر عقل کا استعمال ہو تو ایسی عقل کو مفسد (نقصان دہ) عقل کہا جا سکتا ہے کیونکہ جب بھی کسی نے عقل کو وحی کی روشنی کے بغیر استعمال کیا تو اس کے نتیجے میں بہت سے مفاسد ظاہر ہوئے۔ اس کی کئی مثالیں ہمارے سامنے موجود ہیں۔

① جب نص صریح کے ذریعے ابلیس کو حکم دیا گیا کہ آدم علیہ السلام کو سجدہ کرو تو اس نے وحی پر عمل کرنے کے بجائے اپنی عقل کو استعمال کرتے ہوئے کہا:

﴿ أَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ۖ خَلَقْتَنِي مِن نَّارٍ وَخَلَقْتَهُ مِن طِينٍ ۝ ﴾

''میں اس سے بہتر ہوں کیونکہ تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا اور اسے تو نے مٹی سے پیدا کیا ہے۔''[1]

اور اس عقلی استدلال کا دوسرا جملہ پوشیدہ ہے اور وہ یہ کہ ''آگ مٹی سے بہتر ہے۔'' جبکہ یہ دلیل حقیقت کے خلاف اور منافی ہے کیونکہ اگر آگ اور مٹی کے منافع کا تقابل کیا جائے تو یقیناً معلوم ہوگا کہ مٹی کے منافع وفوائد آگ سے زیادہ ہیں، نیز اس کی یہ دلیل اس وجہ سے بھی باطل ہے کہ یہ نص الٰہی کے مقابل اور مخالف ہے۔ پس وحی کے مقابلے میں عقل استعمال کرنے کی وجہ سے ابلیس ذلت اور لعنت کا مستحق ٹھہرا۔ اسی وجہ سے علماء نے لکھا ہے: ''سب سے پہلے ابلیس نے نص کے مقابلے میں قیاس سے کام لیا۔''

② بنی اسرائیل نے اپنے نبی سے مطالبہ کیا کہ جہاد کرنے کے لیے ان کا امیر مقرر فرما دیں تو اللہ تعالیٰ نے اس نبی کی وساطت سے طالوت کو ان کا امیر مقرر فرمایا لیکن بنی اسرائیل نے اس نص شرعی کے مقابلے میں اپنی عقل کو استعمال کیا اور کہا کہ ہم نسب اور مال کے لحاظ سے طالوت کی نسبت امارت کے زیادہ اہل ہیں، یعنی ان کے نزدیک امارت

① الأعراف 7:12.

اور سیاست کا تعلق سرمایہ داری کے ساتھ تھا، جیسا کہ ان کے ہاں اب بھی یہی نظام رائج ہے۔ نصِ شرعی کے مقابلے میں اپنی عقل استعمال کرنے کی وجہ سے یہی لوگ نہر عبور کرتے وقت پانی نہ پینے کی آزمائش میں ناکام ہوکر ذلیل اور گناہ گار بن گئے۔[1]

3 یہ بات مسلمہ اور تاریخ سے ثابت ہے کہ یونان کے حکماء بڑے سائنس دان اور فلسفی تھے۔ طبعیات اور ریاضی کے امام سمجھے جاتے تھے لیکن اس کے باوجود ان میں سے اکثر کفر و شرک میں مبتلا تھے جن میں سے ارسطو کا نام مشہور و معروف ہے۔ اس طرح اب بھی بڑے بڑے ایسے سائنس دان موجود ہیں جنھوں نے عقل کے ذریعے سے دنیوی زندگی میں ترقی کے لیے نمایاں کردار ادا کیا ہے لیکن ان میں سے جو لوگ وحیِ الٰہی کی روشنی سے محروم ہیں وہ کفر و شرک اور گمراہی میں مبتلا ہیں۔ ایسے ہی لوگوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ يَعْلَمُونَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيَوٰةِ الدُّنْيَا ۖ وَهُمْ عَنِ الْآخِرَةِ هُمْ غَٰفِلُونَ ۝ ﴾

”وہ دنیاوی زندگی کے ظاہر ہی کو جانتے ہیں اور وہ آخرت کی طرف سے یکسر غافل ہیں۔“[2]

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اس قسم کے لوگوں کے بارے میں فرمایا:

﴿ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيلِ وَكَانُوا مُسْتَبْصِرِينَ ۝ ﴾

”شیطان نے انھیں سیدھی راہ سے روک دیا، حالانکہ وہ (دنیوی ترقی میں) بہت ہوشیار تھے۔“[3]

لیکن اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کو عقل مند قرار نہیں دیا کیونکہ حقیقت میں عقل وہ ہے جو وحی کے تابع ہو جبکہ ان لوگوں نے وحی کی مخالفت کی تو اللہ تعالیٰ نے دو طریقوں سے ایسے لوگوں کی عقل کی نفی فرمائی۔

---

[1] دیکھیے: البقرۃ 2:247-252. [2] الروم 30:7. [3] العنکبوت 29:38.

مطلق نفیِ عقل

اللہ تعالیٰ نے عام کافروں کے متعلق فرمایا:

﴿صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ۝﴾

''وہ بہرے، گونگے، اندھے ہیں، لہٰذا وہ عقل نہیں رکھتے۔''[1]

نیز فرمایا:

﴿قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ۝﴾

''کہہ دیجیے: تمام تعریف اللہ ہی کے لیے ہے۔ بلکہ ان میں سے اکثر عقل نہیں رکھتے۔''[2]

اہل کتاب کے متعلق فرمایا:

﴿تَحْسَبُهُمْ جَمِيْعًا وَّ قُلُوْبُهُمْ شَتّٰى ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْقِلُوْنَ ۝﴾

''تم ان کو متحد خیال کرتے ہو، حالانکہ ان کے دل جدا جدا ہیں، اس لیے کہ وہ ایسے لوگ ہیں جو عقل نہیں رکھتے۔''[3]

منافقوں کے متعلق فرمایا:

﴿اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ ۝﴾

''بے شک اللہ کے نزدیک بدترین حیوان وہ بہرے گونگے لوگ ہیں جو عقل نہیں رکھتے۔''[4]

کسی خاص وجہ سے نفیِ تعقل

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

① البقرة 171:2. ② العنكبوت 63:29. ③ الحشر 14:59. ④ الأنفال 22:8.

﴿ اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝﴾

''کیا تم لوگوں کو تو نیکی کا حکم کرتے ہو اور اپنے آپ کو بھلا دیتے ہو، حالانکہ تم کتاب الٰہی پڑھتے ہو کیا تم عقل نہیں رکھتے؟''[1]

اس آیت سے واضح ہوا کہ علم پر عمل نہ کرنا بے عقلی ہے۔ایک موقع پر فرمایا:

﴿ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تُحَآجُّوْنَ فِيْۤ اِبْرٰهِيْمَ وَمَاۤ اُنْزِلَتِ التَّوْرٰىةُ وَالْاِنْجِيْلُ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِهٖ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝﴾

''اے اہل کتاب! تم ابراہیم (علیہ السلام) کے بارے میں کیوں جھگڑتے ہو؟ حالانکہ تورات اور انجیل تو ان کے بعد نازل کی گئی تھیں کیا تم عقل نہیں رکھتے؟''[2]

یعنی ملت ابراہیمی کے متعلق جھگڑنا بے عقلی ہے۔اور فرمایا:

﴿ وَلَلدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝﴾

''البتہ آخرت کا گھر ان کے لیے بہت بہتر ہے جو متقی ہیں تو کیا تم عقل نہیں رکھتے؟''[3]

یعنی دنیا کو آخرت اور جنت کے مقابلے میں پسند کرنا بے عقلی ہے۔

اسی طرح اختصار کے ساتھ چند آیات کے حوالے پیش کیے جاتے ہیں جن میں کچھ افعال اور صفات مذمومہ کو بے عقلی سے تعبیر کیا گیا ہے۔

رسول کا انکار کرنا (یونس 16:10) قرآن کریم کا انکار کرنا (الأنبیآء 10:21) بتوں کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک کرنا (الأنبیآء 67:21) شرعی اذان کے ساتھ استہزا کرنا (المآئدۃ 58:5) اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھنا (المآئدۃ 103:5) اللہ تعالیٰ کی مخلوق پر غور وفکر نہ کرنا۔(یٰسٓ 68:36) اور رسول اللہ ﷺ کی بے ادبی کرنا (الحجرات 4:49)

پس معلوم ہوا کہ مذکورہ اعتقادات واعمال کا، جو بذریعۂ وحی ثابت ہیں، تمسخر اڑانا اور ان

[1] البقرۃ 44:2. [2] آل عمران 65:3. [3] الأنعام 32:6.

پر عمل ترک کر کے صرف اپنی عقل و دانش کو کافی سمجھنا بے عقلی اور احمق پن کے مظاہر ہیں۔

حاصل بحث: اللہ تعالیٰ نے عقلِ انسانی کو وحیِ الٰہی کے تابع بنایا اور جس نے عقل کو وحی کے تابع رکھا اس کی عقل نے، عقل نافع کا کردار اپنایا اور جس نے عقل کو وحی کے مقابلے میں استعمال کیا وہ گمراہ ہوگیا اور یہ عقل فاسد کا نتیجہ ہے۔

پرویزیت اور عقل

پرویزی لٹریچر کا مطالعہ کیا جائے تو یہ واضح ہوجاتا ہے کہ ان کے ہاں عقل کو وحی پر تفوق حاصل ہے۔ اگرچہ وہ یہ ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ ہم وحی کو عقل سے برتر سمجھتے ہیں، حالانکہ یہ سراسر دھوکا ہے۔ عقل کو وحی پر تفوق دینے کا ثبوت ان کے نام نہاد طلوعِ اسلام کے تحریکی لٹریچر کے مطالعے سے مل سکتا ہے۔ درج ذیل سطور میں اس کی جھلک دیکھی جاسکتی ہے۔

1 مسئلۂ تقدیر اور جزا و سزا کے متعلق پرویز کا نظریہ معتزلہ کے عین مطابق ہے۔ لکھتے ہیں: خدا نے کائنات پیدا کر کے ہر چیز کے پیمانے یا قوانین مقرر فرمائے ہیں۔ اب وہ خود (اللہ تعالیٰ) ان قوانین کا پابند بن گیا ہے۔ ہر عمل کا ایک لازمی نتیجہ ہے جو ان قوانین کے تحت ظہور میں آتا ہے۔ ان نتائج کو روکنا یا ختم کرنا اللہ تعالیٰ کے قوانین کی خلاف ورزی ہے۔[1]

انھوں نے تقدیر کا معنی پیمانے کیا ہے اور ان کے عقیدے کی رو سے جہاں انسان کو اپنے اعمال کا مختارِ کل قرار دیا گیا ہے وہاں خدا کی مغفرت اور انبیاء و صالحین کی شفاعت کا عقیدہ بھی باطل قرار پاتا ہے۔ یہی معتزلہ کا عقیدہ ہے وہ انسان کو اپنے اعمال کا خالق

[1] کتاب التقدیر.

(مختارکل) سمجھتے ہیں، نیز پرویز کے عقیدے سے محسوس ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ گناہوں کی مغفرت نہیں کرسکتا اور وہ انبیاء وصالحین کی شفاعت کا بھی منکر ہے۔ یہ معتزلہ سے بڑھ کر باطل عقیدہ ہے۔

2 معجزات سے انکار کے سلسلے میں پرویز صاحب سرسید احمد خان کے مقلد ہیں کہ وہ خلاف فطرت کوئی بات تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں۔ سابقہ انبیاء ﷩ کے معجزات کے بارے میں جتنی آیات وارد ہیں ان سب کی اپنی عقلی روش کے مطابق تاویل کی ہے اور آخری نبی ﷺ کے بارے میں صراحت کے ساتھ کہا ہے کہ آپ ﷺ کو کوئی حسی معجزہ نہیں دیا گیا۔ ان کا دعویٰ ہے کہ قرآن کریم سے محمد ﷺ کا کوئی حسی معجزہ ثابت نہیں ہوتا اور جن آیات سے معجزات ثابت ہوتے ہیں ان میں بے جا تاویلات کی گئی ہیں۔

3 نظریۂ ارتقا کے مسئلے میں سرسید سے آگے بڑھ کر اس نظریے کو قرآن سے ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔[1] فرشتوں، ابلیس اور آدم علیہ السلام کے بارے میں دوراز فہم تاویلات کرکے ارتقا ثابت کرنے کے لیے راستہ کھول دیا ہے۔

4 طاہرہ کے نام خط لکھ کر عائلی نظام میں مرد کے تفوق کو یکسر ختم کردیا ہے اور اپنی ناقص عقل کے ذریعے سے اس نظریے کو قرآن کریم سے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔

5 اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کی جگہ مرکز ملت کا تصور قرآن سے ثابت کرنے کی سعیِ باطل کی ہے اور تشریعی احکام کے جملہ اختیارات مرکز ملت کو تفویض کیے ہیں۔

6 اپنی باطل تاویلات کے لیے فضا ہموار کرنے کے لیے احادیث کو ماننے سے انکار کیا اور صرف ان احادیث کا اقرار کیا ہے جو اس کے جدید ''قرآنی فہم'' کے مطابق ہوں۔

[1] ابلیس اور آدم۔

7 قرآن کریم کی مروجہ اصطلاحات کو نئے معانی و مفاہیم عطا کیے۔ عبادت، ملائکہ، صلاۃ، زکاۃ، قیامت، جنت اور جہنم کا مروجہ شرعی مفہوم یکسر بدل دیا ہے۔ یہ تمام غلط عقائد عقل کو وحی پر تفوق دینے کا نتیجہ ہیں۔ چونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ ان کا یہ نظریہ مسلمانان عالم کے عقائد سے صریح متصادم ہے، اس لیے سلیم کے نام سولہویں خط میں لکھا ہے: ''میرا اندازہ ہے کہ قرآن (پرویز صاحب کی قرآنی بصیرت) کو سمجھیں گے تو مغرب کے مفکرین سمجھیں گے۔'' (کیونکہ وہ لوگ شریعت سے واقف نہیں بلکہ اس کے دشمن ہیں۔)

اور سترھویں خط میں لکھتے ہیں: ''مجھے مغربی اقوام کی سرزمین قرآنی پیغام کے لیے زیادہ سازگار معلوم ہوتی ہے کیونکہ وہاں عقل ہے مُلّاً ازم کی جہالت اور تنگ نظری نہیں ہے۔'' (اس قسم کے پرویزی افکار پر مبنی بہت سے پراگندہ خطبات و خیالات کی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔)

ثابت ہوا کہ پرویز صاحب نے اپنے اس طرزِ عمل سے اہل مغرب کو خوش رکھنے کا تہیہ کر رکھا تھا، جیسا کہ ان کے ہم نوا مرزا غلام احمد قادیانی نے بھی اہل مغرب کے ساتھ تعاون کرنے میں تمام کوششیں صرف کی تھیں۔

ایک منکر حدیث کی توبہ: ایک منکر حدیث کے ساتھ میرا مکالمہ ہوا جو کیسٹ میں ریکارڈ ہے۔ اس نے کہا: ہم قرآن کی تفسیر کے لیے عقل کو کافی سمجھتے ہیں۔ میں نے اسے کہا: ہم اس وقت چار آدمی موجود ہیں اور ہم چاروں کی عقل میں ضرور فرق ہے۔ قرآن فہمی کے لیے ہم میں سے کس کی عقل معتبر ہوگی؟ اور اگر ہر شخص کی عقل معتبر ہوگی تو پھر قرآن کریم لوگوں کی عقل کے سامنے ایک کھلونا بن جائے گا اور ہر شخص اپنی عقل کے مطابق اخذ کردہ خیالات کو قرآن کی طرف منسوب کرے گا، نتیجتاً اس شخص نے ہمارے سامنے اپنے نظریے سے توبہ کرلی۔

منکرین حدیث کا ایمانیات، عبادات اور احادیث کے متعلق عقیدہ

گزشتہ ابواب میں متفرق طور پر مناسب جگہوں پر منکرین حدیث کے بعض عقائد بیان کیے گئے ہیں۔ اس باب میں ان کے تمام معروف عقائد و نظریات تفصیل سے بیان کیے جائیں گے تاکہ نبی ﷺ کے حقیقی اسلام اور پرویزی اسلام کے درمیان فرق واضح ہو جائے۔

پرویز لکھتے ہیں:

"لیکن خدا کے تصور کا ایک مفہوم وہ ہے جسے خدا نے متعین کیا ہے اور جو قرآن کے حروف و نقوش میں جگمگ جگمگ کرتا دکھائی دیتا ہے۔ اس تصور کی رو سے ان مقامات پر خدا سے مفہوم ہے وہ نظام جو اس کے متعین فرمودہ ابدی قوانین کی بنیادوں پر قائم ہوتا ہے۔"[1]

یہاں پرویز صاحب پر لازم تھا کہ خدا نے جن آیات میں مفہوم متعین کیا ہے وہ ان آیات کا ذکر کرتے اور قرآن کے وہ حروف و نقوش بھی بیان کرتے جن میں خدا کا تصور

[1] سلیم کے نام خط، ص: 226 بحوالہ "ضرب حدیث"، ص: 131.

جگمگ جگمگ کرتا دکھائی دیتا ہے۔

انھوں نے اس عبارت میں خدا کا مفہوم نظام کو قرار دیا جو ابدی قوانین پر قائم ہوتا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ پرویز صاحب کے بقول جب یہ نظام قائم ہو جائے تو اس وقت خدا موجود ہوگا اور جب ایسا نظام نہیں ہوگا تو خدا کا وجود بھی نہیں ہوگا۔ کیا خدا کے وجود کا یہ معنی کسی رسول نے بیان کیا یا قرآن کی کسی آیت میں مذکور ہے؟ ایک جگہ لکھتے ہیں:

''چونکہ خدا عبارت ہے ان صفات عالیہ سے جنھیں انسان اپنے اندر منعکس کرنا چاہتا ہے، اس لیے قوانین خداوندی کی اطاعت درحقیقت انسان کی اپنی فطرت عالیہ کے نوامیس کی اطاعت ہے۔''[1]

یہ خدا کا دوسرا عجیب وغریب معنی نکالا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے متعلق دوسرا عقیدہ

پرویز لکھتے ہیں: مذہب نے جس خدا کو کائنات سے ماورا عرش پر بٹھا رکھا ہے وہ واقعی کسی انسان کے رزق کی ضمانت نہیں دے سکتا۔ اس کے رازق ہونے کے دعویٰ کے باوجود اس کی خدائی میں کروڑوں بندے بھوکے سوتے اور لاکھوں انسان فاقوں سے مرتے ہیں۔ اس کے اس بلند آہنگ اعلان کے باوجود کہ

﴿ وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِى الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا ﴾

''زمین پر چلنے والا کوئی ایسا نہیں جس کے رزق کی ذمہ داری خدا پر نہ ہو۔''[2]

(ترجمہ پرویز)

آج آدھی دنیا کو پیٹ بھر کر روٹی نصیب نہیں ہو رہی، لہٰذا انسانوں کے خود ساختہ

[1] معارف القرآن: 420/2. [2] هود 6:11.

مذہب کے پیدا کردہ خدا پر ایمان لانے اور اس کے دعاوی پر توکل رکھنے سے وہ یقین کسی طرح پیدا نہیں ہوسکتا جو انسان کو احتیاج کی فکر سے بے خوف کردے۔"[1]

پرویز صاحب صرف منکر حدیث ہی نہیں بلکہ وہ قرآن کے بھی صریح طور پر منکر ہیں۔ خدا کو کائنات سے ماورا عرش پر بٹھانے کی نسبت مذہب کی طرف کی ہے اور آخر پر کہا: "خود ساختہ مذہب کے پیدا کردہ خدا۔" العیاذ باللہ۔ اتنی خود سری! انھوں نے یہ بھی نہ دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ ﴾

"پھر وہ عرش پر مستوی ہوا۔"[2]

نیز فرمایا:

﴿ اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى ○ ﴾

"وہ رحمان ہے، عرش پر مستوی ہے۔"[3]

رحمان کے عرش پر مستوی ہونے کے متعلق اللہ تعالیٰ نے خود صریح آیات کی روشنی میں واضح کیا ہے۔ یہ کوئی خود ساختہ تصور نہیں بلکہ قرآن کی آیات بینات پر مبنی ہے۔ قرآن کی صریح آیت میں ہے:

﴿ وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا ﴾

"اور زمین پر چلنے والا کوئی جاندار نہیں مگر اس کی روزی اللہ کے ذمے ہے۔"[4]

پرویز نے یہ آیت نقل کر کے اس کا تمسخر اڑایا ہے۔ ان کا مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ روسی نظام (مساوات) کا تابع ہو کر سب کو یکساں روزی فراہم کرے لیکن یہ اللہ تعالیٰ کا

[1] سلیم کے نام خط، ص: 226 بحوالہ "ضرب حدیث"، ص: 122. [2] یونس 3:10. [3] طٰهٰ 5:20.
[4] ھود 6:11.

قانون نہیں بلکہ اس نے فرمایا:

﴿ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ ﴾

''وہ جس کی روزی چاہتا ہے فراخ کر دیتا ہے اور جس کی چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے۔''[1]

اور فرمایا:

﴿ وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ ﴾

''اللہ نے روزی کے معاملے میں بعض کو بعض پر فضیلت دے رکھی ہے۔''[2]

یعنی روزی کی تقسیم کے معاملے میں اس کا نظام مساوات پر مبنی نہیں۔ اس فرق کی حکمت بیان کرتے ہوئے فرمایا:

﴿ لِيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا ﴾

''تاکہ ان میں سے بعض (مال دار) بعض (مزدور) سے خدمت لیں۔''[3]

زندگی گزارنے اور نظام چلانے کا یہ بدیہی طریقہ ہے۔

پرویز صاحب کے مذکورہ مکتوبات پڑھنے کے بعد کسی عقل مند شخص سے یہ بات مخفی نہیں رہ جاتی کہ وہ قرآن اور اللہ تعالیٰ کی قرآنی شان کے منکر ہیں۔ جس سے ان کے کفر میں کوئی شک باقی نہیں رہ جاتا۔

اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کے متعلق افکار و عقائد

پرویز لکھتے ہیں:

''اللہ اور رسول سے مراد ہی مرکز ملت ہے اور اولوا الامر سے مراد افسران ماتحت۔''[4]

مزید لکھا ہے:

[1] بنیٓ إسرآءیل 30:17. [2] النحل 71:16. [3] الزخرف 32:43. [4] معارف القرآن: 626/4.

"قرآن کریم میں جہاں اللہ اور رسول کا ذکر آیا ہے اس سے مراد مرکز نظام حکومت ہے۔"[1]

مزید لکھا ہے:

"بالکل واضح ہے کہ اللہ اور رسول سے مراد مرکز حکومت ہے۔"[2]

اور لکھتے ہیں:

"اللہ اور رسول سے مراد مسلمانوں کا امام ہے۔"[3]

ایسے ہی خیالات کا اظہار معارف القرآن: 631,630/4 پر بھی کیا ہے۔ ایسے صریح کفر کا اظہار کرنے پر تعجب ہے۔ اس نے اللہ تعالیٰ کے وصف الوہیت، وصف ربوبیت اور وصف اسماء وصفات پر، نیز رسول اللہ ﷺ کی صفت رسالت ونبوت پر ایمان لانے کو درمیان سے نکال دیا۔ اس باطل عقیدے کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر نظام حکومت ہے تو اللہ اور اس کا رسول بھی ہیں اور اگر نظام حکومت نہیں تو پھر اللہ اور اس کے رسول کا وجود بھی نہیں ہے۔ العیاذ باللہ۔

ایمان بالرسول کے متعلق لکھا ہے:

"رسالت محمدیہ پر ایمان سے مقصود اس کتاب پر ایمان لانا ہے جو حضور ﷺ کی وساطت سے دنیا کو ملی۔"[4]

اس کا مطلب یہ ہے کہ کتاب اللہ (قرآن) پر ایمان لانے کے بعد رسول پر ایمان لانے کی کوئی ضرورت نہیں، حالانکہ بہت سی آیات میں ایمان بالرسول اور ایمان بالقرآن کو الگ الگ بیان کیا گیا ہے۔

---

[1] معارف القرآن: 623/4. [2] معارف القرآن: 623/4. [3] معارف القرآن: 623/4.
[4] فردوس گم گشتہ، ص: 383.

رسول سے کیا مراد ہے؟ اس کے بارے میں لکھتے ہیں:

''عملی نظام کی سہولت کے لیے امت اپنے میں سے بہترین افراد کو اپنا نمائندہ بنا کر ''فِیکُمْ رَسُولُه'' کے سلسلے کو قائم رکھتی ہے۔ اور یہ کہ رسول کی زندگی کے بعد ''فِیکُمْ رَسُولٌ'' سے مراد ملت کی مرکزی اتھارٹی ہے۔''[1]

طلوع اسلام کے ایک رکن محمد علی خان بلوچ بی اے آنرز (کچھ اختلاف کی وجہ سے) فرماتے ہیں: غالباً ہماری طرح آپ حضرات میں بہت سوں نے محسوس کیا ہوگا کہ اب کچھ عرصہ سے اس وجۂ اشتراک کے پردہ میں کہ جس طرح رسول اکرم ﷺ نے اپنی زندگی میں نوعِ انسانی کو قرآن کی دعوت دی تھی، بزعم خویش آج کل اسی طرح گلبرگ لاہور کی کوٹھی نمبر 25۔ بی میں جناب پرویز بھی قرآن کی دعوت دے رہے ہیں۔ جناب پرویز نے اپنی تحریروں میں عموماً اپنے آپ کو آں حضرت ﷺ کے بلند مقام پر فائز کرکے ان تمام آیات کو جو آں حضرت سے متعلق ہیں اپنی ذات پر منطبق فرمالیا۔''[2]

دیکھا آپ نے! پرویز کے ہم مجلس نے یہ تأثر لیا ہے کہ پرویز صاحب اپنے آپ کو رسول کے درجے میں رکھنا چاہتے ہیں۔

ختم نبوت کا مطلب

لکھتے ہیں: ''ختم نبوت سے مراد یہ ہے کہ اب دنیا میں انقلاب شخصیتوں کے ہاتھوں نہیں بلکہ تصورات کے ذریعے رونما ہوا کرے گا اور انسانی معاشرہ کی باگ ڈور اشخاص کی بجائے نظام کے ہاتھوں میں ہوا کرے گی۔''[3]

ایک جگہ لکھا ہے: '' تم نے دیکھ لیا سلیم! ختم نبوت کا مفہوم اس جیسا تھا کہ اب

---

[1] طلوع اسلام، 9 جون، 1959ء۔ [2] حدیث در گزارے، ص: 20، بحوالہ آئینۂ پرویزیت، ص: 807. [3] سلیم کے نام خط: 15، ص: 250، طبع اول اگست 1953ء۔

انسانوں کو صرف اصولی راہ نمائی کی ضرورت ہے۔ ان اصول کی روشنی میں تفصیلات وہ خود متعین کریں گے لیکن ہمارے ہاں یہ عقیدہ پیدا ہوگیا ہے (اور اسی عقیدے پر مسلمان کا عمل چلا آرہا ہے) کہ زندگی کے ہر معاملے کی تفصیل بھی پہلے سے متعین کردی گئی ہے اوراب ان تفاصیل میں کسی قسم کا ردو بدل نہیں ہوسکتا۔ یہ عقیدہ اس مقصد عظیم کے منافی ہے جس کے لیے ختم نبوت کا انقلاب عمل میں لایا گیا۔''[1]

یہ ختم نبوت کی ایک نرالی تعبیر ہے جسے کوئی عقل مند مسلمان ماننے کے لیے تیار نہیں۔ یہ کہنا کہ زندگی کے ہر معاملے کی تفصیل بھی پہلے سے متعین کردی گئی ہے، جیسا کہ قرآن کی آیت:

﴿ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ ﴾

''بلاشبہ تمھارے لیے رسول اللہ (ﷺ) کی زندگی میں بہترین نمونہ ہے۔''[2]

اور

﴿ قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي ﴾

''کہہ دیجیے: اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری اتباع کرو۔''[3]

کا اصل معنی بھی یہی ہے اور تمام مسلمانوں کا عقیدہ ہے مگر چونکہ پرویزی اسلام، نبوی اسلام سے مطلقاً مختلف ہے، اس وجہ سے اس نے ان آیات کا مقصد اپنے مزعوم مقصد کے منافی قرار دے دیا۔

تمام مسلمانوں کے اسلام کے متعلق

''آج جو اسلام مسلمانوں میں مروج ہے وہ زمانۂ قبل از قرآن کا مذہب ہو تو ہو قرآنی

[1] سلیم کے نام خط: 103/2,20. [2] الأحزاب 21:33. [3] آل عمرٰن 31:3.

دین سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔''[1]

ایک جگہ لکھا ہے:

''یہی عجمی اسلام ہے سلیم! جو ہزار برس سے ہمارے رگ و پے میں اس طرح سرایت کر چکا ہے کہ ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ اگر یہ نکل گیا تو اس کے ساتھ ہماری جان بھی نکل جائے گی۔''[2]

جناب پرویز نے ہزار برس تک کے تمام مسلمانوں کے اسلام پر کاری ضرب لگائی ہے۔ وہی بتائیں کہ انھوں نے قرآن اور اسلام کہاں سے سیکھ لیا جبکہ ان کا کہنا ہے کہ ہزار برس تک کے مسلمانوں میں کوئی ایک بھی ''مسلمان'' نہیں گزرا۔

محمد ﷺ کی شریعت میں تغیر و تبدل کا جواز

لکھتے ہیں: ''دین کی صحیح بنیاد قرآن اور فقط قرآن ہے جو ابدالآباد کے لیے واجب العمل ہے۔ روایات (احادیث) اس عہد مبارک کی تاریخ ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اور آپ کے ساتھ ایمان لانے والوں (صحابہ) نے اپنے عہد میں قرآنی اصول کو کس طرح متشکل فرمایا تھا، یہ اس عہد مبارک کی شریعت ہے۔ (آگے لکھا ہے:) اب یہ حق صرف صحیح قرآنی خطوط پر قائم شدہ مرکز ملت اور مجلس شوریٰ کا ہے کہ وہ قرآنی اصول کی روشنی میں صرف ان جزئیات کو مرتب اور مدون کر سکے جن کی قرآن نے کوئی تصریح نہیں کی۔ پھر یہ جزئیات ہر زمانہ میں ضرورت پڑنے پر تبدیل کی جا سکتی ہیں، یہی اپنے زمانہ کے لیے شریعت ہیں۔''[3]

[1] سلیم کے نام خط، ص: 252 بحوالہ ضرب حدیث۔ [2] سلیم کے نام خط، ص: 123، بحوالہ ضرب حدیث۔ [3] مقام حدیث: 291/1.

مزید لکھا ہے:

”قرآن کے ساتھ انسان کو بصیرت عطا ہوئی ہے، اس لیے جن امور کی تفصیل قرآن نے خود بیان نہیں کی ان کی تفصیل قرآنی اصول کی روشنی میں ازروئے بصیرت متعین کی جائے گی۔ یہی رسول اللہ نے کیا اور ہمارے لیے بھی ایسا کرنا منشائے قرآنی اور سنت رسول اللہ کے عین مطابق ہے۔ اس باب میں اخلاق، معاملات اور عبادات میں کوئی تفریق اور تخصیص نہیں اگر تفریق مقصود ہوتی تو عبادات کی جزئیات قرآن خود ہی متعین کر دیتا۔“[1]

مزید لکھا ہے: ”جس اصول کا میں نے اپنے مضمون میں ذکر کیا ہے وہ قانون اور عبادت دونوں پر منطبق ہوگا، یعنی اگر جانشینِ رسول اللہ (قرآنی حکومت) نماز کی کسی جزئی شکل میں جس کا تعین قرآن نے نہیں کیا، اپنے زمانے کے کسی تقاضے کے ماتحت کچھ ردو بدل ناگزیر سمجھے تو وہ ایسا کرنے کی اصولاً مجاز ہوگی۔“[2]

ان تحریروں سے واضح ہوا کہ شریعت پرویزی کے عقیدے کے مطابق ہر انسان اپنی صوابدید کے مطابق شریعت محمدیہ میں نسخ اور تبدیلی کرسکتا ہے۔ یہاں تک کہ نماز کا طریقہ بھی ایجاد کرسکتا ہے۔

جب چودہ سو سال سے تواتر کے ساتھ ثابت شدہ مسلمانوں کی عبادات کے وہ طریقے جو صحیح احادیث میں مروی ہیں اور اسلامی احکام وقوانین جو صحیح احادیث میں موجود ہیں ان کو ”قرآنی حکومت مرکز ملت“ کی جانب سے منسوخ کیا جاسکتا ہے تو کیا پھر یہ نام نہاد قرآنی حکومت یا مرکز ملت رسول کے درجے پر فائز ہوگا؟ اس قرآنی حکومت کا تصور صرف گلبرگ لاہور میں موجود ہے، اس کے سوا عالم اسلام کے کسی بھی خطے میں اس کا وجود نہیں، لہٰذا یہ نری جہالت اور حماقت کا مظہر ہے۔

[1] مقام حدیث: 434/1. [2] قرآنی فیصلے: 15/3، بحوالہ کتاب فتنۂ انکار حدیث۔

قرآن عبوری دور کے لیے

پرویز لکھتے ہیں: ''اب رہا سوال کہ اسلام میں ذاتی ملکیت نہیں تو پھر قرآن میں وراثت وغیرہ کے احکام کس لیے دیے گئے ہیں؟ سو اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن انسانی معاشرہ کو اپنے متعین کردہ پروگرام کی آخری منزل تک آہستہ آہستہ بتدریج پہنچاتا ہے، اس لیے وہ جہاں اس پروگرام کی آخری منزل کے متعلق اصول اور احکام متعین کرتا ہے وہاں عبوری دور کے لیے ساتھ ساتھ رہنمائی دیتا چلا جاتا ہے۔ وراثت، قرضہ، لین دین، صدقہ و خیرات کے احکام اس عبوری دور کے متعلق ہیں جن میں سے معاشرہ گزر کر انتہائی منزل تک پہنچتا ہے۔''[1]

مزید لکھا ہے: ''قرآن میں صدقہ وخیرات وغیرہ کے لیے جس قدر ترغیبات و تحریصات یا احکام وضوابط آتے ہیں وہ سب اس عبوری دور سے متعلق ہیں۔''[2]

یہ ہے پرویزیت کی اصل حقیقت کہ جناب پرویز صرف حدیث کے ہی منکر نہیں کیونکہ انکارحدیث تو صرف ابتدائی منزل ہے وہ تو قرآن کے احکام سے انکار کرتے ہیں اور دھوکا دینے کے لیے اس کا نام عبوری دور رکھا، یعنی قرآن کا زیادہ حصہ صرف زمانۂ رسول اور عربوں کے لیے خاص ہوا۔ تو پھر ﴿هُدًى لِّلنَّاسِ﴾ (قرآن) لوگوں کے لیے ہدایت ہے۔''[3] اور ﴿لِيَكُونَ لِلْعٰلَمِينَ نَذِيرًا ۝﴾ ''تاکہ وہ جہانوں کے لیے ڈرانے والا بن جائے۔''[4] جیسی آیات کا کیا مطلب ہوگا؟ معلوم ہوا کہ پرویز صاحب کا مقصد قرآن سے انکار ہے تو پھر اس کے کفر میں کون سا شک وشبہ باقی رہ جاتا ہے؟

ایمان بالآخرت کا معنی

پرویز لکھتے ہیں: ''قرآن ماضی کی طرف نگاہ رکھنے کے بجائے مستقبل کو سامنے رکھنے

---

[1] نظام ربوبیت، ص: 25. [2] نظام ربوبیت، ص: 167. [3] البقرة 2:185. [4] الفرقان 25:1.

کی تاکید کرتا ہے، اس کا نام ایمان بالآخرۃ ہے اور یہ بجائے خویش بہت بڑا انقلاب ہے جسے رسالت محمدیہ نے انسانی نگاہ میں پیدا کیا، یعنی ہمیشہ نگاہ مستقبل پر رکھنی۔

﴿ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ۝ ﴾

''اس زندگی میں مستقبل پر اور اس کے بعد کی زندگی میں بھی۔''[1]

آخرت کے بارے میں قرآن کریم میں مختلف نام مذکور ہیں قرآن نے اسے حشر کا دن، بعث کا دن، یوم الحساب، یوم الدین وغیرہ قرار دیا ہے۔ ان میں دنیوی مستقبل کی طرف کوئی اشارہ تک نہیں تو اس سے صرف دنیاوی مستقبل مراد لینا لوگوں کو ایمان بالآخرۃ کے صحیح مفہوم ومصداق سے غافل کرنا ہے۔

مزید لکھا: ''اصل سوالات تو یہ ہیں کہ قرآن کے نزدیک حیات کسے کہتے ہیں؟ موت کے کیا معنی ہیں؟ قیامت کا تصور کیا ہے؟ عذاب وثواب سے کیا مفہوم ہے؟ وَقِسْ عَلٰى هٰذَا، مسلمان کو چونکہ اس زندگی سے کوئی رابطہ نہیں رہا، اس لیے اس نے ان اہم سوالات کو قیامت پر ملتوی کر رکھا ہے اور قیامت بھی صرف وہ جو مرنے کے بعد آئے گی۔ وہ اس قیامت سے کوئی تعلق نہیں رکھتے جو ان کی ایک ایک سانس میں پوشیدہ ہے۔''[2]

ذرا غور فرمائیں پرویز صاحب نے قیامت کا کیا معنی سمجھ لیا! آخر سانس لینے کا قیامت کے ساتھ کیا تعلق ہے؟

جنت، جہنم اور میزان اعمال کا مطلب

پرویز لکھتے ہیں: ''بہرحال مرنے کے بعد کی جنت اور جہنم مقامات نہیں ہیں، انسانی ذات کی کیفیات ہیں۔''[3]

---

① سلیم کے نام اکیسواں خط: 124/2، بحوالہ فتنۂ انکار حدیث۔ ② قرآنی فیصلے، ص: 332. ③ لغات القرآن از پرویز: 449/1، بحوالہ فتنۂ انکار حدیث.

قرآن کریم میں جنت کا نام مَقَامٌ أَمِينٌ اور مَقْعَدَ صِدْقٍ بتایا گیا جبکہ جہنم کو مَكَانًا ضَيِّقًا کا نام دیا گیا مگر پرویز صاحب اس سے مطلق طور پر انکار کرتے ہیں۔ اس طرح وہ قرآن سے انکار کرتے ہیں۔ ایک مقام پر لکھا ہے:

''مسلمان اس جنت اور دوزخ سے کوئی واسطہ نہیں رکھتا جو قدم قدم پر اس کے سامنے ہے نہ وہ اس میزان کو دیکھتا ہے جس میں قوموں کے اعمال حیات ہر آن تلتے رہتے ہیں۔''[1]

ایک جگہ لکھا ہے: ''قرآن کہتا ہے کہ اب وہ دور سرمایہ داری گزر گیا۔ اب وہ زمانہ نظام ربوبیت کا آ رہا ہے۔ جس میں انصاف کی رو سے میزان کھڑی کی جائے گی۔

﴿ وَنَضَعُ الْمَوَازِينَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيَامَةِ ﴾

''اور ہم قیامت کے دن ایسے ترازو رکھیں گے جو عین انصاف ہوں گے۔''[2]

اس میزان کا نتیجہ یہ ہوگا کہ کسی مزدور کی محنت میں کوئی کمی نہیں کر سکے گا اور محنت کرنے والے کی محنت کا ذرہ ذرہ نتیجہ خیز ہوگا۔ اس کا حساب زمیندار یا سرمایہ دار نہیں کیا کرے گا کہ محنت کش کا حصہ کیا ہے اور اس کا حصہ کتنا۔''[3]

قرآن کریم میں مذکور میزان اعمال کے ساتھ اس طرح استہزا کرنے پر افسوس صد افسوس! قرآن نے کس آیت میں کہا ہے کہ دور سرمایہ داری گزر گیا؟ اس تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ مزدوروں اور سرمایہ داروں کے لیے میزان ہے تو کیا تاجروں اور پیشہ وروں یا عورتوں کا کوئی حساب اور میزان نہیں ہوگی؟ یہ ان قرآنی آیات سے جن میں میزان، وزن اور میزان کے ہلکا اور بھاری ہونے کا تذکرہ موجود ہے، صراحتاً انکار اور اپنی طرف سے بے سروپا تاویلات کا انبار لگانا ہے۔

(1) قرآنی فیصلے، ص: 332. (2) بنیٓ إسرآءیل: 47:21. (3) نظام ربوبیت، ص: 256.

فرشتوں پر ایمان

پرویز لکھتے ہیں: ''اس سے ظاہر ہے کہ ان مقامات (واقعۂ خلافت آدم و سجود آدم) میں ملائکہ سے مراد وہ نفسیاتی محرکات ہیں جو انسانی قلوب میں آثار مرتب کرتے ہیں۔''[1]

ایک جگہ لکھا ہے: ''سوال یہ ہے کہ ملائکہ پر ایمان کے معنی کیا ہیں؟ اس کے معنی یہ ہیں کہ ملائکہ کے متعلق وہ تصور رکھا جائے جو قرآن نے پیش کیا ہے اور انھیں وہی پوزیشن دی جائے جو قرآن نے ان کے لیے متعین کی ہے۔ ملائکہ کے متعلق قرآن میں ہے کہ انھوں نے آدم کو سجدہ کیا، یعنی وہ آدم کے سامنے جھک گئے، جیسا کہ آدم کے عنوان میں بتایا جا چکا ہے۔ آدم سے مراد خود آدمی یا نوع انسان ہے، لہٰذا ملائکہ کے آدم کے سامنے جھکنے سے مراد یہ ہے کہ یہ قوتیں وہ ہیں جنھیں انسان مسخر کر سکتا ہے۔ انھیں انسان کے سامنے جھکا ہوا رہنا چاہیے۔ کائنات کی جو قوتیں ابھی تک ہمارے علم میں نہیں آئیں انھیں چھوڑیے اور جو قوتیں ہمارے علم میں آ چکی ہیں ان کے متعلق صحیح ایمان یہ ہوگا کہ ان سب کو انسان کے سامنے جھکنا چاہیے۔ اب ظاہر ہے کہ جس قوم کے سامنے کائناتی قوتیں نہیں جھکتیں وہ قوم قرآن کی رو سے صفِ آدمیت میں شمار ہونے کے قابل ہی نہیں، چہ جائیکہ اسے جماعت مومنین کہا جائے کیونکہ مومن کا مقام عام آدمیوں کے مقام سے کہیں اونچا ہے۔''[2]

ایک جگہ جبریل علیہ السلام کے متعلق لکھا ہے: ''انکشاف حقیقت کی روشنی (ذریعہ یا واسطہ) کو جبریل سے تعبیر کیا گیا ہے۔''[3]

ہم پرویز اور اس کے مقلدین سے سوال کرتے ہیں کہ وہ قرآن کریم میں ہمیں وہ ایسی آیت دکھائیں جس میں ملائکہ کے متعلق یہ تصور پیش کیا گیا ہو کہ یہ کائناتی قوتیں ہیں یا

[1] ابلیس و آدم، ص: 195. [2] لغات القرآن: 244/1. [3] ابلیس و آدم، ص: 283.

نفسانی محرکات ہیں۔ وہ اس کے متعلق ہرگز کوئی آیت پیش نہیں کر سکتے۔ قرآن کریم میں ملائکہ کے متعلق چند آیات ملاحظہ فرمائیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ عَلَيْهَا مَلَٰٓئِكَةٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ لَّا يَعْصُونَ اللَّهَ مَآ أَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ ۝ ﴾

''اس (جہنم) پر ایسے فرشتے متعین ہیں جو سخت مزاج اور زبردست ہیں، اللہ نے انھیں جو حکم دیا ہے وہ اس کی نافرمانی نہیں کرتے بلکہ وہ وہی کام کرتے ہیں جس کا انھیں حکم دیا جاتا ہے۔''[1]

نیز فرمایا:

﴿ وَجَعَلُوا الْمَلَٰٓئِكَةَ الَّذِينَ هُمْ عِبَادُ الرَّحْمَٰنِ إِنَاثًا ۚ أَشَهِدُوا خَلْقَهُمْ ﴾

''اور انھوں نے فرشتوں کو جو کہ رحمان کے بندے ہیں، عورتیں قرار دے رکھا ہے۔ کیا وہ ان کی پیدائش کے وقت موجود تھے؟''[2]

ذرا غور فرمائیں: اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو ﴿ غِلَاظٌ شِدَادٌ ﴾، ﴿ لَّا يَعْصُونَ ﴾ اور ﴿ عِبَادُ الرَّحْمَٰنِ ﴾ جیسی صفات سے متصف کیا ہے۔ کیا ان صفات کے ساتھ پرویز کے عقیدے ''نفسانی محرکات یا کائناتی قوتیں جنھیں انسان مسخر کر سکتا ہے'' کی کوئی مناسبت یا تعلق ہوسکتا ہے، نیز کیا نفسانی محرکات اور جسے انسان مسخر و تابع کر سکتا ہے وہ مؤنث ہوسکتی ہیں؟ اس طرح پرویز صاحب کا عقیدہ جاہلیت کے مشرکوں کے قریب ہے جو ملائکہ کو مؤنث کہتے تھے۔ پرویز صاحب ایسی بے سروپا باتوں میں قرآن کا حوالہ دیتے ہیں لیکن قرآن الٰہی سے وہ اپنے نظریات کے لیے کوئی ثبوت پیش نہیں کر سکتے۔ معلوم ہوتا ہے کہ پرویزی قرآن کوئی الگ کتاب ہے۔

---

[1] التحریم 6:66. [2] الزخرف 19:43.

عقیدۂ تقدیر سے انکار

پرویز لکھتے ہیں: ''مجوسی اساورہ نے یہ سب کچھ اس خاموشی سے کیا کہ کوئی بھانپ ہی نہ سکا کہ اسلام کی گاڑی کس طرح دوسری پٹڑی پر جا پڑی۔ انھوں نے تقدیر کے مسئلے کو اتنی اہمیت دی کہ اسے مسلمانوں میں جزو ایمان بنا دیا، چنانچہ ہمارے ایمان میں [وَالْقَدْرِ خَيْرِهٖ وَشَرِّهٖ مِنَ اللّٰهِ تَعَالٰى] کا چھٹا جز انھی کا داخل کیا ہوا ہے۔''[1]

تقدیر کا مطلب یہ ہے کہ اس دنیا میں انسان کو جو کوئی مصیبت یا راحت پہنچتی ہے تو یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتی ہے اور یہ تکلیف و راحت اللہ تعالیٰ نے پہلے سے مقرر کر کے لکھ دی ہے۔ یہ عقیدہ قرآن کریم میں واضح طور پر موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَاِنْ تُصِبْهُمْ حَسَنَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۚ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِكَ ؕ قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ﴾

''اور اگر انھیں کوئی بھلائی پیش آئے تو کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے اور اگر انھیں کوئی تکلیف پہنچے تو کہتے ہیں یہ تیری طرف سے ہے، ان سے کہہ دیجیے: سب اللہ کی طرف سے ہے۔''[2]

نیز فرمایا:

﴿ قُلْ لَّنْ يُّصِيْبَنَاۤ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا ۚ هُوَ مَوْلٰىنَا ﴾

''کہہ دیجیے کہ جو کچھ اللہ نے ہمارے لیے مقرر کر دیا ہے ہمیں وہی ملے گا۔ اللہ ہی ہمارا کارساز ہے۔''[3]

---

① قرآنی فیصلے، ص: 190. ② النسآء 78:4. ③ التوبة 51:9.

اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں اپنے نبی ﷺ سے یہ بات کہلوائی ہے کہ ہر مصیبت پہلے سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر شدہ اور لکھی ہوئی ہے، نیز فرمایا:

﴿ مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِیْبَةٍ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِیْٓ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِیْ كِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا ط﴾

''کوئی مصیبت نہ زمین پر پہنچتی ہے اور نہ تمھاری جانوں پر مگر وہ ایک کتاب میں ہے، اس سے پہلے کہ ہم اسے پیدا کریں۔''[1]

دیکھیں یہ آیات عقیدۂ تقدیر کے اثبات اور اس کی تفصیل کے بارے میں کتنی صریح ہیں۔ ان کے علاوہ بھی قرآن کریم میں بہت سی ایسی آیات مذکور ہیں جن سے یہ عقیدہ واضح طور پر معلوم ہوتا ہے لیکن شاید یہ آیات پرویز صاحب کے قرآن میں نہیں ہیں، اس لیے انھوں نے اس عقیدۂ تقدیر کو مجوس کی طرف منسوب کیا ہے۔ معلوم ہوا کہ پرویزی قرآن الگ ہے اور الٰہی قرآن الگ۔

نظریۂ ارتقا

پرویز کا یہ سوال کہ دنیا میں سب سے پہلا انسان کس طرح وجود میں آ گیا ذہن انسانی کے لیے وجہ ہزار حیرت واستعجاب رہا ہے، چنانچہ ان مذاہب میں جن میں توہم پرستی نے حقائق کی جگہ لے رکھی ہے اس عقیدے کے حل میں عجیب وغریب افسانہ طرازیوں سے کام لیا ہے لیکن قرآن کریم نے اس کے متعلق جو کچھ بتایا ہے وہ بالکل وہی ہے جس کی طرف علم وبصیرت کے جدید انکشافات راہ نمائی کر رہے ہیں۔ سائنس کے انکشافات کی رو سے خاک ذرے سے مختلف ارتقائی منازل طے کر کے قرن ہا قرن کے بعد انسانی صورت میں متشکل ہوگئی، یعنی سب سے پہلے کوئی ایک فرد صورت انسانی میں جلوہ گر نہیں ہوا

[1] الحدید 22:57.

بلکہ ایک نوع وجود پذیر ہوئی ان متنوع مراحل کی تفصیل قرآن کریم کی آیات جلیلہ میں عجیب انداز میں سمٹی ہوئی ہے۔[1]

پرویزی عقل پر ہزار تف ہو کہ ایک نوع کا وجود تو تسلیم کرتی ہے مگر فرد کا وجود نہیں کرتی۔ عقل والوں سے پوچھو تو سہی کہ کیا نوع کا وجود فرد کے بغیر ہو سکتا ہے؟ کیا انسان کا وجود بغیر افراد کے ہو سکتا ہے؟ پھر انھوں نے یہ نظریہ قرآن کی طرف منسوب کر دیا! آئیں قرآن کریم پڑھیں کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے وجود کے متعلق کیا کچھ ذکر فرمایا اور پھر اسی انسان کو آدم کا نام دیا، چنانچہ ارشاد فرمایا ہے:

﴿وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ۝﴾

”اور جب تمھارے رب نے فرشتوں سے کہا: بے شک میں ایک بشر بجنے والی مٹی سے پیدا کرنے والا ہوں، جو بدبودار، سیاہ کیچڑ سے ہوگی۔“[2]

نیز فرمایا:

﴿خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ ۝﴾

”اسی نے انسان کو ٹھیکری کی طرح کھنکھناتی مٹی سے پیدا کیا۔“[3]

نیز فرمایا:

﴿اِنَّ مَثَلَ عِیْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ ؕ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ ۝﴾

”دراصل عیسیٰ (علیہ السلام) کی مثال بھی اللہ کے نزدیک آدم (علیہ السلام) کی مثال کی طرح ہے اللہ نے اسے مٹی سے بنایا، پھر اسے کہا: ہو جا تو وہ ہو گیا۔“[4]

نیز فرمایا:

① ابلیس و آدم، ص: 63، 64. ② الحجر 28:15. ③ الرحمٰن 14:55. ④ اٰل عمرٰن 59:3.

﴿ وَبَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِيْنٍ ۝ ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ ۝ ﴾

''اور انسانوں کی پیدائش کو مٹی سے شروع کیا، پھر حقیر پانی کے جوہر (نطفے) سے اس کی نسل چلائی۔''[1]

مذکورہ بالا تمام آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے انسان آدم علیہ السلام کو مٹی سے بنایا۔ آدم ایک خاص شخص اور فرد کا نام ہے جو نوع انسانی کے باپ ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو خلیفہ بنایا، اسماء کی تعلیم دی، فرشتوں سے سجدہ کرایا، جنت میں بسایا اور آپ کے ساتھ کلام فرمایا۔ یہ سارے فضائل آپ (حضرت آدم علیہ السلام) کی نبوت کے دلائل ہیں، لہٰذا وہ پہلے نبی ہیں۔ ان آیات میں خلق انسان پر قرن ہا قرن کے گزرنے کا کوئی ذکر نہیں۔ اگر پرویزی قرآن میں کسی جگہ ہو تو ہو، اللہ کے قرآن میں کہیں بھی نہیں۔

آدم علیہ السلام کی ذات سے انکار

پرویز صاحب لکھتے ہیں: ''ہمارے ہاں عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ (آدم) جس کے جنت سے نکلنے کا قصہ قرآن کریم کے مختلف مقامات پر آیا ہے، نبی تھے۔ قرآن سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی۔ قرآن کریم نے مختلف مقامات پر قصۂ آدم کی جو تفاصیل بیان کی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ جنت سے نکلنے والا آدم کوئی خاص فرد نہیں تھا بلکہ انسانیت کا تمثیلی نمائندہ تھا۔ بالفاظ دیگر قصۂ آدم کسی خاص فرد (یا جوڑے) کا قصہ نہیں بلکہ خود (آدمی) کی داستان ہے جسے قرآن نے تمثیلی انداز میں بیان کیا ہے۔ اس داستان کا آغاز انسان کی اس حالت سے ہوتا ہے جب اس نے قدیم (Primitre)

[1] السجدة 32:7,8.

انفرادی زندگی کی جگہ پہلے پہل تمدنی (Social Life) زندگی شروع کی۔“[1]

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں آدم کا لفظ 25 مرتبہ بیان فرمایا ہے: ﴿عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ﴾، ﴿اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ﴾، ﴿یٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ﴾، ﴿فَتَلَقّٰٓى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ﴾ ﴿اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰٓى اٰدَمَ وَنُوْحًا﴾، ﴿اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ ۭ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ﴾، ﴿وَلَقَدْ عَهِدْنَآ اِلٰٓى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ﴾ اور بنی آدم کا لفظ ان 25 مقامات کے علاوہ ہے۔ ان تمام آیات کریمہ میں سے کوئی ایک جگہ ایسی بتلاؤ کہ اس میں لفظ مثل آیا ہو، یا ایسا کوئی لفظ ہو جس کا معنی اور مفہوم تمثیلی نمائندہ ہو یا اس میں کوئی تمثیلی انداز ہو۔ پرویز صاحب اور اس کے مقلدین پوری کوشش کے باوجود بھی ایسا کوئی لفظ قرآن کریم میں نہیں بتا سکتے۔

یہ بھی ذہن نشین رہے کہ آدم کو تمثیل اس وقت کہا جا سکتا ہے جب آدم کی خلقت ظاہر میں موجود ہوتی یا اس کا کوئی تصور ہوتا کیونکہ مثال کے لیے کسی خارجی یا ذہنی وجود کا ہونا ضروری ہے۔ مزید برآں اگر آدم کو ایک فرد (جیسا کہ حقیقت ہے) کہا جائے تو اس سے کون سی آفت آن پڑتی ہے۔ اس کی مثال پرویز صاحب کے پیشوا مرزا غلام احمد قادیانی کی تحریر اور عقیدے میں موجود ہے۔ مرزا صاحب نے اپنے آپ کو مثیل مسیح کے خطاب اور صفت سے نوازا ہے اور استدلال کے لیے انھی احادیث کا سہارا لیا ہے جن میں نزول عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر ہے۔ ان سب احادیث میں یہ لکھا ہے:

«يَنْزِلُ فِيكُمْ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ»

”تم میں عیسیٰ بن مریم نازل ہوں گے۔“[2]

---

[1] لغات القرآن، ص: 214/1. [2] صحیح مسلم، الإیمان، باب نزول عیسی ابن مریم……، حدیث: 156,155.

مرزا نے اپنی طرف سے اس میں لفظ مثیل کا اضافہ کیا اور یَنْزِلُ کا معنی یَخْلُقُ ''پیدا ہوگا'' کر دیا اور یہ نتیجہ اخذ کیا کہ تم میں عیسیٰ علیہ السلام کا شبیہ پیدا ہوگا۔ مرزا قادیانی کو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ اِنْزَال ''پیدا کرنے'' کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ لفظ نزول (جو مجرد ہے) کسی بھی جگہ ''پیدا ہونے'' کے معنی میں نہیں آیا۔ لغت کی کتاب یا نص قرآن و حدیث اور اشعار عرب میں اس کے معنی کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ لفظ مثل بھی مرزا صاحب کی طرف سے بڑھایا گیا ہے۔ اسی طرح پرویز صاحب بھی آدم علیہ السلام کے متعلق قرآنی آیات میں کسی جگہ بھی یہ دلیل اور قرینہ پیش نہیں کر سکے کہ یہ بطور مثال ہے۔ ثابت ہوا یہ ان کی اپنی عقل کی اختراع ہے۔

معجزۂ معراج سے انکار

پرویز لکھتے ہیں: ''سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ﴿ أَسْرَىٰ ﴾ میں کہا گیا ہے کہ خدا اپنے بندے کو رات کے وقت مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ کی طرف لے گیا تاکہ وہاں اسے اپنی آیات دکھائے۔ خیال ہے کہ اگر یہ واقعہ خواب کا نہیں تو یہ حضور کی شب ہجرت کا بیان ہے اس طرح مسجد اقصیٰ سے مراد مسجد نبوی ہوگی جسے آپ نے وہاں جا کر تعمیر فرمایا۔''[1]

اس تاویل بلکہ تحریف میں پرویز صاحب کی بے عقلی یا ہٹ دھری کا کھلا ثبوت موجود ہے۔ ان کا کہنا ہے: ''خیال ہے'' یعنی قرآنی مقاصد کو اپنے ''خیال'' کا تابع بنا کر جرم عظیم کا ارتکاب کیا جا رہا ہے۔ پہلے تو خیال کے حوالے سے کہا کہ یہ خواب کا واقعہ ہے۔ اگر خواب ہے تو پھر اس میں اتنا بڑا کمال کیا ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلت پر دلالت کرے۔ خواب میں تو عام انسان بھی کبھی مکہ مکرمہ جاتا ہے تو کبھی مدینہ طیبہ اور کبھی وہ امریکہ کے

[1] معارف القرآن: 4/736.

چکر لگاتا ہے تو کبھی برطانیہ کے۔ خیال وہ ہوتا ہے جو ذہن کی اختراع ہو اور اس کے اثبات کے لیے کوئی دلیل نہ ہو، پھر یہ کہا ہے کہ ''شب ہجرت کا بیان ہے۔'' اب ملاحظہ فرمائیں قرآن کریم کی متعلقہ آیت:

﴿ سُبْحٰنَ الَّذِيْٓ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا ﴾

''پاک ہے وہ ذات، جو اپنے بندے (محمد ﷺ) کو راتوں رات مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ لے گئی۔''[1]

آیت پر غور کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ یہ واقعہ ایک رات کا ہے، یعنی ایک رات میں مسجدِ حرام سے مسجد اقصیٰ لے گیا جبکہ ہجرت کے واقعے کے بارے میں تو معلوم ہے کہ وہ ایک رات کا نہیں بلکہ آپ ﷺ تقریباً دس راتوں میں مکہ مکرمہ سے مدینہ طیبہ پہنچے تھے، لہٰذا پرویز صاحب کا یہ خیال حقیقت سے متصادم ہے، پھر یہ کہنا کہ ''مسجد اقصیٰ'' سے مراد ''مسجد نبوی'' ہوگی انتہائی بے وقوفی کا اظہار ہے۔ کیا مسجد نبوی اس وقت تعمیر ہوئی تھی؟ کیا کسی زمانے میں مسجد نبوی کا نام مسجد اقصیٰ بھی رکھا گیا تھا؟ کیا یہ نام لغت کے لحاظ سے مسجد نبوی کے لیے موزوں ہے؟ جبکہ اس روز روئے زمین پر مسجد اقصیٰ دمشق میں موجود تھی جو حجاز سے تقریباً ایک ماہ کی مسافت پر تھی۔ مسجد نبوی کا تو اس وقت نام و نشان بھی نہیں تھا۔ مزید برآں اس سورت (بنی اسرائیل) کا تمام مضمون مکی سورتوں جیسا ہے اور یہ سورت مکی ہے۔ اس وقت تک نبی ﷺ مکہ میں مقیم تھے، نیز اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان: ﴿ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ ﴾ ''وہ اپنے بندے کو لے گیا۔''[2] فعل ماضی ہے، یہ نہیں فرمایا کہ ''وہ لے جائے گا۔''

ہم کہتے ہیں کہ یہ آیت کریمہ معجزۂ معراج کے ایک حصے پر مشتمل ہے جو مکہ مکرمہ سے مسجد اقصیٰ (دمشق) کی طرف رات کے ایک حصے میں رونما ہوا۔

---

[1] بنیٓ إسرآءیل 1:17۔ [2] بنیٓ إسرآءیل 1:17۔

مشرکین مکہ نے تعجب کا اظہار کرتے ہوئے اس واقعے کا انکار بھی کیا۔ اور معراج کا دوسرا حصہ، یعنی آسمانی معراج، ''سورۂ نجم'' میں واضح طور پر مذکور ہے۔ واقعۂ معراج سے انکار کرنا قرآن کریم سے انکار کرنا ہے، جو کہ کفر ہے۔

پرویزی اسلام میں صرف چار چیزیں حرام ہیں

اپنے مجلّے میں محمد صبیح ایڈووکیٹ کے ایک رسالے پر تبصرہ کرتے ہوئے اسے دادِ تحقیق دے کر لکھا ہے: ''سید محمد صبیح صاحب نے اس رسالہ میں بتایا ہے کہ قرآن کی رو سے صرف مردار، بہتا خون، لحم خنزیر اور غیر اللہ کے نام کی طرف منسوب چیزیں حرام ہیں، ان کے علاوہ اور کچھ حرام نہیں۔ یہ قرآن کا واضح فیصلہ ہے جس میں کسی قسم کے شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔ ہمارے مروجہ اسلام میں حلال وحرام کی جو طولانی فہرستیں ہیں، وہ سب انسانوں کی خود ساختہ ہیں اور کسی انسان کو حق حاصل نہیں کہ وہ کسی شے کو حرام قرار دے۔ یہ حق صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے۔''[1]

یہ صحیح ہے کہ قرآن کریم میں کھانے کی چیزوں میں سے صرف انھی چار کی تخصیص کی گئی ہے لیکن اولاً ہم الزامی طور پر کہہ سکتے ہیں کہ ان چار کے علاوہ انسانوں اور حیوانات کا پیشاب اور گندگی، بعض جانور بشمول سانپ، بچھو اور چھپکلی وغیرہ اور خود انسان کا بدن بھی حرام ہیں۔ شاید پرویزی حضرات ان تمام چیزوں کو حلال سمجھ کر استعمال کرتے ہوں۔ ہم یہ پوچھنے میں حق بجانب ہیں کہ ان چیزوں کو کس دلیل نے حرام کیا ہے؟ ہو سکتا ہے دنیا میں جو آدم خور موجود ہیں، وہ بھی پرویز صاحب کے مُقلّد ہوں۔

جبکہ تحقیقی طور پر ہم یہ کہتے ہیں کہ جس آیت میں ان مذکورہ چار چیزوں کا تذکرہ ہے

[1] ماہنامہ طلوع اسلام، مئی 1952ء۔

اس میں تمام حرام کھانوں کا بیان مقصود نہیں بلکہ صرف یہ مقصود ہے کہ یہ چار چیزیں بیان کی جائیں جو تمام ادیان سماویہ میں بالاتفاق حرام ہیں۔ ان کے علاوہ ہر دین میں الگ الگ حرام چیزیں یقیناً موجود ہیں لیکن اختلاف ادیان کی وجہ سے ان چیزوں کو مطلق حرام نہیں کہا جاتا، البتہ مذکورہ بالا چار چیزوں کے علاوہ بھی بعض دیگر اشیاء اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ کی وساطت سے حرام ٹھہرائی ہیں جو درج ذیل آیت میں اجمالی طور پر مذکور ہیں۔

﴿ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَٰٓئِثَ ﴾

"اور وہ (نبی ﷺ) ناپاک چیزوں کو ان کے لیے حرام ٹھہرائے گا۔"[1]

صحیح احادیث میں اس اجمال کی تفصیل موجود ہے۔ صحیح احادیث میں جن چیزوں کو کھانے سے منع کیا گیا ہے اگر عقل سلیم سے ان کا جائزہ لیا جائے اور ڈاکٹروں سے بھی ان کے متعلق پوچھا جائے تو وہ بتائیں گے کہ ان اشیاء میں فلاں فلاں خبائث اور مضرات موجود ہیں، یعنی نبی ﷺ نے احادیث میں جن چیزوں کو حرام قرار دیا ہے، عقل سلیم بھی ان کی حرمت کا تقاضا کرتی ہے تو عقل کے اندھے پرویزی ایسی احادیث کا کیوں کر انکار کرتے ہیں جو عقل کے عین مطابق ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان کا عناد صرف احادیث کے ساتھ ہے، خواہ وہ عقل کے موافق ہوں یا نہ ہوں۔

ارکانِ اسلام کی غلط تاویلات اور مسخرہ پن

اس سے پہلے نماز، روزہ، زکاۃ اور حج کے متعلق پرویزیوں کا عقیدہ بیان کیا گیا ہے۔ اب ارکانِ اسلام سے ان کے انکار کے دوسرے طریقے بیان کیے جاتے ہیں۔

[1] الأعراف 157:7.

نماز کے متعلق پرویزی خیالات

سورۂ نور کی تفسیر میں لکھتے ہیں: ’’اس سے واضح ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں اجتماعاتِ صلاۃ کے لیے کم از کم دو اوقات متعین تھے (فجر وعشاء) تب ہی تو قرآن کریم نے ان کا ذکر نام لے کر کیا ہے۔‘‘[1]

مزید لکھا ہے: ’’اگر جانشینِ رسول (قرآنی حکومت) نماز کی کسی جزئی شکل میں جس کا تعین قرآن نے نہیں کیا، اپنے زمانے کے کسی تقاضے کے تحت کچھ ردو بدل ناگزیر سمجھے تو وہ ایسا کرنے کی اصولاً مجاز ہوگی۔‘‘[2]

اس کے جواب میں فرمان الٰہی ملاحظہ فرمائیں۔ ارشاد ہوا:

﴿ حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَ الصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى ﴾

’’نمازوں کی حفاظت اور پابندی کرو خصوصاً درمیانی نماز کی۔‘‘[3]

کیا پرویز صاحب نے قرآن کریم میں یہ آیت نہیں دیکھی؟ ضرور دیکھی ہوگی، یہاں ﴿ الصَّلٰوةِ ﴾ کا لفظ جمع کے صیغہ ﴿ الصَّلَوٰتِ ﴾ کے ساتھ استعمال کیا گیا ہے جو عربی زبان میں حقیقی معنی میں تین اور تین سے زیادہ کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ دو پر جمع کا اطلاق مجازاً ہوگا۔ یہاں پر پرویز صاحب بلاضرورت حقیقت چھوڑ کر مجاز کی طرف گئے ہیں۔ اگر حقیقت تسلیم کرتے ہیں تو تیسری نماز کا اقرار کرنا ضروری ہے۔ مزید برآں ﴿ الصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى ﴾ پر غور کرنا بھی ہمارے لیے ضروری ہے کیونکہ ﴿ الْوُسْطٰى ﴾ کا معنی ہے ’’درمیان‘‘ یعنی جس کے دو طرف برابر ہوں۔ اگر ﴿ الصَّلَوٰتِ ﴾ دو ہیں تو پھر ان میں سے وسطیٰ کس کو کہا جائے گا؟ لہٰذا لازمی طور پر دو سے زیادہ ماننا پڑے گا، چنانچہ عربی الفاظ کے تقاضے کی

[1] لغات القرآن: 1043/3 تفسیر آیت: 58. [2] قرآنی فیصلے، ص: 15,14. [3] البقرۃ 2:238.

وجہ سے اس آیت کا اطلاق پانچ سے کم نمازوں پر نہیں ہوتا۔ اس موضوع پر پہلے بحث گزر چکی ہے۔[1]

اسی طرح اس آیت

﴿ اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ ﴾

''سورج کے ڈھلنے سے رات کے اندھیرے تک نمازیں پڑھا کرو۔''[2]

کی تشریح بھی گزر چکی ہے۔ کیا ﴿ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ ﴾ اور ﴿ غَسَقِ الَّيْلِ ﴾ نماز فجر اور نماز عشاء کو کہا جا سکتا ہے؟ ہرگز نہیں! کیونکہ دلوك کا معنی ''زوال'' ہے یا ''غروب۔'' زوال معنی کیا جائے تو پھر نماز ظہر اور عصر اس میں شامل ہوں گی اور اگر غروب معنی کیا جائے تو اس میں نماز مغرب شامل ہوگی۔

بہر صورت صَلاۃ کو صرف دو اوقات کے ساتھ خاص کرنا اور یہ عقیدہ رکھنا کہ صرف دو نمازیں (فجر اور عشاء) فرض ہیں، یہ ان کی جانب سے کفر کا اختلاط ہے کیونکہ ایک آیت ماننا اور دوسری آیات سے انکار کرنا ﴿ اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ﴾ کا لازم مصداق بنتا ہے۔

اسی طرح نماز کا طریقہ بھی صرف اور صرف رسول اللہ ﷺ سے منقول ہے اس طریقے میں کسی جانشینِ رسول کو بھی ردو بدل کرنے کا اختیار دینا اجرائے رسالت کا دروازہ کھولنا ہے۔ عبادات میں ردو بدل مستقل تشریعی کام ہے اور تشریعی کام اللہ تعالیٰ کی اجازت سے صرف رسول اللہ ﷺ کے ذمے ہوتے ہیں، کسی غیر رسول کو تشریعی اختیار دینا عین شرک ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ اَمْ لَهُمْ شُرَكٰٓؤُا شَرَعُوْا لَهُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا لَمْ يَاْذَنْۢ بِهِ اللّٰهُ ﴾

---

[1] ص 38: 91-92۔ [2] بنی إسرآءیل 17:78۔

''کیا ان کے کچھ شریک ہیں جنھوں نے ان کے لیے دین کا وہ طریقہ نکالا ہے کہ جس کا اللہ تعالیٰ نے حکم نہیں دیا۔''[1]

اور یہ اجرائے رسالت کا فاسد نظریہ درحقیقت مرزا غلام احمد کی موافقت اور تقلید کا اثر ہے پرویز لکھتا ہے:

''سجدہ سے مراد ہی قانون خداوندی کی اطاعت ہے، یعنی سجدہ پر غیر خداوندی قانون کی اطاعت سے انکار، رکوع کے معنی قانون خداوندی کی عملی تصدیق اور اس کے سامنے جھک جانا ہے۔''[2]

اگر سجدہ اور رکوع کا یہی معنی ہے تو پھر ﴿ اَطِيْعُوا اللّٰهَ ﴾ کا کیا معنی ہے؟ جس کا ذکر بار بار قرآن کریم میں موجود ہے۔ زمین پر ایک خاص ہیئت کے ساتھ پیشانی اور ناک رکھ کر سجدہ کرنا اطاعت الٰہی ہے اور رکوع میں گردن اور کمر خاص ہیئت میں جھکانا اطاعتِ الٰہی ہے لیکن اس کے برعکس یہ مراد لینا بالکل غلط اور باطل ہے کہ زمین پر پیشانی رکھے اور کمر جھکائے بغیر صرف قانونِ الٰہی کی اطاعت ہی سجدہ اور رکوع ہے، یعنی کسی انسان نے صبح کے وقت اور عشاء کے وقت اطاعتِ الٰہی کی تو پرویزی اسلام کے مطابق اس شخص کی نماز ہوگئی، حالانکہ سجدہ اور رکوع کا یہ معنی لغت میں ہے نہ شرع میں۔ پرویزیوں سے کوئی یہ تو پوچھے کہ آپ کے نزدیک یہ اطاعتِ قانونِ خداوندی ہے کیا چیز؟

زکاۃ کے متعلق پرویزی خیالات

پرویز نے لکھا ہے: ''قرآن نے زکاۃ کا حکم دے کر اس کی شرح اور قیود کو غیر متعین چھوڑ دیا ہے تاکہ ہر زمانے کی اسلامی حکومت اپنی اپنی ضروریات کے مطابق اسے خود

[1] الشوریٰ 42:21. [2] سلیم کے نام خط، ص: 209، 210.

متعین کرتی رہے۔ قرونِ اولیٰ میں اگر خلافتِ راشدہ نے اپنے زمانے کی ضرورت کے مطابق اڑھائی فی صد مناسب سمجھا تھا تو اس وقت یہی شرح شرعی تھی۔ اگر آج کوئی اسلامی حکومت کہے کہ اس کی ضروریات کا تقاضا بیس فی صد ہے تو یہی بیس فی صد شرعی شرح قرار پائے گی۔''[1]

ایک شخص کے جواب میں لکھا ہے: ''زکاۃ کے متعلق قرآن میں حکومت کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ مسلمانوں سے زکاۃ وصول کرے فرمایا:

﴿ خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً ﴾[2]

اس لیے زکاۃ اس ٹیکس کے سوا اور کچھ نہیں جو اسلامی حکومت مسلمانوں پر عائد کرے۔ اس ٹیکس کی کوئی شرح متعین نہیں کی گئی، اس لیے کہ شرح زکاۃ کا انحصار ضروریات ملّی پر ہے حتیٰ کہ ہنگامی صورتوں میں وہ سب کچھ لے سکتی ہے جو کسی کی ضرورت سے زائد ہو۔

﴿ وَيَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ڛ قُلِ الْعَفْوَ ﴾[3]

لہٰذا جب کسی جگہ اسلامی حکومت نہ ہو تو زکاۃ بھی باقی نہیں رہتی۔[4]

پرویز صاحب کے اس کلام سے چند باتیں سامنے آتی ہیں:

1. ''قرآن نے زکاۃ کی شرح متعین نہیں کی۔'' میں کہتا ہوں یہ غلط ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ﴾

''اور جو کچھ تمھیں اللہ کے رسول دیں وہ لے لو۔''[5]

اس آیت کریمہ میں وہ تمام احادیث شامل ہیں جن میں زکاۃ کی شرح کا تعین کیا گیا ہے۔

① سلیم کے نام خط، ص: 82-83. ② التوبة 9:103. ③ البقرة 2:219. ④ قرآنی فیصلے، ص: 35. ⑤ الحشر 59:7.

2 ''خلافتِ راشدہ نے زمانہ کی ضرورت کے مطابق زکاۃ کی مقدار (اڑھائی فی صد) متعین کی تھی۔'' اس کا جواب یہ ہے کہ کیا خلفائے راشدین نے نبی ﷺ کی مقرر کردہ مقدار سے انحراف کر کے اپنی طرف سے کوئی مقدار متعین کی تھی؟ ہرگز نہیں! انھوں نے بعینہٖ وہی مقداریں مقرر کی تھیں جو صحیح مرفوع احادیث میں مذکور تھیں۔ انھوں نے ان مقداروں میں کوئی رد و بدل نہیں کیا تو پھر ان کے بعد کسی شخص کو ان مقداروں میں رد و بدل کرنے کا اختیار دینا خلافتِ راشدہ کے طریق سے انحراف ہوگا اور یہ انحراف قطعاً ظلم ہوگا۔

3 ''اگر آج کوئی اسلامی حکومت کہے کہ اس کی ضرورت کا تقاضا بیس فی صد ہے تو بیس فی صد شرح ہی شرعی زکاۃ ہوگی۔'' پرویز صاحب کے اس فاسد نظریے کا مطلب یہ ہے کہ اسلامی حکومت کو نبی ﷺ اور خلفائے راشدین کا طریقہ بدلنے کا اختیار حاصل ہے۔ اس سے لازم آتا ہے کہ نبی ﷺ کے بعد کوئی دوسرا شارع بن سکتا ہے اور وہ تب ہی شارع بن سکتا ہے جب وہ منصبِ رسالت پر فائز ہو، لہٰذا پرویز صاحب نے رسالت کا دروازہ کھول دیا اور یہی مرزائیت ہے۔

4 ''زکاۃ کی وصولی کے لیے اسلامی حکومت لازمی ہے۔'' بہت سی وجوہات کی بنا پر یہ نظریہ بھی باطل ہے۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ مکی سورتوں (مومنون، ذاریات اور معارج) میں زکاۃ ادا کرنے کی ترغیب دی گئی ہے تو کیا مکہ میں اسلامی حکومت موجود تھی؟ دوسری وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَالَّذِيْنَ فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ ○ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ○ ﴾

''اور یہ وہ لوگ ہیں جن کے مالوں میں سائلین اور محروم لوگوں کے لیے متعین حق ہے۔''[1]

[1] المعارج 70:24.

اس آیت میں ﴿حَقٌّ مَّعْلُومٌ﴾ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ قرآنی اصطلاح میں معلوم وہی چیز ہے جس کا علم وحی کے ذریعے سے حاصل ہو اور وحی کے ذریعے سے وہی مقداریں طے شدہ ہیں جو نبی ﷺ کی احادیث میں موجود ہیں۔ اگر کوئی حکومت ان مقداروں میں تبدیلی کرتی ہے تو وہ ﴿حَقٌّ مَّعْلُومٌ﴾ کو بدلتی ہے جو قرآن کریم کی صریح مخالفت ہے۔

5 ''اسلامی حکومت ضرورت کے تحت سب کچھ لے سکتی ہے۔''

یہ نظریہ قرآن کی ان آیات سے متصادم ہے جن میں لفظ ﴿مِنْ﴾ استعمال کیا گیا ہے۔ اور ﴿مِنْ﴾ تبعیض کے لیے (کچھ کا معنی بیان کرتا) ہے، یعنی بعض مال خرچ کرنا، بعض مال صدقہ کرنا۔ جیسے فرمایا:

﴿وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝﴾

''اور جو ہم نے انھیں رزق دیا ہے وہ اس میں سے کچھ خرچ کرتے ہیں۔''[1]

اور ﴿الْعَفْوَ﴾ کا یہ مطلب نہیں کہ کل مال خرچ کر دیا جائے یا سارا مال صدقے میں لے لیا جائے کیونکہ اس لفظ کے معنی ہیں: ''زائد از ضرورت'' یعنی اضافی، تو یہ لفظ کہ ''ضرورت سے زیادہ ہو'' اس ضرورت سے زائد مال کی مقدار کے تعین کے لیے پرویز صاحب کے پاس کیا دلیل ہے؟ اور اگر استدلال میں لفظ مِنْ پیش کیا جائے تو ضرورت اور تبعیض سے مراد وہ مقدار ہے جو شریعت نے مقرر کی ہے کیونکہ انسانوں کی ضروریات میں لازمی طور پر فرق ہوتا ہے۔ اگر کوئی شخص کہے کہ میرے پاس میری ضرورت سے زائد کچھ بھی نہیں تو پھر اسے کیا کہا جائے گا؟ ''پس ضرورت سے زیادہ'' سے مراد وہ زیادہ ہے جسے شریعت نے زیادہ کہا، یعنی مقررہ نصاب سے زیادہ خرچ کرنا۔

[1] البقرة 2:3.

روزہ، حج اور قربانی کے متعلق پرویزی عقیدہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔

انفرادی ملکیت سے انکار اور پرویزی دلائل

1 ﴿قُلِ الْعَفْوَ﴾ ''کہہ دیجیے کہ جو زائد از ضرورت ہے۔'' اس دلیل کا جواب پہلے دیا جا چکا ہے، اس کے علاوہ یہ آیت ذاتی ملکیت کے اثبات میں دلیل ہے کیونکہ ذہن میں یہ سوال اٹھتا ہے کہ جو چیزیں اس شخص کی ضروریات پوری کرنے کے لیے ہیں کیا وہ اس شخص کی ذاتی ملکیت نہ ہوں گی؟ کیوں نہیں! ضرور ہوں گی۔

2 ﴿وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ ۚ فَمَا الَّذِيْنَ فُضِّلُوْا بِرَآدِّيْ رِزْقِهِمْ عَلٰى مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَهُمْ فِيْهِ سَوَآءٌ ۭ﴾

''اور اللہ نے روزی کے معاملے میں بعض کو بعض پر فضیلت دے رکھی ہے، پس وہ لوگ جن کو فضیلت دی گئی ہے وہ اپنی روزی انھیں نہیں دیتے جو ان کے غلام ہیں کہ وہ اس (روزی) میں برابر ہو جائیں۔''[1]

پرویز صاحب نے اس کے ترجمے میں تحریف کرتے ہوئے لکھا ہے:

''اس کا خلاصہ یہ ہے کہ رزق سے مراد اکتسابی استعداد ہے جس کی وجہ سے ماحصل میں فرق ہوتا ہے، پھر یہ معاشی فضیلت حاصل کرنے والے کم استعداد والوں کو اپنی زائد پیداوار نہیں لوٹاتے کیونکہ یہ لوگ معاشرہ کی برابری کے منکر ہیں۔''[2]

تبصرہ: اس آیت میں انفرادی ملکیت صراحت سے ثابت ہو رہی ہے کہ معاشرے میں ایسے لوگ موجود ہوتے ہیں جن کے پاس فاضل دولت موجود ہوتی ہے اور ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو نادار ہوتے ہیں۔ دونوں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں، البتہ پرویز صاحب نے مفہوم بیان کرنے میں شکوہ ظاہر کیا ہے کہ یہ امراء اپنی فاضل دولت غریبوں کو

① النحل 71:16. ② قانون ربوبیت، ص: 139.

نہیں دیتے تا کہ طبقاتی ناہمواری ختم ہو جائے لیکن بطور جواب شکوہ یہ نہیں کہا گیا کہ حکومت پر لازم ہے کہ امراء سے زیادہ دولت چھین لے اور ساری دولت اپنے قبضے میں لے لے۔ وہ تو قرآن میں اس طرح مذکور ہے:

﴿ خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً ﴾

''ان کے مال میں سے صدقہ لے لیں۔''[1]

یہ نہیں فرمایا کہ ان کا سارا مال لے لیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ اس آیت کا جو مفہوم پرویز صاحب نے لیا ہے وہ تو سراسر تحریف ہے۔ آیت کے سیاق وسباق کا بغور مطالعہ کریں، اللہ تعالیٰ مشرکین کی تردید کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ انسانی فطرت کے لحاظ سے مالک اپنے ملازم کو اپنے ساتھ سرمایہ داری میں برابر کا شریک نہیں کرتا اور ایسا کرنا ممکن بھی نہیں کیونکہ پھر مالک اور ملازم میں لفظی فرق بھی بے مقصد ہوگا۔ جب مالک اور ملازم ایک کاروبار میں برابر شریک نہیں ہو سکتے تو یہ مشرک کس طرح عقیدہ رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بعض بندوں کو اتنی قدرت اور اختیار دے رکھا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس کی قدرت مستقلہ کی صفت میں شریک ہو جائیں اور وہ مخلوق کی حاجت روائی کریں۔ اگر آیت میں پرویزی خیال کے مطابق مساوات قائم کرنا مراد ہو تو پھر مشرک لوگ کیوں کر قابل مذمت قرار پائیں گے؟

حاصل کلام یہ ہے کہ جس آیت میں شرک کی تردید مقصود ہوتی ہے تو پرویز صاحب اس آیت سے شرک کا درست ہونا ثابت کرتے ہیں۔

تیسری بات یہ ہے کہ پرویز صاحب کہتے ہیں کہ قرآن کریم نے رسول اللہ ﷺ کی ذاتی ملکیت کا ذکر نہیں فرمایا بلکہ حدیث میں وارد ہے:

---

① التوبة 9:103۔

«إِنَّا لَا نُورَثُ نَحْنُ مَعْشَرُ الْأَنْبِيَاءِ لَا نَرِثُ وَلَا نُورَثُ مَا تَرَكْنَا صَدَقَةٌ»

''ہم انبیاء کی جماعت نہ وارث بنتے ہیں نہ مورث بلکہ ہمارا متروک مال صدقہ ہے۔''[1]

تبصرہ: اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں نبی ﷺ کی ذاتی ملکیت کا ذکر فرمایا ہے:

﴿ وَاعْلَمُوٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ ﴾

''اور جان لو کہ جو چیز بطور غنیمت تمھارے ہاتھ آئے تو اس میں سے پانچواں حصہ اللہ اور اس کے رسول کا ہے۔''[2]

نیز فرمایا:

﴿ مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ ﴾

''اور ان دیہات والوں سے اللہ نے اپنے رسول کو جو دلوایا ہے تو وہ اللہ اور رسول کے لیے ہے۔''[3]

تو کیا ان دونوں آیتوں میں ﴿ وَلِلرَّسُوْلِ ﴾ ''رسول کے لیے'' سے رسول ﷺ کی ذاتی ملکیت ثابت نہیں ہوتی؟ یہ قرآن ہے جس سے صراحتاً رسول کی ذاتی ملکیت ثابت ہوئی اور حدیث میں ذاتی ملکیت کی نفی نہیں بلکہ وراثت کی نفی ہے اور یہ انبیاء علیہم السلام کی خصوصیت ہے کیونکہ امت کے لیے قرآن کریم میں آیات میراث موجود ہیں۔

اسی طرح باغ فدک، جو اہلِ سنت و اہلِ تشیع، دونوں کے نزدیک مشہور ہے، وہ بھی

---

[1] یہ حدیث اگرچہ صحیحین میں موجود ہے لیکن وہاں اس کے الفاظ مختصر ہیں اور پرویز صاحب کے الفاظ مجھے نہیں مل سکے۔ (ناصر) صحیح البخاري، المغازي، باب غزوة خيبر، حديث: 4241، وصحيح مسلم، الجهاد، باب قول النبي ﷺ: (لانورث......) حديث: 1758. [2] الأنفال 41:8.
[3] الحشر 7:59.

نبی ﷺ کے زیر تصرف تھا۔ آپ ﷺ کی وفات کے بعد فاطمہ رضی اللہ عنہا نے اسے ورثہ سمجھتے ہوئے اس میں سے وراثت کا مطالبہ کیا تھا جبکہ ابو بکر رضی اللہ عنہ نے حدیث کے ذریعے سے نبی ﷺ کی خصوصیت بیان کی تھی کہ انبیاء علیہم السلام جو ترکہ چھوڑیں وہ ورثاء کو نہیں ملے گا بلکہ وہ صدقہ ہوگا۔

انفرادی ملکیت کے اثبات میں قرآنی دلائل

1 اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَهُوَ الَّذِي جَعَلَكُمْ خَلَائِفَ الْأَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ لِّيَبْلُوَكُمْ فِي مَا آتَاكُمْ﴾

''اللہ وہی ہے جس نے تمھیں زمین میں جانشین بنایا اور تم میں سے بعض کو درجوں میں بعض پر فضیلت دی تاکہ جو کچھ تمھیں دیا ہے اس میں تمھیں آزمائے۔''[1]

اس آیت میں دو جملے ہیں پہلے جملے میں بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو زمین پر بسایا اور ان کی معیشت کے لیے مختلف اسباب پیدا کیے۔ دوسرے جملے میں بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے فہم و فراست اور مال و عزت کے لحاظ سے بعض انسانوں کو بعض پر فوقیت دی ہے اور پھر یہ چیزیں عطا کر کے اللہ تعالیٰ انھیں آزماتا ہے اور یہ آزمائش تب ہی ممکن ہے کہ یہ چیزیں انسان کی ملکیت ہوں۔

2 اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَكَذَٰلِكَ فَتَنَّا بَعْضَهُم بِبَعْضٍ لِّيَقُولُوا أَهَٰؤُلَاءِ مَنَّ اللَّهُ عَلَيْهِم مِّن بَيْنِنَا﴾

[1] الأنعام 165:6.

''اور اسی طرح ہم نے بعض انسانوں کے ذریعے بعض کو آزمائش میں ڈال رکھا ہے تاکہ یہ لوگ کہیں کہ کیا ان لوگوں کو اللہ نے ہمارے درمیان میں سے فضل و احسان کے لیے چن لیا ہے۔''[1]

اس آیت کے سیاق وسباق سے معلوم ہوتا ہے کہ کافر لوگ مال دار تھے جبکہ صحابۂ کرام میں سے اکثر مسکین تھے۔ کافر کہنے لگے: یہ کیسے ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ان مسکینوں ہی پر (نعمت اسلام کا) احسان فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے اس آزمائش کی نسبت اپنی طرف فرمائی جو لفظ ﴿فَتَنَّا﴾ ''ہم نے آزمائش کی'' سے ظاہر ہے۔

3 اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ﴾

''اور اللہ نے روزی کے معاملے میں بعض کو بعض پر فضیلت دے رکھی ہے۔''[2]

اس آیت کی تشریح چند صفحات پہلے گزر چکی ہے بلکہ آیت کے اندر ہی مالک اور مملوک کا تقابلی ذکر ہے، پس مملوک مالک کے لیے ایک ذاتی ملکیت ہے۔

4 اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ضَرَبَ لَكُمْ مَّثَلًا مِّنْ اَنْفُسِكُمْ ؕ هَلْ لَّكُمْ مِّنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ شُرَكَآءَ فِيْ مَا رَزَقْنٰكُمْ﴾

''اس (اللہ تعالیٰ) نے تمھارے لیے (توحید کی) ایک مثال تمھی میں سے بیان کی ہے کہ کیا جن (غلاموں) کے تم مالک ہو ان میں سے کوئی ہے جو اس روزی میں جو ہم نے تمھیں دے رکھی ہے تمھارے برابر کا شریک ہو۔''[3]

اس آیت میں بھی مالک اور مملوک کا بطور مثال تقابل پیش کیا ہے تو مملوک وہ ہے جو

[1] الأنعام 53:6. [2] النحل 71:16. [3] الروم 28:30.

مالک (مولیٰ) کی ذاتی ملکیت ہو۔

5 اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ اَهُمْ يَقْسِمُوْنَ رَحْمَتَ رَبِّكَ ؕ نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا ﴾

''کیا وہ آپ کے رب کی رحمت کو تقسیم کرنا چاہتے ہیں۔ ہم نے ان کی روزی دنیا میں ان کے درمیان تقسیم کر رکھی ہے اور بعض کو بعض پر فضیلت دے رکھی ہے تا کہ وہ ایک دوسرے سے کام لیتے رہیں۔''[1]

آیت کے شروع میں مشرکین کے اس زعم کا رد کیا ہے کہ وہ محمد ﷺ کو نبوت ملنے پر اعتراض کرتے تھے کہ یہ مسکین شخص ہے، اس کے مقابلے میں طائف اور مکہ کے کسی مال دار شخص کو نبوت ملنی چاہیے تھی۔ اللہ تعالیٰ نے جواب دیا کہ نبوت اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے اور اللہ تعالیٰ اپنی رحمت خود تقسیم کرتا ہے کسی کو اس کی تقسیم کا اختیار نہیں دیتا۔ یہ تو نبوت ہے اللہ تعالیٰ نے دنیوی وسائل و اسباب کی تقسیم اپنے ہاتھ میں رکھی ہے کہ اس نے اس میں بھی بعض کو بعض پر فضیلت دے رکھی ہے اور اس فضیلت کی حکمت بیان کرتے ہوئے فرمایا: مال دار لوگ مزدوروں سے خدمت لے سکیں۔ اس سے ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے بعض لوگوں کو مال عطا فرما کر انھیں ذاتی ملکیت کا حق عطا فرمایا۔

6 اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ ﴾

''اور اس شخص نے اللہ کی محبت میں قریبی رشتہ داروں، یتیموں اور مسکینوں کو مال دیا۔''[2]

[1] الزخرف 32:43. [2] البقرة 177:2.

اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں اعمال خیر کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ اپنے مال میں سے کچھ حصہ رشتہ داروں، یتیموں اور مسکینوں کو دیتا ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ جو شخص جو مال دیتا ہے وہ اس مال کا ذاتی مالک ہے۔ اگر وہ مال اس کی ذاتی ملکیت میں نہ ہوتو وہ کیسے خرچ کرسکتا ہے؟ اس سے بھی واضح ہوا کہ معاشرے میں اللہ کی تقسیم کے مطابق بعض لوگ مال دار ہوتے ہیں اور بعض محتاج۔

⑦ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ ﴾

''اور جو اس کی طاقت رکھیں کہ فدیہ دے سکیں تو ان کے ذمہ ایک مسکین کا کھانا کھلانا ہے۔''[1]

اس سے معلوم ہوا کہ فدیہ دینے والا ذاتی ملکیت رکھتا ہے اور معاشرے میں مسکین بھی موجود ہے جو فدیہ لینے کا مستحق ہے۔

⑧ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ فَكَفَّارَتُهٗٓ اِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسٰكِيْنَ ﴾

''پس اس (قسم توڑنے) کا کفارہ دس مسکینوں کو کھانا کھلانا ہے۔''[2]

معاشرے میں قسم اٹھائی جاتی ہے اور بعض اوقات قسم توڑنی پڑتی ہے تو قسم توڑنے کی صورت میں کفارہ مقرر کیا گیا ہے اور اس کی پہلی صورت دس مسکینوں کو کھانا کھلانا ہے۔ اگر کسی کی ذاتی ملکیت ہی نہ ہوتو پھر وہ اس کفارے کی ادائیگی کیسے کرے گا؟

⑨ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ فَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَاِطْعَامُ سِتِّيْنَ مِسْكِيْنًا ﴾

① البقرۃ 2:184۔ ② المآئدۃ 5:89۔

''پس جو اس کی استطاعت نہ رکھے تو وہ ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلائے۔''[1]

اس آیت میں بھی ذاتی ملکیت کا ثبوت ملتا ہے۔ ملکیت ہوگی تو ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلایا جائے گا اور ظہار کا کفارہ ادا ہو سکے گا۔

قرآن کریم میں زکاۃ کا حکم دیا گیا ہے اور یہ ارکان اسلام میں سے ہے اگرچہ پرویزی اسلام میں اس کا نام حکومتی ٹیکس ہے۔ زکاۃ تبھی ادا ہوگی جب کوئی شخص کسی مال کا ذاتی طور پر مالک ہوگا۔ اگر اسلام میں ذاتی ملکیت کا تصور نہ ہو تو پھر زکاۃ کا حکم عبث معلوم ہوتا ہے جبکہ اللہ تعالیٰ کا کوئی بھی حکم عبث نہیں۔ تاریخ اسلام میں مذکور ہے کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے منکرین زکاۃ کے ساتھ جہاد کیا تھا۔

حج بھی ارکان اسلام میں سے ہے اس سے انکار کفر ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا ؕ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ۝﴾

''اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسے لوگوں پر حج کرنا فرض ہے جو وہاں تک پہنچنے کی استطاعت رکھتے ہوں اور جو شخص انکار کردے تو اللہ تمام دنیا سے بے نیاز ہے۔''[2]

استطاعت کا مطلب یہ ہے کہ حج کا ارادہ رکھنے والے شخص کے پاس اتنا مال ہو جو اس کے زادِ راہ اور اس کے اہل و عیال کے اخراجات کے لیے کافی ہو تو یہ تب ہی ممکن ہے جب وہ اس مال کا ذاتی طور پر مالک ہو۔ اگر ذاتی ملکیت کا تصور ختم ہو جائے تو پھر حج کا رکن ساقط ہو جائے گا کیونکہ کوئی شخص انفرادی طور پر اتنا مال نہیں رکھ سکے گا جو اس کے زادِ راہ اور اہل و عیال کے لیے کافی ہو۔

اسلام میں میراث کا معاملہ پوری طرح کارفرما ہے۔ مرنے والے کے وارثوں کے

[1] المجادلة 4:58. [2] آل عمرٰن 97:3.

لیے ورثے کے حصے مقرر ہیں۔ سورۂ نساء (4 آیت 12,11 و 176) میں اس معاملے کی تفصیل آئی ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ انسان ذاتی طور پر ہر مال کا مالک ہوسکتا ہے تبھی تو اس کے مرنے کے بعد اس کا مال وارثوں میں تقسیم ہوگا، نیز یہ بھی ثابت ہوا کہ انفرادی ملکیت میں نظریہ مساوات غلط ہے۔

ان دلائل سے ثابت ہوا کہ انفرادی اور ذاتی ملکیت سے انکار کرنا قرآن کریم اور ارکانِ اسلام سے انکار کرنا ہے، لہٰذا پرویزی اسلام یقیناً نبوی اسلام کا مکمل طور پر مدمقابل اور مخالف ہے۔

احادیث کا انکار اور ان سے تمسخر

چونکہ یہ مسئلہ پرویزیت کی بنیاد ہے اس بارے میں غلام احمد پرویز کی بے شمار تلبیسات اور عبارات ہیں ہم ان میں سے بعض نقل کرنے پر اکتفا کریں گے۔

1 لکھا ہے: ''مسلمانوں کو قرآن سے دور رکھنے کے لیے جو سازش کی گئی ہے اس کی پہلی کڑی یہ عقیدہ پیدا کرنا تھا کہ رسول اللہ کو اس وحی کے علاوہ جو قرآن میں محفوظ ہے ایک اور وحی بھی دی گئی تھی جو قرآن کے ساتھ بالکل قرآن کے ہم پلہ ہے۔ یہ وحی روایات میں ملتی ہے، اس لیے روایات عین دین ہیں۔ یہ عقیدہ پیدا کیا گیا اور اس کے ساتھ روایات سازی کا سلسلہ شروع کردیا گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے روایات کا ایک انبار جمع ہوگیا۔ اسی طرح اس دین کے مقابل جو اللہ تعالیٰ نے دیا تھا ایک اور دین مدون کر کے رکھ دیا اور اس کو اتباع سنت رسول اللہ قرار دے کر امت کو اس میں الجھا دیا۔''[1]

تبصرہ: اس سے پہلے ثابت کیا گیا ہے کہ وحی (غیر متلو) قرآن کریم کی آیات سے صراحت کے ساتھ ثابت ہے، پس یہ عقیدہ کسی غیر کی سازش نہیں بلکہ اس سے انکار کرنا

[1] مقام حدیث: 421/1 از پرویز۔

ابلیسی سازش ہے اور یہ کہنا کہ روایات سازی کا سلسلہ شروع کیا گیا، پرویز صاحب نے اس اقتباس میں ساری احادیث کو موضوع قرار دے دیا، حالانکہ انھوں نے خود اعتراف کیا ہے کہ وہ احادیث جو قرآن کے مطابق یا عقل کے موافق ہوں میں انھیں مانتا اور تسلیم کرتا ہوں۔ ایسی تضاد بیانی باطل پرستوں کا کام ہے اور ان کا یہ کہنا کہ وحی کے ذریعے سے ایک اور دین مدون کر کے رکھ دیا، یہ بھی ہرزہ سرائی ہے کیونکہ وحیِ غیر متلو قرآن کے مقابل نہیں بلکہ اس کی شرح اور تفصیل ہے، جیسا کہ گذشتہ ابواب میں ثابت کیا گیا ہے۔

2 مزید لکھا ہے: ''بہر حال جھوٹ پہلی سازش کے تحت بولا گیا یا بعد میں ابلہانِ مسجد نے نیک کاموں کے لیے اس جھوٹ کی حمایت کی، نتیجہ دونوں کا ایک ہے، یعنی یہ جھوٹ مسلمانوں کا مذہب بن گیا۔ وحیِ غیر متلو اس کا نام رکھ کر اسے قرآن کے ساتھ قرآن کی مثل ٹھہرایا گیا۔''[1]

پرویز صاحب نے اس اقتباس میں یہ تصریح کی ہے کہ مسلمانوں کا مذہب (حدیث) جھوٹ ہے۔ علمائے حدیث کو ابلہان مسجد کا خطاب دے دیا۔ یہ بات باعث شرم ہے کہ دین کے علم برداروں کو ابلہان کہا جائے اور دین کے مفسدین اور منکرین حدیث کو مصلحان۔ یہ صاحب تو اس آیت کریمہ کا مصداق قرار پاتے ہیں:

﴿ وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ قَالُوا إِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُونَ ۝ ﴾

''اور جب انھیں کہا جاتا ہے کہ تم زمین میں فساد مت پھیلاؤ تو وہ کہتے ہیں ہم تو صرف اصلاح کرنے والے ہیں۔''[2]

3 پرویز صاحب کی کتاب مقام حدیث پڑھیے آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ احادیث کا کتنا تمسخر اڑایا گیا ہے۔ چند نمونے ملاحظہ فرمائیں:

① مقام حدیث: 122/2. ② البقرۃ 11:2.

''اور (احادیث) جو ملا کی غلط نگہی اور کوتاہ اندیشی سے ہمارے دین کا جز بن رہی ہے دیکھیے کہ انھی احادیث کی رو سے وہی جنت جس کے حصول کا قرآنی طریقہ پر مذکور ہے کتنے سستے داموں ہاتھ آجاتی ہے؟ لیجیے اب روایات کی رو سے جنت کے ٹکٹ خریدیے دیکھیے کتنی سستی جا رہی ہے۔''

''سب سے پہلے السلام علیکم کیجیے اور ہاتھ ملائیے، جنت مل گئی۔''

ابو داود کی روایت میں ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: ''کہ جب دو مسلمان مصافحہ کرتے ہیں تو ان دونوں کے جدا ہونے سے پہلے اللہ تعالیٰ انھیں بخش دیتا ہے۔''[1]

''اب مسجد میں چلیے اور وضو کیجیے جنت حاضر ہے۔ مسلم کی حدیث ہے کہ وضو کرنے والے کے تمام گناہ پانی کے ساتھ ٹپکتے جاتے ہیں یہاں تک کہ پانی کا آخری قطرہ ہر عضو کے آخری گناہ کو ساتھ لے کر ٹپکتا ہے۔''[2]

کہیے کس قدر سستی رہی جنت! وضو کیا تو تمام گناہ اس کے پانی میں بہہ گئے اور اگر ساتھ دو رکعتیں نفل پڑھ لیے تو خود رسول اللہ ﷺ سے بھی آگے آگے جنت میں پہنچ گئے۔ اس سے بھی آسان مسلم[3] کی حدیث ہے کہ ''جو شخص مؤذن کے جواب میں اذان کے الفاظ دہراتا ہے تو یہ جنت میں جائے گا۔'' جسے قانون کی اصطلاح میں جرم کہا جاتا ہے اسے مذہب کی زبان میں گناہ کہتے ہیں۔ جرم ایک مرتبہ کا بھی کم نہیں ہوتا لیکن عادی مجرم کے لیے سوسائٹی میں کوئی جگہ ہی نہیں اس کے برعکس ملا کے مذہب نے جرائم کے لیے ایسا لائسنس دے رکھا ہے کہ صبح سے شام تک جرم پر جرم کیے جاؤ لیکن ساتھ نمازیں بھی پڑھتے جاؤ سب جرم معاف ہو جائیں گے۔ ترمذی[4] کی حدیث ہے کہ چالیس

[1] سنن أبي داود، الأدب، باب في المصافحة، حديث:5212. [2] صحيح مسلم، الطهارة، باب خروج الخطايا مع ماء الوضوء، حديث:244. [3] صحيح مسلم، الصلاة، باب استحباب القول مثل قول المؤذن......، حديث:385. [4] جامع الترمذي، الصلاة، باب ماجاء في فضل

دن تک تکبیر اولیٰ کے ساتھ نماز باجماعت ادا کرنے والا دوزخ اور نفاق دونوں سے بری کردیا جاتا ہے۔ لیجیے ایک چلہ پورا کرلیجیے اور عمر بھر کے لیے جو جی میں آئے کیجیے، دوزخ میں آپ کبھی نہیں جاسکتے۔[1]

نبوی اسلام والو! ذرا دیکھو! نبی ﷺ کی احادیث کا کیسے تمسخر اڑایا گیا ہے۔ قرآن کریم کی درج ذیل آیات کا مطالعہ کریں۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِينَ إِلَّا مُبَشِّرِينَ وَمُنْذِرِينَ وَيُجَادِلُ الَّذِينَ كَفَرُوا بِالْبَاطِلِ لِيُدْحِضُوا بِهِ الْحَقَّ وَاتَّخَذُوا آيَاتِي وَمَا أُنْذِرُوا هُزُوًا﴾

”ہم جو رسول بھیجتے رہے ہیں تو محض اس لیے کہ خوش خبری سنائیں اور عذاب سے ڈرائیں اور جو لوگ کافر ہیں وہ باطل کے ذریعے سے (رسولوں کے ساتھ) ناحق جھگڑتے ہیں تاکہ اس کے ذریعے سے حق وصداقت کو پھسلا دیں اور میری آیتوں کو اور جس سے انھیں ڈرایا جاتا ہے اسے انھوں نے ہنسی مذاق بنالیا۔“[2]

نیز فرمایا:

﴿ذَٰلِكَ جَزَاؤُهُمْ جَهَنَّمُ بِمَا كَفَرُوا وَاتَّخَذُوا آيَاتِي وَرُسُلِي هُزُوًا﴾

”یہی جہنم ان کی سزا ہے کیونکہ انھوں نے کفر کیا اور ہماری آیتوں اور رسولوں کا مذاق اڑایا۔“[3]

ان دونوں آیات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ پرویزی ان ارشادات ربانی کے مصداق ہیں۔ پہلی آیت میں رسول کا کام خوشخبری سنانا اور عذاب سے ڈرانا بیان کیا

التكبيرة الأولى، حديث: 241. [1] ان عبارات کے لیے دیکھیے، مقام حدیث: 2/96-100.
[2] الكهف 18:56. [3] الكهف 18:106.

گیا ہے۔ پرویز صاحب نے جو احادیث بیان کی ہیں وہ سب خوشخبری کے زمرے میں آتی ہیں مگر انھوں نے ان احادیث کا استہزا کیا، ان کی باطل تاویلات کیں اور ان کا تمسخر اڑایا ہے تاکہ یہ احادیث حق ثابت نہ ہوں۔

اس آیت میں ﴿وَمَآ اُنْذِرُوْا﴾ کے الفاظ ﴿اٰيٰتِيْ﴾ کے بعد آئے ہیں، لہٰذا یہ الفاظ احادیث کی طرف اشارہ کرتے ہیں کیونکہ ﴿اٰيٰتِيْ﴾ کا معنی ہے ''میری آیات'' اور ﴿وَمَآ اُنْذِرُوْا﴾ کے معنی ہیں: ''جس کے ذریعے سے وہ ڈرائے گئے'' اب میری آیات تو قرآن کریم ہوا اور جس چیز کے ذریعے سے وہ ڈرائے گئے، یقینی بات ہے کہ اس سے مراد احادیث ہیں، لہٰذا یہ لوگ قرآن اور حدیث کا تمسخر اڑاتے ہیں۔ مزید برآں پرویز صاحب سے یہ بھی پوچھا جاسکتا ہے کہ یہ احادیث قرآن یا عقل سے بھی متصادم نہیں جبکہ آپ کا دعویٰ ہے کہ جو حدیث قرآن اور عقل سے متصادم نہ ہو وہ صحیح ہوتی ہے، پھر تو خوشخبری والی یہ احادیث صحیح ہیں کیونکہ یہ آپ کے وضع کردہ اصول کے مطابق صحیح ہیں۔

قرآن کریم سے بھی یہی مفہوم واضح ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآىِٕرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَنُدْخِلْكُمْ مُّدْخَلًا كَرِيْمًا ۝﴾

''اگر تم ان بڑے بڑے گناہوں سے جن سے تمھیں منع کیا جاتا ہے باز رہو تو ہم ضرور تمھارے قصور (چھوٹے گناہ) معاف کردیں گے اور تمھیں ایک باعزت جگہ (جنت) میں داخل کریں گے۔''[1]

نیز فرمایا:

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ۚ﴾

[1] النسآء 4:31.

''بے شک اللہ یہ (جرم) نہیں بخشے گا کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا جائے اور اس کے سوا وہ جس کے گناہ چاہے گا بخش دے گا۔''[1]

نیز فرمایا:

﴿ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَیِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ الَّیۡلِ ؕ اِنَّ الۡحَسَنٰتِ یُذۡهِبۡنَ السَّیِّاٰتِ ؕ ﴾

''دن کے دونوں سروں اور رات کی گھڑیوں میں نماز پڑھا کیجیے۔ یقیناً نیکیاں برائیوں کو دور کر دیتی ہیں۔''[2]

اللہ تعالیٰ نے پہلی آیت میں صغیرہ گناہوں کی بخشش کے لیے کبیرہ گناہوں سے اجتناب کی شرط قائم کی ہے، یعنی اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اگر کوئی شخص کبیرہ گناہوں سے اجتناب کرے گا تو میں اس کے صغیرہ گناہ معاف کر دوں گا اور جنت میں داخل فرما دوں گا۔ دوسری آیت میں فرمایا کہ شرک کے سوا میں جس کے چاہوں گناہ معاف کر دوں گا جبکہ تیسری آیت میں فرمایا کہ نیک اعمال (نماز، وضو اور مصافحہ وغیرہ) گناہوں کا کفارہ ہیں۔

پرویز صاحب نے ان احادیث کو بطور استہزا پیش کیا ہے جن میں خوش خبری سنائی گئی ہے تو انھیں چاہیے کہ (نعوذ باللہ) وہ متعلقہ آیات کریمہ کا بھی استہزا کریں کیونکہ جو خوش خبری احادیث میں ہے وہی آیات میں ہے۔ ان آیات اور احادیث کا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ صحیح شرعی ایمان اللہ تعالیٰ کو اتنا پسند ہے کہ وہ اس کی بدولت کبھی تو ویسے ہی گناہ معاف کر دیتا ہے اور کبھی کسی ایک نیک عمل کے باعث گناہ معاف فرما دیتا ہے اور مستحق جنت بھی عطا کر دیتا ہے، البتہ جن لوگوں کے پاس صحیح شرعی ایمان نہیں، جیسے پرویزی ہیں، ان کے لیے یہ بشارتیں سہل نہیں، لہٰذا وہ مستحق جنت حاصل نہیں کر سکتے۔

[1] النسآء 116:4۔ [2] ھود 114:11۔

اسی لیے وہ ایسی نصوص کے ساتھ استہزا کرتے ہیں۔

4 ایک جگہ لکھتے ہیں: ''لیکن دین میں حجت کے طور پر وہ (حدیث) پیش نہیں کی جاسکتی اس (حدیث) کو دین بنالینے سے بڑا نقصان ہوا ہے کہ قرآن کریم جو سراسر زندگی ہے حجاب میں آگیا ہے۔''[1]

پرویز صاحب کا مطلب یہ ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کی مرتب کردہ جزئیات (احادیث) دین، شریعت اور مذہب نہیں ہیں بلکہ قرآن کے لیے حجاب ہیں اور پرویز کے نظریے کے مطابق ہر زمانے کے مسلمانوں کا اجتماعی نظام (امام وقت) جو قرآنی اصولوں کے مطابق جزئیات مرتب کرے، وہ شریعت اور واجب العمل ہے۔ پرویز کے اس نظریے سے یہ ثابت ہوا کہ وہ لوگوں کو رسول اللہ ﷺ کی قرآنی شرح سے بدظن کرتے ہیں اور دین سے خارج کرنے کی کوشش کرتے ہیں جبکہ وہ بادشاہِ وقت کی تشریح کو دین اور مذہب قرار دیتے ہیں۔ اس نظریے کے نتیجے میں دین اسلام میں ہزاروں شریعتیں ہوں گی کیونکہ ہر زمانے کا بادشاہ (امام) نئی نئی تشریحات لائے گا۔

5 ایک جگہ پر لکھتا ہے: ''حدیث کا صحیح مقام دینی تاریخ کا ہے، اس سے تاریخی فائدے حاصل کیے جاسکتے ہیں لیکن دین میں حجت کے طور پر نہیں پیش کی جاسکتی۔''[2]

پرویز صاحب کا مطلب ہے کہ دینی احکام، مثلاً: نماز، روزہ، حج اور زکاۃ وغیرہ کے طریقے اور جزئیات حدیث سے نہیں لیں گے بلکہ بادشاہِ وقت (مرکز ملت) یہ کام کرے گا۔ کیا پرویز صاحب بتائیں گے کہ چودہ سو سال میں کسی (مسلمان) بادشاہِ وقت نے نماز پڑھنے کا کوئی ایسا طریقہ رائج کیا (ہے) جو حدیثِ نبوی میں نہ ہو؟ حج کا کون سا وقت مقرّر کیا جو ذوالحجہ کے علاوہ ہو؟ وہ کسی ایک امام اور بادشاہ کا نام اور مثال نہیں پیش

[1] مقام حدیث: 168/1. [2] مقام حدیث: 168/2.

کر سکتے، پھر ان کے نزدیک، چودہ سو سال میں مسلمانوں نے جو نمازیں پڑھیں اور حج ادا کیے یہ سب کے سب بے دینی کے زمرے میں آئیں گے۔ اگر کوئی سوچے کہ دین پرویز صاحب کے پاس ہے تو ''ایں خیال است ومحال است وجنون۔''

6 پرویز صاحب کے استاد حافظ محمد اسلم جیراج پوری کہتے ہیں: ''نہ حدیث پر ہمارا ایمان ہے نہ اس پر ایمان لانے کا ہم کو حکم دیا گیا ہے۔''[1]

پرویز صاحب نے لکھا ہے:

''احادیث نبیٔ اکرم ﷺ کے اقوال و اعمال کے مجموعے کا نام ہے۔''[2] اس کلام میں احادیث پر ایمان لانے سے صریح انکار ہے اور دلیل میں لکھا ہے: ''ہمیں اس پر ایمان لانے کا حکم نہیں دیا گیا۔''[3]

ایمان بالرسول کے باب میں ہم نے ثابت کیا ہے کہ رسول پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ زمانۂ رسالت میں آپ ﷺ کے سارے اقوال و افعال (بجز خصوصیات) کی اطاعت اور اتباع ہم پر لازم ہے اور ہم اس کے مکلّف ہیں۔ اگر ایسا نہیں ہے تو پھر اتباع رسول سے متعلق آیاتِ قرآنیہ ﴿قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ﴾[4] ، ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾[5] ، ﴿وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ﴾[6] ، سے کیا مراد ہے؟

7 پرویز صاحب نے لکھا ہے:

''جہاں تک احادیث کا تعلق ہے ہم ہر اس حدیث کو صحیح سمجھتے ہیں جو قرآن کریم کے مطابق ہو یا جس سے حضور نبیٔ اکرم ﷺ یا صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی سیرت داغ دار نہ ہوتی ہو۔''[7]

[1] طلوع اسلام، دسمبر 1950ء، ص: 17۔ [2] مقام حدیث: 44/1۔ [3] مقام حدیث: 44/1۔ [4] آل عمرٰن 13:3۔ [5] الأحزاب 21:33۔ [6] الحشر 7:59۔ [7] طلوع اسلام کا مقصد ومسلک، شق نمبر 14۔

پرویز صاحب نے تصحیحِ حدیث کے لیے یہ تین معیار قائم کیے ہیں اور ان کے استاد حافظ اسلم نے مرویاتِ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

''ان میں بہت سی حدیثیں ایسی ہیں کہ ان پر علم و عقل کی رو سے گرفت کی گئی ہے یا کی جاسکتی ہے۔ اس لیے ہمارا ضمیر قبول نہیں کرسکتا کہ اس طرح کی روایتیں انھوں (نبی صلی اللہ علیہ وسلم یا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ) نے بیان کی ہوں گی۔''[1]

اس عبارت میں دو معیار مزید بیان کیے گئے ہیں، علم اور عقل۔ پرویزی ان پانچ معیاروں کی وجہ سے اکثر ذخیرۂ حدیث سے انکار کرتے ہیں۔

پرویزی معیارات پر تنقیدی بحث

1 **مطابقت قرآن:** اگر مطابقت کا یہ مطلب ہو کہ قرآن اور حدیث کے مضمون میں کوئی اختلاف نہ ہو تو پھر حدیث کی کیا ضرورت ہے کیونکہ قرآن ماننے ہی سے ضرورت پوری ہو جاتی ہے، نیز اگر مطابقت کا مطلب یہ ہو کہ حدیث کا مضمون قرآن کے خلاف نہ ہو تو وہ حدیث صحیح ہوگی اور یہ بات اس وقت معلوم ہوتی ہے، جب قرآن کا مفہوم معلوم ہو اور مفہومِ قرآن ائمۂ مفسرین اور ائمۂ محدثین کے اصول سے واضح ہوتا ہے جس میں کسی صحیح حدیث کی تکذیب لازم نہیں آتی۔ لیکن طلوع اسلام کے طریقے پر مفہومِ قرآن متعین نہیں ہوسکتا۔ وہ تو ہر آن بدلتا ہی رہتا ہے۔ اور اس طریقے پر تو کسی وقت کسی حدیث کو صحیح قرار دیا جائے گا اور کسی وقت غیر صحیح قرار دیا جائے گا۔

مزید برآں اگر ایک حدیث بظاہر قرآن کے مخالف ہو تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس کا انکار کیا جائے کیونکہ اس طرح کی کئی آیات ایسی ہیں جو بظاہر دوسری آیات سے

[1] مقام حدیث، ص: 82.

مختلف نظر آتی ہیں تو اس صورت میں کیا فیصلہ کیا جائے؟ اگر آیات کو ترک کیا جائے تو یہ یہودیوں کا طریقہ ہے کہ وہ آیات الٰہیہ میں تعارض پیدا کر کے رد کر دیتے ہیں۔ دوسری صورت یہ ہے کہ آیات کے درمیان تطبیق پیدا کی جائے یا ناسخ و منسوخ کا فیصلہ کیا جائے، لہٰذا اگر کوئی حدیث بظاہر قرآن کے خلاف نظر آئے تو وہاں بھی اسی طرح تطبیق پیدا کرنے کی کوشش کی جائے، جیسا کہ علماء، مفسرین اور محدثین کی کتابوں میں موجود ہے، مثلاً: اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ إِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتَىٰ ﴾

''بے شک آپ مردوں کو نہیں سنا سکتے۔''[1]

اس آیت کریمہ سے ثابت ہوا کہ مردے نہیں سنتے جبکہ حدیث میں ہے کہ غزوۂ بدر میں جو کفار قتل کیے گئے تھے انھیں قلیب بدر (کنویں) میں ڈال دیا گیا تو نبی ﷺ نے ان سے کلام فرمایا اور آپ ﷺ نے کسی کے پوچھنے پر یہ بھی فرمایا کہ یہ سنتے ہیں۔[2]

مذکورہ آیت اور قلیب بدر کے متعلق حدیث میں بظاہر تضاد ہے۔ ان کے درمیان تطبیق یوں پیدا کی جائے گی کہ آیت کا معنی عام ہے کہ مردے نہیں سنتے جبکہ قلیب بدر کے مقتولین کے سننے کو معجزے پر محمول کیا جائے گا۔ اسی طرح کئی اور مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ بعض اوقات کثرت معانی کے لحاظ سے ان میں تطبیق پیدا کی جاتی ہے، یعنی آیت میں اس لفظ کا ایک معنی اور حدیث میں اس لفظ کا دوسرا معنی مراد لیا جاتا ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ قرآن کے معیار ہونے سے حدیث کی تکذیب لازم نہیں آتی۔ تاہم پرویز صاحب اپنی کج فہمی کی بنا پر بہت سی احادیث کو قرآن کا مخالف قرار دے کر رد

[1] النمل 80:27. [2] صحيح البخاري، الجنائز، باب ماجاء في عذاب القبر، حديث:1370، وصحيح مسلم، الجنائز، باب الميت يعذب ببكاء......، حديث:932.

کر دیتے ہیں۔

2 نبی ﷺ کی سیرت پر داغ نہ آئے: اس معیار کے متعلق ایک الزامی سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر قرآن کی کسی آیت میں رسول اللہ ﷺ کی سیرت وشان پر بظاہر کوئی داغ آتا ہو تو کیا اس آیت سے انکار کر دیا جائے گا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ عَبَسَ وَتَوَلّٰٓىۙ اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى ۝ ﴾

"اس (رسول) نے تیوری چڑھائی اور منہ پھیر لیا، اس بات پر کہ ایک نابینا اس کے پاس آیا۔"[1]

اب اس آیت میں آپ ﷺ کے ایک اخلاقی رویے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

ایک موقع پر فرمایا:

﴿ اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًاۙ لِّيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ ﴾

"ہم نے آپ کو فتح دی اور فتح بھی بالکل واضح، تا کہ اللہ آپ کی اگلی پچھلی تمام لغزشیں معاف کر دے۔"[2]

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ سے کوئی لغزش ہوئی جو سیرت وشان پر داغ تصور کی جا سکتی ہے۔ اسی طرح فرمایا:

﴿ وَلَوْلَآ اَنْ ثَبَّتْنٰكَ لَقَدْ كِدْتَّ تَرْكَنُ اِلَيْهِمْ شَيْـًٔا قَلِيْلًا ۝ ﴾

"اگر ہم آپ کو ثابت قدم نہ کرتے تو آپ کچھ نہ کچھ ضرور ان کی طرف مائل ہو جاتے۔"[3]

اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے تثبیت نہ ہونے کی صورت میں آپ ﷺ کی

[1] عبس 80:1,2. [2] الفتح 48:1,2. [3] بنی إسرآءیل 17:74.

استقامت میں کسی کمزوری کا پہلو معلوم ہوتا ہے۔

ان آیات کے متعلق سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا انھیں اس لیے رد کیا جا سکتا ہے کہ ان کی وجہ سے نبی ﷺ کی ذات و کردار پر کوئی داغ لگتا ہے؟ نہیں، ہرگز نہیں! بلکہ ائمۂ مفسرین نے ان آیات کی ایسی توجیہات کی ہیں جن کی وجہ سے آپ ﷺ کی سیرت پر کسی قسم کے داغ کا شائبہ تک باقی نہیں رہ جاتا۔ احادیث کے متعلق بھی ایسا ہی معاملہ ہے۔ بالفرض کسی حدیث میں نبی ﷺ کی سیرت پر حرف آنے کا شبہ پیدا ہوا تو محدثین نے حدیث کی ایسی توجیہ کی جس کی وجہ سے وہ شبہ یکسر زائل ہو گیا، لہٰذا جب توہینِ رسول کا شبہ قرآن کی صحت کے لیے معیار نہیں بنتا تو پھر حدیث کی صحت کے لیے وہ شبہ کیوں کر معیار بن سکتا ہے؟

3 صحابۂ کرام کی سیرت پر داغ لگنا: یہاں بھی وہی کلام ہے جو پہلے معیاروں کے متعلق گزر چکا ہے۔ قرآن کریم میں ایسی آیات ہیں جن میں صحابۂ کرام اور ازواجِ مطہرات کی بعض کمزوریوں کی طرف اشارے ملتے ہیں، مثلاً: اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ اِنْ تَتُوْبَآ اِلَى اللّٰهِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُكُمَا ۚ ﴾

”اگر تم دونوں توبہ کر لو (تو تمھارے لیے بہتر ہے) کیونکہ یقیناً تمھارے دل مائل ہو چکے ہیں۔“[1]

نیز فرمایا:

﴿ يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ اِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَ زِيْنَتَهَا فَتَعَالَيْنَ اُمَتِّعْكُنَّ وَ اُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا ۝ ﴾

”اے نبی! اپنی ازواج مطہرات سے فرما دیجیے کہ اگر تم دنیا کی زندگی اور اس کے

[1] التحریم 66:4.

سازوسامان کی طلب گار ہو تو آؤ میں تمھیں ساز و سامان دوں اور خوش اسلوبی سے تمھیں رخصت کردوں۔''[1]

نیز فرمایا:

﴿ حَتّٰٓي اِذَا فَشِلْتُمْ وَ تَنَازَعْتُمْ فِي الْاَمْرِ وَ عَصَيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَآ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ ﴾

''یہاں تک کہ تم نے خود ہی ہمت ہاردی اور تم معاملے میں جھگڑنے لگے اور نافرمانی کی اس کے بعد کہ اللہ تعالیٰ نے تمھیں دکھایا جو کہ تم چاہتے تھے۔''[2]

نیز فرمایا:

﴿ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ ﴾

''اللہ کو معلوم ہے کہ تم خود اپنی ذات کے ساتھ خیانت کیا کرتے تھے، لہٰذا اس نے تمھاری طرف توجہ کی اور تمھیں معاف کردیا۔''[3]

﴿ وَ اِذَا رَاَوْا تِجَارَةً اَوْ لَهْوَا انْفَضُّوْٓا اِلَيْهَا وَ تَرَكُوْكَ قَآىِٕمًا ﴾

''اور جب انھوں نے تجارت یا کھیل تماشا دیکھا تو وہ اس کی طرف بھاگ گئے اور آپ کو کھڑا چھوڑ گئے۔''[4]

کیا ان آیات میں صحابۂ کرام اور ازواجِ مطہرات کو ان کی کوتاہیوں اور غلط روش پر تنبیہ نہیں کی گئی تو کیا پھر پرویزی معیار کے مطابق ان آیات کو چھوڑ دیا جائے؟ نہیں، ہرگز نہیں! اور ان کی تاویل کی بھی ضرورت نہیں کیونکہ صحابۂ کرام معصوم نہیں تھے۔ انھی آیات میں ان کی توبہ کی قبولیت کا شرف بھی مذکور ہے، چنانچہ اسی طرح اگر کوئی حدیث ایسی ہو جس میں کسی صحابی کی کوئی کمزوری مذکور ہو تو ہم اس حدیث کو کیوں چھوڑ دیں؟

[1] الأحزاب 28:33. [2] آل عمرٰن 152:3. [3] البقرۃ 187:2. [4] الجمعۃ 11:62.

مندرجہ بالا گفتگو سے معلوم ہوا کہ صحتِ حدیث کے لیے یہ تینوں معیار مقرر کرنا سراسر تلبیس ہے۔

4 **حدیث علم کے خلاف نہ ہو:** اس علم سے کیا مراد ہے؟ اگر انسان کا اپنا علم ہو تو اس نے یہ علم کہاں سے حاصل کیا ہے اور اس کی دلیل کیا ہے؟ بسا اوقات انسان اپنے آپ کو عالم سمجھتا ہے، حالانکہ وہ جاہل ہوتا ہے۔ ایسے ہی ''عالموں'' کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَلَمَّا جَآءَهُمْ رَسُولٌ مِّنْ عِندِ اللَّهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ نَبَذَ فَرِيقٌ مِّنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ كِتَابَ اللَّهِ وَرَآءَ ظُهُورِهِمْ كَأَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ﴾

''اور جب ان کے پاس اللہ کی طرف سے ایک رسول آیا جو ان کتابوں کی جو پہلے سے ان کے پاس تھیں تصدیق کرتا ہے تو ان میں سے ایک گروہ نے جنھیں کتاب دی گئی تھی اللہ کی کتاب کو اس طرح پس پشت ڈال دیا گویا کہ وہ جانتے ہی نہیں۔''[1]

نیز فرمایا:

﴿ أَلَا إِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَآءُ وَلَٰكِن لَّا يَعْلَمُونَ ﴾

''یاد رکھو وہ خود ہی بے وقوف ہیں لیکن وہ نہیں جانتے۔''[2]

یعنی ایسے لوگ جاہلِ مرکب ہیں، لہٰذا ان کا علم کسی طرح بھی قبولیت حدیث کے لیے معیار نہیں بن سکتا۔

اگر علم سے مراد علمِ مشاہدہ ہو تو مطلب یہ ہے کہ جو حدیث مشاہدے کے خلاف ہو اسے منکرینِ حدیث نہیں مانتے تو پھر اس طرح انبیاء علیہم السلام کے معجزات بلکہ جدید سائنسی علوم بھی مشاہدات کے خلاف ہیں تو پھر کیا وہ بھی نہیں مانیں گے؟ اگر مانتے ہیں تو یہ لوگ ان

[1] البقرة 2:101. [2] البقرة 2:13.

کی عجیب سی تاویلات کرتے ہیں جو علم و عقل کے خلاف ہوتی ہیں، لہٰذا علمِ مشاہدہ کے ذریعے سے احادیث سے کیوں کر انکار کر سکتے ہیں؟

5 حدیث عقل کے خلاف نہ ہو: آیات یا احادیث کو عقل کی میزان میں جانچنے کے موضوع پر آٹھویں باب میں مفصل بیان ہو چکا ہے۔ یہاں قارئین کو یہ بتانا مقصود ہے کہ مفسرین و محدثین عقل کے استعمال کے منکر نہیں۔ عقل کے استعمال کے متعلق بہت سی آیات ہم پہلے بیان کر چکے ہیں لیکن محدثین کے استعمالِ عقل اور منکرینِ حدیث کے استعمالِ عقل میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ محدثینِ کرام عقل کو وحی کے تابع رکھ کر استعمال کرتے ہیں۔ وہ آیات و احادیث کو پڑھنے اور ان کی اتباع کے بعد عقل اور تفکر و تدبر سے بھی کام لیتے ہیں۔ جبکہ منکرینِ حدیث عقل کو وحی کا تابع نہیں بلکہ وہ عقل کو حق و باطل اور حسن و قبح کے فرق کے لیے آخری معیار سمجھتے ہیں۔ معتزلہ کے تمام فرقوں کا یہی طریقہ کار تھا۔

''طلوع اسلام کا مسئلہ شق'' میں پرویز صاحب نے بھی یہ تصریح کی ہے:

''تنہا عقل انسانی زندگی کے مسائل کا حل دریافت نہیں کر سکتی، اسے اپنی رہنمائی کے لیے وحی کی اس طرح ضرورت ہے جس طرح آنکھ کو سورج کی روشنی کی ضرورت ہے۔''

لیکن اس کے باوجود عملی طور پر پرویز صاحب اپنے اس قول کے پابند نہیں ہیں، بہت سی صحیح احادیث کو اپنی عقل کی میزان سے جھٹلاتے ہیں۔ انھوں نے وحی میں عقل کی مداخلت ثابت کرنے کے لیے بزعم خویش قرآن سے ایک دلیل پیش کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَالَّذِينَ إِذَا ذُكِّرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوا عَلَيْهَا صُمًّا وَعُمْيَانًا ۝ ﴾

''اور وہ لوگ ہیں کہ جب ان کے سامنے آیات خداوندی بھی پیش کی جائیں تو ان پر بھی بہرے اور اندھے بن کر نہیں گرتے بلکہ عقل و فکر سے کام لے کر قبول و

اختیار کرتے ہیں۔ (یہ ترجمہ پرویز صاحب کا ہے)[1]

پرویز صاحب نے ﴿ ذُكِّرُوْا ﴾ کا ترجمہ کیا ہے ''پیش کی جائیں'' حالانکہ اس کا ترجمہ ہے ''جب انھیں ان کے رب کی آیات کے ذریعے سے نصیحت کی جاتی ہے۔'' اور آیت میں ﴿ لَمْ يَخِرُّوْا ﴾ محاورہ کے معنی میں استعمال ہوا ہے، یعنی جب انھیں ان کے رب کی آیات کے ذریعے سے سمجھایا جاتا ہے تو یہ نہیں ہے کہ وہ ان سے متاثر نہیں ہوتے یا وہ ان پر عمل نہیں کرتے بلکہ وہ اس نصیحت سے متاثر ہو کر اس پر عمل کرتے ہیں۔ اس کا معنی ہرگز یہ نہیں ہے کہ وہ اس نصیحت کو عقل کی کسوٹی پر پیش کرتے ہیں اگر عقل کے موافق ہوئی تو اسے قبول کر لیا اور اگر اس کے موافق نہ ہوئی تو اسے رد کر دیا۔ یہ طرزِ فکر و عمل تو کافروں کا ہے۔ مسلمانوں کو تو نصوص شرعی کے مقابلے میں عقل استعمال کرنے سے روکا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ ؕ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا ۝ ﴾

''کسی مومن مرد اور کسی مومن عورت کے لیے جائز نہیں کہ جب اللہ اور اس کے رسول کسی بات کا فیصلہ کر دیں تو انھیں ان کے معاملے میں اختیار ہو اور جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا تو وہ کھلی گمراہی میں ہے۔''[2]

اس آیت میں ایسے لوگوں کا رد ہے جو قرآن و حدیث کی نصوص کے مقابلے میں اپنی رائے اور عقل استعمال کرتے ہیں۔ اِس فکر سے بدعات شروع ہوتی ہیں اور اس کے حامل افراد سراسر گمراہ ہیں۔

یہاں تک ہم نے پرویزی اسلام کے بیس عقائد بیان کیے ہیں جو ان کے مکتوبات

---

[1] الفرقان 73:25. [2] الأحزاب 36:33.

سے لیے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سی ایسی جزئیات ہیں جن میں قربانی سے انکار، عذاب قبر سے انکار، تعدد ازواج سے انکار اور رجم سے انکار وغیرہ شامل ہیں، حالانکہ ان تمام امور کے اثبات کے متعلق قرآن وسنت کی نصوص موجود ہیں اور چودہ سو سال سے امت کے نزدیک مسلم ہیں۔

مندرجہ بالا تمام عقائد ونظریات میں آپ نے نبوی اسلام اور پرویزی اسلام میں واضح فرق محسوس کیا ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے دین اسلام مکمل فرمادیا ہے۔ اب اس میں کسی ترمیم اور اضافے کی گنجائش ہے نہ کسی کو اس کا اختیار حاصل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ﴾

”آج کے دن میں نے تمھارے لیے تمھارا دین مکمل کر دیا اور اپنی نعمت تم پر پوری کر دی اور تمھارے لیے اسلام کو بطور دین پسند کیا۔“[1]

اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ کی زندگی میں دین اسلام مکمل فرمایا اور اسی دین کو تمھارے لیے پسند کیا جبکہ پرویزی دین، دین محمدی سے بالکل الگ دین ہے۔ اس تضاد کے ہوتے ہوئے غلام احمد پرویز کے کفر میں کیا شک باقی رہ جاتا ہے؟

نوٹ: مذکورہ عقائد اور انکارِ حدیث جیسے تقریباً 39 عقائد کی بنا پر تمام علمائے کرام نے پرویز صاحب کی زندگی میں ان کے خلاف کفر کا فتویٰ صادر کیا تھا۔ کیا یہ سارے علمائے کرام دین نہیں سمجھتے؟ ذرا عقل سے بھی کام لینا چاہیے اور پرویزی گمراہیوں سے بچنا چاہیے۔

[1] المآئدة 5:3.

باب 10

منکرین حدیث کے شبہات اور ان کے جوابات

گزشتہ ابواب میں بھی ان کے بعض شبہات کے جوابات دیے گئے ہیں لیکن اس باب میں مفصل جوابات دیے جا رہے ہیں تا کہ قرآن وسنت سے واقفیت نہ رکھنے والے حضرات ان کی تلبیسات وتحریفات سے بچ جائیں۔ منکرین حدیث کے شبہات درج ذیل ہیں:

پہلا شبہ: کتابتِ حدیث کی ممانعت کے متعلق روایات

منکرینِ حدیث نے اس اعتراض کو بہت اچھالا ہے اور اپنے موقف کو ثابت کرنے کے لیے ان احادیث کو بیان نہ کر کے علمی خیانت کی ہے جن میں رسول اللہ ﷺ نے احادیث لکھنے کی اجازت مرحمت فرمائی ہے۔ حفاظتِ حدیث بذریعہ کتابتِ حدیث کے بارے میں ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ منکرینِ حدیث کتابتِ حدیث کی ممانعت کے سلسلے میں درج ذیل حدیث کا سہارا لیتے ہیں کہ ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«لَا تَكْتُبُوا عَنِّي، وَمَنْ كَتَبَ عَنِّي غَيْرَ الْقُرْآنِ فَلْيَمْحُهُ، وَحَدِّثُوا عَنِّي، وَلَا حَرَجَ، وَمَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدًا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ»

”قرآن کے علاوہ مجھ سے کچھ نہ لکھو۔ جس نے قرآن کے علاوہ مجھ سے کچھ لکھا

ہے تو وہ اسے مٹا دے۔ اور مجھ سے حدیثیں بیان کرو، اس میں کوئی حرج نہیں۔ (سن لو) جس نے قصداً مجھ پر جھوٹ باندھا تو وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنا لے۔''[1]

دوسری جگہ یہ حدیث یوں ہے کہ ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہم بیٹھے رہتے تھے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے جو سنتے تھے وہ لکھ لیتے تھے۔ ایک روز نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس تشریف لائے اور فرمانے لگے:

«مَا هٰذَا تَكْتُبُونَ؟» فَقُلْنَا: مَا نَسْمَعُ مِنْكَ، فَقَالَ: «أَكِتَابٌ مَّعَ كِتَابِ اللهِ؟ أَمْحِضُوا كِتَابَ اللهِ وَأَخْلِصُوهُ»

''تم یہ کیا لکھتے ہو؟'' ہم نے عرض کیا: ہم آپ سے جو سنتے ہیں (وہ لکھ لیتے ہیں۔) آپ نے فرمایا: ''کیا اللہ کی کتاب کے ساتھ کوئی دوسری کتاب؟ صرف اور صرف اللہ کی کتاب ہی کو خالص طور پر لکھو۔''

ابو سعید رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: ہم نے جو کچھ لکھا تھا اسے ایک میدان میں جمع کیا اور پھر اسے جلا دیا۔[2]

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں ہم احادیث لکھ رہے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس تشریف لائے تو آپ نے فرمایا:

«مَا هٰذَا الَّذِي تَكْتُبُونَ قُلْنَا أَحَادِيثُ نَسْمَعُهَا مِنْكَ قَالَ: كِتَابٌ غَيْرَ كِتَابِ اللهِ، أَتَدْرُونَ مَا ضَلَّ أُمَمٌ قَبْلَكُمْ إِلَّا بِمَا اكْتَتَبُوا مِنَ الْكُتُبِ مَعَ كِتَابِ اللهِ»

''یہ تم کیا لکھ رہے ہو؟'' ہم نے عرض کیا: یہ وہ احادیث ہیں جو ہم آپ سے سنتے

[1] صحيح مسلم، الزهد، باب التثبت في الحديث.....، حديث: 3004. [2] مسند أحمد: 12/3، حديث: 11108، ومجمع الزوائد، العلم، باب كتابة العلم، حديث: 672.

ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ”اللہ کی کتاب کے علاوہ کوئی اور کتاب؟ کیا تم جانتے ہو کہ تم سے پہلے لوگ بھی صرف اسی وجہ سے گمراہ ہوئے کہ انھوں نے اللہ کی کتاب کے ساتھ اور کتابیں بھی لکھ لی تھیں۔“[1]

منکرین حدیث انھی روایات کو بنیاد بنا کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے اس لیے احادیث لکھنے سے منع کیا اور فرمایا: احادیث محفوظ نہ کی جائیں کہ کہیں لوگ احادیث کو قابل حجت نہ سمجھنے لگیں۔

جوابات

1. اگر مذکورہ احادیث سے کتابتِ حدیث کی ممانعت ثابت ہوتی ہے تو پھر ایسی احادیث بھی موجود ہیں جن سے کتابتِ حدیث کے متعلق اجازت ثابت ہوتی ہے۔ اس طرح کتابتِ احادیث کی اجازت اور عدمِ اجازت کے بارے میں اختلاف پیدا ہوگیا، لہٰذا اب اہلِ علم کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس تعارض کو ختم کرنے کی کوشش کریں، چنانچہ اہلِ علم نے ایسا کیا ہے جس کا ذکر آرہا ہے۔ منکرینِ حدیث صرف پہلی قسم (عدمِ اجازت) کی احادیث دیکھتے ہیں اور دوسری قسم (اجازت) کی احادیث کا نام تک نہیں لیتے۔ یہ تو سراسر علمی خیانت ہے۔

2. جب منکرینِ حدیث، احادیث کو حجت نہیں مانتے تو پھر احادیث کی کتابت سے ممانعت ثابت کرنے کے لیے احادیث سے کیوں استدلال کرتے ہیں؟

3. ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث کو امام بخاری رحمہ اللہ نے موقوف قرار دیا ہے۔[2] جبکہ احادیث لکھنے کی اجازت والی احادیث مرفوع ہیں تو پھر مرفوع حدیث چھوڑ کر موقوف

[1] تقييد العلم للخطيب بغدادي: 34,33/1. [2] تاريخ الحديث و المحدثين، ص: 212.

روایت سے کیوں استدلال کرتے ہیں؟

④ بالفرض دونوں قسم کی احادیث مساوی حیثیت رکھتی ہیں تو پھر منکرینِ حدیث کے خیال کے مطابق یہ نتیجہ کیسے مرتب ہوتا ہے کہ نبی ﷺ نے کتابتِ حدیث سے اس لیے منع کیا تھا کہ احادیث غیر محفوظ رہ کر قابل حجت نہ رہیں بلکہ کتابت سے ممانعت کی دوسری حکمتیں مراد تھیں جو بعد میں بیان کی جائیں گی۔

⑤ ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث کے آخر میں ہے۔

«حَدِّثُوا عَنِّي وَلَا حَرَجَ»

''مجھ سے حدیث بیان کرو، اس میں کوئی حرج نہیں۔''[1]

آپ ﷺ کے اس فرمان سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ کی احادیث نقل کرنا اور دوسروں تک پہنچانا امت کا فریضہ ہے اگر کتابتِ حدیث کی ممانعت کا وہی مقصد ہوتا جو منکرینِ حدیث پیش کرتے ہیں تو پھر اس حدیث کے اول حصے اور آخری حصے میں تناقض اور تضاد لازم آتا ہے جبکہ تناقض کلام دیوانگی کی علامت ہے اور نبی ﷺ اس سے مبرا ہیں۔

⑥ جب کسی روایت میں تعارض ہوتو محدثینِ کرام ان روایات میں جمع وتطبیق کی کوشش کرتے ہیں تاکہ کوئی نص مہمل نہ رہے۔ محدثین نے یہاں بھی تین قسم کی توجیہات پیش کی ہیں۔ پہلی توجیہ امام خطابی رحمہ اللہ نے نقل کی ہے:

«إِنَّهُ أَنَّمَا نَهَى أَنْ يُكْتَبَ الْحَدِيثُ مَعَ الْقُرْآنِ فِي صَحِيفَةٍ وَاحِدَةٍ لِئَلَّا يَخْتَلِطَ بِهِ وَيُشْبِهُ عَلَى الْقَارِئِ فَأَمَّا أَنْ يَكُونَ نَفْسُ الْكِتَابِ مَحْظُورًا وَتَقْيِيدُ الْعِلْمِ بِالْخَطِّ مَنْهِيًّا عَنْهُ فَلَا»

''آپ ﷺ نے حدیث کو قرآن کے ساتھ ایک ہی صفحے پر ایک ساتھ لکھنے سے

① صحيح مسلم، الزهد، باب التثبت في الحديث...... ، حديث: 3004.

منع فرمایا تا کہ قاری کسی اختلاط و اشتباہ کا شکار نہ ہو جائے۔ رہا حدیث کو لکھنے اور علم کو تحریر میں لانے کی ممانعت کا تعلق تو ایسی کوئی بات نہیں۔''[1]

یعنی نبی ﷺ نے کتابتِ حدیث سے مطلقاً منع نہیں فرمایا بلکہ قرآن و حدیث کو ایک ساتھ ایک جگہ لکھنے سے منع فرمایا تا کہ یہ دونوں آپس میں خلط ملط نہ ہو جائیں۔ اس توجیہ کی دلیل یہ ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

«أَمْحِضُوا كِتَابَ اللهِ وَأَخْلِصُوهُ»

''اللہ تعالیٰ کی کتاب کو اختلاط سے پاک خالص رکھو۔''[2]

اس حدیث سے ثابت ہوا کہ احادیث کی کتابت سے ممانعت کی وجہ نبی ﷺ نے خود بیان فرما دی۔ اس توجیہ کی تردید کرتے ہوئے پرویز صاحب نے لکھا ہے:

''اگر حضور ﷺ کا یہ مقصد ہوتا کہ قرآن و حدیث مخلوط نہ ہونے پائیں تو آپ فرما سکتے تھے کہ دونوں کو الگ الگ لکھو، لہٰذا محدثین کی توجیہ صحیح نہیں۔''[3]

پرویز صاحب کا یہ کلام بالکل جہالت پر مبنی ہے۔ محدثین نے آپ ﷺ کے فرمان کا صحیح مطلب بیان کیا ہے، اس لیے کہ «أَمْحِضُوا كِتَابَ اللهِ وَأَخْلِصُوهُ» ''اللہ کی کتاب کو اختلاط سے خالص اور محفوظ رکھنے والا فرمان'' اس کی واضح دلیل ہے۔

دوسری توجیہ: احادیث لکھنے سے ممانعت کے متعلق احادیث منسوخ ہیں کیونکہ نبی ﷺ نے حدیثِ قرطاس کے نام سے مشہور حدیث میں مرض الموت کی حالت میں فرمایا تھا: کوئی چیز لاؤ کہ میں تمھارے لیے کچھ لکھ دوں، پھر صحابۂ کرام کے اختلاف کی وجہ سے نہ لکھا گیا لیکن آپ ﷺ نے جو کچھ لکھانا تھا وہ زبان مبارک سے ارشاد فرما دیا۔[4]

---

① معالم السنن للخطابي، العلم، باب كتابة العلم، تحت الحديث: 1450. ② مسند أحمد: 12/3، ومجمع الزوائد: 151/1، حديث: 672. ③ مقام حدیث، ص: 89. ④ صحيح البخاري، ◄◄

تیسری توجیہ: یہ توجیہ بھی دوسری توجیہ کے قریب ہے، یعنی نبی ﷺ نے پہلے کتابتِ حدیث سے منع فرمایا لیکن بعض صحابہ نے خیال کیا کہ اس وجہ سے منع فرمایا کہ کبھی آپ غصہ وغضب کی حالت میں ہوتے ہیں اور اس حالت کی حدیث شاید آپ کے اسوۂ حسنہ میں شامل نہ ہو لیکن نبی ﷺ نے عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما کو درج ذیل ارشاد فرما کر اس خیال کا بھی ازالہ فرمادیا:

«اُكْتُبْ فَوَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ! مَا يَخْرُجُ مِنْهُ إِلَّا حَقٌّ»

''لکھو، اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! اس منہ سے صرف حق ہی نکلتا ہے۔''[1]

طلوع اسلام کا کتابتِ حدیث کے متعلق اعتراف

پرویز صاحب نے لکھا ہے: ''روایات سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ قرآن کریم کے علاوہ کچھ متفرق چیزیں حضور ﷺ کے ارشاد کے مطابق قلم بند ہوئی تھیں، مثلاً: وہ تحریری معاہدات، احکام اور فرامین وغیرہ جو آں حضرت ﷺ نے قبائل یا اپنے عمال کے نام بھیجے لیکن اس باب میں جو کچھ آج تک معلوم ہوسکا فقط اتنا ہے کہ حضور ﷺ کی وفات کے وقت حسب ذیل تحریری سرمایہ موجود تھا:

1 پندرہ سو صحابہ کے نام ایک رجسٹر میں (بخاري، الجهاد، باب كتابة الإمام الناس) 2 مکتوبات گرامی جو حضور ﷺ نے سلاطین اور امراء کے نام لکھے: (مختلف صحاح کتب) کچھ حدیثیں جو عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما یا علی رضی اللہ عنہ (بخاری، العلم، باب كتابة العلم) یا حضرت انس رضی اللہ عنہ نے اپنے طور پر قلم بند کر رکھی تھیں۔ (مسند أحمد)''[2]

العلم، باب كتابة العلم، حديث: 114. [1] سنن أبي داود، العلم، باب كتابة العلم، حديث: 3646. [2] مقام حديث، ص: 10.

حافظ اسلم لکھتے ہیں: ''محدثین نے جواز روایت کے لیے بعض روایتوں سے بھی استدلال کیا ہے، مثلاً: ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ میں جو کچھ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنتا تھا لکھ لیا کرتا تھا، نیز عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما کے متعلق بھی ان کا بیان ہے کہ وہ لکھا کرتے تھے۔ اسی طرح ایک روایت میں ہے کہ یمن کے ایک شخص ابو شاہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا خطبہ لکھوانے کی درخواست کی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے لکھا دیا۔ مگر یہ چیزیں مستثنیات میں شمار ہوں گی۔''[1]

دیکھیں استاد نے صرف تین چیزیں مستثنیٰ کی ہیں اور یہ تعداد غلط ہے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے یہ ثابت نہیں کہ ''میں سنتا تھا اور لکھتا تھا'' یہ حافظ اسلم کی طرف سے اپنا اضافہ ہے، لہٰذا دو چیزیں مستثنیٰ ہوئیں۔ جبکہ شاگرد (پرویز) نے پندرہ سو صحابہ کا اندراج، تحریری معاہدات اور فرامین وغیرہ، نیز عبداللہ بن عمرو، علی اور انس رضی اللہ عنہم کی احادیث شمار کی ہیں۔ یہاں استاد اور شاگرد کے درمیان بھی اختلاف پیدا ہو گیا۔ یہ ان کی ہٹ دھرمی اور نحوستِ انکارِ حدیث کا برا اثر ہے۔

دوسرا شبہ

کتابتِ حدیث کی ممانعت اور انھیں جلانے کو مختلف صحابۂ کرام کی طرف منسوب کرنا اس بارے میں ان کی

❀ پہلی دلیل: پرویز صاحب لکھتے ہیں کہ امام ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں لکھا ہے کہ ابو بکر رضی اللہ عنہ نے پانچ سو احادیث کا ایک مجموعہ لکھا تھا، ایک رات اس کے متعلق نہایت متردد اور مضطرب تھے، آخر صبح کے وقت اسے لے کر آگ میں جلا دیا۔ ظاہر ہے کہ اس سے صحیح

[1] مقام حدیث، ص: 91.

مجموعہ اورکون سا ہوسکتا تھا مگر صدیق اکبر نے اس کا رکھنا بھی تقویٰ کے منافی سمجھا کہ شاید کوئی غلط روایت اس میں شامل ہوگئی ہو۔''[1]

جواب: ① اس واقعے کی سند صحیح نہیں ہے کیونکہ اس میں علی بن صالح مجہول الحال ہے،[2] محمد بن موسیٰ غیر ثقہ ہے۔[3] اورموسیٰ بن عبداللہ کے بارے میں امام بخاری نے ''فيه نظر یہ محل نظر ہے''[4] کے الفاظ سے جرح کی ہے۔

② بالفرض اگر یہ واقعہ ثابت بھی ہو، پھر احادیث نہ لکھنا یا لکھنے سے منع کرنا حجیتِ حدیث کے منافی نہیں کیونکہ احادیث کی حفاظت یاد رکھنے کے ذریعے سے بھی ہوتی ہے اور ابوبکر رضی اللہ عنہ بھی یاد کرتے رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کتبِ احادیث میں ابوبکر رضی اللہ عنہ کی سینکڑوں روایات موجود ہیں۔

❁ دوسری دلیل: پرویز صاحب کا دعویٰ ہے کہ عمر رضی اللہ عنہ استخارہ کرکے کتابتِ حدیث سے باز رہے۔لکھتا ہے: عروہ بن زبیر بیان کرتے ہیں، عمر رضی اللہ عنہ نے ایک بار خواہش ظاہر کی کہ اسوۂ رسول کو لکھوالیں، صحابہ سے مشورہ بھی کرلیا، پھر ایک مہینے تک اللہ تعالیٰ سے دعا اور استخارہ کرتے رہے۔ بالآخر اس ارادے سے باز رہے اور کہا کہ پہلی قومیں اسی وجہ سے ہلاک ہوئیں کہ انھوں نے اپنے پیغمبروں کی حدیثیں لکھیں، پھر انھی پر جھک پڑیں اور اللہ تعالیٰ کی کتاب کو چھوڑ دیا۔''[5]

تو اس کا جواب یہ ہے کہ

1 یہ روایت بے سند ہے، اس کی سند ثابت کرنا پرویز صاحب کے ذمے ہے۔ جب تک سند ثابت نہ ہوتو استدلال کیسا؟

① مقام حدیث،ص:91. ② تقریب التہذیب:696/1. ③ لسان المیزان:394/5. ④ لسان المیزان:160/6. ⑤ مقام حدیث،ص:92.

2 اس کے باوجود عمر رضی اللہ عنہ نے کتابت کا حکم دیتے ہوئے فرمایا:

«قَيِّدُوا الْعِلْمَ بِالْكِتَابِ»

''علم (قرآن وحدیث) کولکھ کر محفوظ کرلیا کرو۔''[1]

اگر عمر رضی اللہ عنہ کے واقعے کو بالفرض درست مان بھی لیا جائے تو پھر اس کی توجیہ یہ ہے کہ ممکن ہے شروع میں عمر رضی اللہ عنہ کو ان کے ساتھیوں نے مشورہ نہ دیا ہو اورانھوں نے اپنے اجتہاد سے احادیث نہ لکھی ہوں اور پھر انھوں نے احادیث لکھنے کی اجازت کے متعلق احادیث سن لی ہوں یا ان کے ساتھیوں نے انھیں احادیث لکھنے کا مشورہ دیا ہوتو انھوں نے اپنے اجتہاد سے رجوع کرلیا ہواور احادیث لکھنے کا حکم دیا ہو۔

3 احادیث لکھنے کی ممانعت حجیتِ حدیث کی نفی نہیں کرتی۔ محدثین نے عمر رضی اللہ عنہ سے 539 احادیث نقل کی ہیں۔

تیسری دلیل: پرویز نے لکھا ہے: ''فاروق اعظم جس طرح روایتِ حدیث کو روکنے میں سخت تھے اسی طرح کتابتِ حدیث میں بھی سخت تھے۔ ان کے عہد میں جب حدیثیں زیادہ ہوگئیں تو اعلان کردیا کہ لوگ اپنی لکھی ہوئی حدیثیں ان کے پاس لائیں، پھر انھوں نے ان سب حدیثوں کو لے کر جلادیا اور فرمایا کہ اہل کتاب کی طرح ''مثناۃ نبانی'' چاہتے ہو۔ (یہود نے اپنے انبیاء کی روایتیں جمع کرکے اس کا نام ''مثناۃ نبانی'' رکھا)

جواب: 1 یہ روایت ثابت نہیں، منقطع ہے، متصل نہیں۔ یہ روایت ان روایات کا مقابلہ نہیں کرسکتی جو عمر رضی اللہ عنہ سے کتابتِ حدیث کے متعلق منقول ہیں۔

2 عمر رضی اللہ عنہ نے حدیث کی ایک کتاب لکھوائی تھی جو ان کی اولاد میں منتقل ہوتی رہی۔[2]

امام مالک رحمہ اللہ نے وہ کتاب خود پڑھی تھی۔ امام دارقطنی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ عمر بن

[1] جامع بیان العلم: 72/1. [2] الموطأ، ص: 109.

عبدالعزیز رحمہ اللہ نے اس کتاب کی نقل کروا کر اس پر عمل کروایا تھا۔[1]

3 مزید برآں اگر بالفرض عمر رضی اللہ عنہ سے جلانا ثابت بھی ہو، پھر بھی لکھی ہوئی احادیث کو جلانا اس کی عدمِ حجیت کی دلیل نہیں بنتی کیونکہ عمر رضی اللہ عنہ نے سینکڑوں احادیث روایت کی ہیں اور یہ حجیتِ حدیث کی دلیل ہے۔

چوتھی دلیل: پرویز صاحب نے لکھا ہے: ''عبداللہ بن یسار کہتے ہیں کہ علی رضی اللہ عنہ نے اپنے خطبہ میں فرمایا کہ ہر اس شخص کو جس کے پاس حدیث لکھی ہوئی ہو عہد دلاتا ہوں کہ یہاں سے واپس جانے کے بعد اس کو مٹا ڈالے کیونکہ گزشتہ اقوام اسی وجہ سے تباہ ہوئیں کہ انھوں نے اپنے علماء کی روایت کی پیروی کی اور اللہ تعالیٰ کی کتاب کو چھوڑ دیا۔''[2]

جواب: 1 منکرینِ حدیث یہ اور اس طرح کی دیگر روایات ''جامع بیان العلم'' کے ''باب کراهية كتابة العلم'' سے نقل کرتے ہیں اور وہ باب اس حوالے سے قابل اعتبار نہیں کیونکہ اس میں بہت سی ضعیف اور موضوع روایات بھی بیان کی گئی ہیں۔ خاص طور پر علی رضی اللہ عنہ کی اس روایت کی سند میں جابر جعفی کذاب راوی ہے۔ اس کے مقابلے میں خود امام ابن عبدالبر نے اسی کتاب کے ''باب الرخصة في كتابة العلم'' میں اس سے دگنی روایات کتابتِ حدیث کے حق میں بیان کی ہیں تو منکرینِ حدیث ان ابواب کی طرف کیوں نہیں دیکھتے۔

2 حفاظتِ حدیث کے باب میں ہم نے لکھا تھا کہ علی رضی اللہ عنہ نے عہد نبوی میں خود احادیث کا ایک صحیفہ لکھا تھا جس میں دیت، قصاص اور زکاۃ و صدقات کے بے شمار مسائل تھے۔ وہ صحیفہ ان کی زندگی کے آخری لمحات تک ان کے پاس رہا اور ان کی وفات کے بعد ان کے بیٹے محمد بن حنفیہ کی تحویل میں چلا گیا۔

[1] سنن الدار قطني، ص: 210. [2] مقام حدیث، ص: 92.

3 علاوہ ازیں محدثین نے اپنی مسند کتابوں میں علی رضی اللہ عنہ کی 586 روایات بیان کی ہیں۔

4 مزید برآں علی رضی اللہ عنہ نے برسرمنبر اعلان فرمایا تھا کہ کوئی ہے کہ وہ ایک درہم کا کاغذ خرید کر لے آئے تاکہ میں تمھیں احادیث لکھوا دوں۔ حارث اعور جلدی سے کاغذ لے آئے تو آپ نے احادیث لکھ دیں۔[1]

❁ پانچویں دلیل: پرویز صاحب نے لکھا ہے کہ ابونضرہ نے ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ جو احادیث ہم آپ کی زبان سے سنتے ہیں لکھ لیا کریں؟ فرمایا: تم ان کو مصحف بنانا چاہتے ہو؟[2]

جواب: یہ بات درست ہے کہ ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ جن سے امام مسلم رحمہ اللہ نے حدیث نہ لکھنے والی روایت نقل کی ہے، حدیث نہ لکھنے کے قائل تھے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کے نزدیک حدیث حجت نہیں کیونکہ ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ ہمیشہ یہ کہا کرتے تھے کہ جیسے ہم نے زبانی احادیث یاد کی ہیں تم بھی ایسے ہی یاد کرو، چنانچہ انھوں نے اس کے آخر میں بھی یہی فرمایا ہے:

«خُذُوا عَنَّا كَمَا أَخَذْنَا عَنْ رَّسُولِ اللهِ»

"لیکن ہم سے احادیث ویسے ہی حاصل کرو، جیسے ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل کی ہیں۔"[3]

یعنی وہ احادیث یاد کرنے کی ترغیب دلاتے تھے اور محدثین نے ان سے 1170 احادیث نقل کی ہیں۔

❁ چھٹی دلیل: پرویز نے لکھا ہے: "سنن ابوداود، کتاب العلم، حدیث: 3647 میں ہے

---

[1] الطبقات الکبرٰی لابن سعد: 168/6. [2] مقام حدیث، ص: 93. [3] المستدرك للحاکم: 564/3.

کہ ایک بار زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کاتبِ وحی امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس گئے۔ امیر موصوف نے ان سے ایک حدیث پوچھی۔ زید رضی اللہ عنہ نے بیان کی تو انھوں نے ایک شخص کو لکھنے کا حکم دیا۔ زید رضی اللہ عنہ نے اس کو لے کر مٹا دیا اور کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا ہے کہ آپ کی حدیثیں نہ لکھی جائیں۔"[1]

مزید لکھا ہے: "زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ اس کو خلیفہ مروان نے بلایا وہاں انھوں نے کچھ لوگوں کو حدیثیں لکھتے ہوئے دیکھا، ان سے فرمایا: ممکن ہے کہ روایت جس طرح تم سے بیان کی گئی ہو اس طرح نہ ہو۔"[2]

اس کا بھی وہی جواب ہے جو پہلے دیا گیا ہے کہ زید رضی اللہ عنہ انھی صحابہ میں سے تھے جو حدیث نہ لکھنے کو ترجیح دیتے تھے۔ بلکہ زبانی یاد کرنے کو ترجیح دیتے تھے۔ یہ ابتدائی دور کا واقعہ ہے اس کے بعد کتابتِ حدیث کے جواز و استحباب پر صحابۂ کرام کا اجماع منعقد ہو گیا تھا۔[3]

مزید برآں محدثین نے زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کی 92 احادیث متفرق کتابوں میں باسند بیان کی ہیں، چنانچہ ثابت ہوا کہ وہ بھی حدیث کو حجت تسلیم کرتے تھے لیکن وہ حفظِ حدیث کو کتابتِ حدیث پر ترجیح دیتے تھے۔

❁ ساتویں دلیل: پرویز صاحب نے عبداللہ بن مسعود، ابن عباس رضی اللہ عنہم اور امام اوزاعی رحمہ اللہ کی روایات بھی بیان کی ہیں کہ وہ بھی ممانعتِ کتابتِ حدیث کے قائل تھے۔[4]

اس کا بھی وہی جواب ہے جو پہلے گزر چکا ہے، نیز اس کے باوجود عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے 848 اور ابن عباس رضی اللہ عنہما سے 2660 احادیث منقول ہیں۔

---

① مقام حدیث، ص: 91. ② مقام حدیث، ص: 93. ③ فتح الباري: 204/1، تحت حديث: 111. ④ مقام حدیث، ص: 94,93.

تیسرا شبہ

حدیث گمراہی کا سبب ہے۔

اس شبہے کے اثبات کے لیے حافظ اسلم کہتے ہیں: تمھارے قرآن میں کتاب اللہ کے سوا حدیث پر ایمان لانے کا حکم نہیں ہے بلکہ ممانعت نکلتی ہے:

﴿ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِيْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۖ وَّيَتَّخِذَهَا هُزُوًا ﴾

''اور بعض آدمی ایسے ہیں جو حدیث کے مشغلہ کے خریدار بنتے ہیں تا کہ اللہ کی راہ سے بلا علم (یقین کے) بھٹکا دیں اور اس کو مذاق بنالیں۔'' (یہ ترجمہ بھی انھی کا ہے)[1]

حافظ اسلم نے کہا ہے:

اس آیت میں حدیث کی تین صفتیں بیان کی گئی ہیں:

1. اس سے لوگوں کو گمراہ کرنے کا کام لیا جاتا ہے۔
2. اس کی بنیاد علم، یعنی یقین پر نہیں ہے۔
3. اس سے لوگ اللہ کی راہ، یعنی دین کو مذاق بناتے ہیں۔

جواب: اس آیت میں ﴿ لَهْوَ الْحَدِيْثِ ﴾ ''فضول باتیں'' کے نقصانات بتائے گئے ہیں، حدیث کے نہیں۔ ﴿ لَهْوَ الْحَدِيْثِ ﴾ اور حدیث میں تو کوئی نسبت ہی نہیں کیونکہ لفظِ حدیث کا اطلاق تو قرآن پر بھی کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ فَلْيَاْتُوْا بِحَدِيْثٍ مِّثْلِهٖٓ اِنْ كَانُوْا صٰدِقِيْنَ ۝ ﴾

''اگر وہ سچے ہیں تو وہ بھی اس جیسی حدیث (قرآن) لے آئیں۔''[2]

[1] لقمان 6:31. [2] الطور 34:52.

نیز فرمایا:

﴿ اَفَمِنْ هٰذَا الْحَدِيْثِ تَعْجَبُوْنَ ۝ ﴾

”کیا تم اس حدیث (قرآن) پر تعجب کرتے ہو اور ہنستے ہو۔“ ①

نیز فرمایا:

﴿ فَبِاَيِّ حَدِيْثٍ بَعْدَهٗ يُؤْمِنُوْنَ ۝ ﴾

”اور پھر اس کے بعد وہ کس حدیث (قرآن) پر ایمان لائیں گے۔“ ②

نیز فرمایا:

﴿ فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰۤى اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا ۝ ﴾

”کہیں یہ نہ ہو کہ اگر یہ اس حدیث، یعنی قرآن پر ایمان نہ لائیں تو آپ ان کے پیچھے افسوس کرتے کرتے اپنے تئیں ہلاک کر ڈالیں۔“ ③

نیز فرمایا:

﴿ اَفَبِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَنْتُمْ مُّدْهِنُوْنَ ۝ ﴾

”کیا تم اس حدیث (قرآن) سے منکر ہو۔“ ④

نیز فرمایا:

﴿ فَذَرْنِيْ وَمَنْ يُّكَذِّبُ بِهٰذَا الْحَدِيْثِ ﴾

”پس مجھے اس حدیث (قرآن) کو جھٹلانے والے سے نبٹ لینے دو۔“ ⑤

مندرجہ بالا تمام آیات میں حدیث سے مراد قرآن کریم ہے جبکہ ایک جگہ نبی ﷺ کی بات کو بھی حدیث قرار دیا گیا ہے۔ ارشاد ہوا:

① النجم 53: 60,59. ② الأعراف 7: 185، و المرسلات 77: 50. ③ الكهف 6:18.
④ الواقعة 56: 81. ⑤ القلم 68: 44.

﴿ وَاِذْ اَسَرَّ النَّبِيُّ اِلٰى بَعْضِ اَزْوَاجِهٖ حَدِيْثًا ﴾

’’اور جب نبی نے اپنی ایک زوجہ محترمہ سے ایک خفیہ حدیث (بات) کہی۔‘‘[1]

اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں نبی ﷺ کی بات کو حدیث قرار دیا ہے۔

ہم حافظ اسلم سے پوچھ سکتے ہیں کہ ﴿ لَهْوَ الْحَدِيْثِ ﴾ ’’فضول باتوں‘‘ اورلفظِ حدیث میں اگر کوئی فرق نہیں تو پھر نعوذ باللہ تمھاری بیان کردہ حدیث کی تین صفتیں قرآن کریم میں بھی ماننی پڑیں گی۔ اور یہ صفتیں قرآن کے متعلق ماننے سے تمھارے کفر میں کوئی شک نہیں ہوگا۔

معلوم ہوا کہ مفسرین نے ﴿ لَهْوَ الْحَدِيْثِ ﴾ کا مفہوم راگ، گانے اور رقص جو بیان کیا ہے وہ اس میں حق بجانب ہیں کیونکہ یہ چیزیں اللہ کی راہ سے روکنے کا سبب اور گمراہی کا ذریعہ ہیں، نیز راگ گانے کا فی الواقع علم ویقین کے ساتھ کوئی تعلق نہیں لیکن رسول اللہ ﷺ کی حدیث کا علم ویقین کے ساتھ کامل تعلق ہے۔ ہم اس تعلق کو ان شاء اللہ ثابت کریں گے۔ اگر تمام احادیث، لہو الحدیث ہیں جیسا کہ حافظ اسلم نے ثابت کرنے کی ناکام کوشش کی ہے تو پھر پرویز صاحب جن بعض احادیث کو مانتے ہیں وہ بھی اس زمرے میں شامل ہوں گی۔ حقیقت یہ ہے کہ منکرینِ حدیث میں سے حافظ اسلم کے سوا کسی نے بھی یہ تفسیر نہیں کی کہ رسول اللہ ﷺ کی احادیث لہو الحدیث اور گمراہی کا سبب ہیں۔ یہ کفریہ کلمہ حافظ اسلم کی امتیازی خصوصیت ہے۔

چوتھا شبہ

احادیثِ رسول کو حجت ماننا اوراس میں مصروف رہنا قرآن کریم سے حجاب ہے۔

منکرینِ حدیث کا نظریہ ہے: ’’اس حدیث کو دین بنانے سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ

[1] التحریم 3:66.

قرآن جو سراسر زندگی ہے حجاب میں آگیا ہے، چنانچہ محدثین میں آج تک جو اہم اور معرکہ آرا موضوع زیر بحث رہے ہیں بالعموم اس قسم کے ہیں جن کا ملت کی صلاح و فلاح اور اجتماعی زندگی سے کوئی تعلق نہیں، مثلاً: ابوبکر افضل ہیں یا علی رضی اللہ عنہما، قرآن مخلوق ہے یا غیر مخلوق، رات کے پچھلے پہر اللہ تعالیٰ آسمان دنیا پر کس طرح نزول فرماتا ہے؟ قیام نماز میں ہاتھوں کو باندھنا چاہیے یا نہیں؟ کیا امام کے پیچھے فاتحہ پڑھنا ضروری ہے؟ آمین زور سے کہی جائے یا آہستہ وغیرہ بخلاف اس کے اگر قرآن پر مدار ہوتا تو اس ترتیب کے مسائل پیشِ نظر رہتے کہ مرکز کو قوی اور صالح العمل کیوں کر رکھا جائے۔ قرآنی ہدایت عام کرنے اور جملہ انسانی برادری کو اس نجات اور سعادت کے راستے پر لانے کے کیا وسائل ہیں؟ کائنات فطرت جن کی نسبت قرآن نے کہا ہے کہ انسان کے لیے مسخر کیے گئے ہیں ان کی مخفی قوتوں کو کن تدابیر سے قابو میں لاکر انسانی خدمت میں لگایا جاسکتا ہے؟ ایمان اور عمل صالح کو کن ذرائع سے ایسا فروغ دیا جائے کہ ملت کا ہر فرد خلیفہ فی الارض ہوسکے جس کے لیے اس کی تکوین ہوئی ہے وغیرہ وغیرہ۔“

جواب: اس عبارت میں حافظ اسلم نے محدثین کی دینی وملی خدمات کو بالائے طاق رکھ کر ان کی مساعیِ جمیلہ کو مختلف انداز میں پیش کرکے تین چیزیں بیان کی ہیں۔

1. فضیلت ابوبکر وعلی رضی اللہ عنہما
2. اللہ تعالیٰ کا آسمان دنیا پر نزول فرمانا اور خلقِ قرآن
3. فروعی اختلافات

حقیقت یہ ہے کہ یہ انفرادی مسائل نہیں بلکہ ملت کا اجتماعی مفاد صحیح عقیدے پر مبنی ہے اور بدعی عقائد سے ملت میں انتشار پیدا ہوتا ہے۔ محدثین نے بدعی عقائد کے سامنے سینہ سپر ہوکر ملت کو انتشار سے بچانے کی کوشش کی۔ آئیے! اب ترتیب وار تینوں متذکرہ

مسائل کا جائزہ لیتے ہیں۔

پہلا مسئلہ: جب ابن سبا یہودی نے نسلی اور نسبی قرابت کو امامت اور وصایت کے سبب کا عقیدہ رائج کرنے کی کوشش کی تو اس سے یہ مسئلہ پیدا ہوا کہ کون افضل ہے۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ یا علی رضی اللہ عنہ؟ اگر نسبی و نسلی قرابت کو اصل دین سمجھ لیا جاتا تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ تینوں خلفاء ابوبکر، عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم کی خلافت ناجائز اور ظلم بن جاتی۔ یہ سیاسی اور اجتماعی نوعیت کا مسئلہ تھا، چنانچہ محدثینِ کرام نے اس مسئلے کو زیر بحث لا کر اس بدعی عقیدے کے خلاف حق کا دفاع کر کے امت پر عظیم احسان کیا ہے۔

دوسرا مسئلہ: خلقِ قرآن اور اللہ تعالیٰ کا آسمان دنیا پر نزول فرمانا صفات الٰہیہ کے اعتقادی مسائل ہیں۔ منکرینِ حدیث معتزلہ اور جہمیہ نے یہ مسائل امت میں انتشار پیدا کرنے کے لیے چھیڑے۔ مامون الرشید نے، جو پکا معتزلی تھا، خلقِ قرآن کے مسئلے پر بیشتر علمائے حق کے خون سے اپنے ہاتھ رنگین کیے۔ غیر معتزلہ کو سرکاری ملازمتوں سے برطرف کیا۔ ان کی گواہیوں کو غیر معتبر قرار دیا۔ محدثین نے اس انتشار سے امت کو بچانے اور حق کے دفاع کے لیے ایسی شاندار جدوجہد کی کہ اسلامی تاریخ کا روشن باب رقم ہو گیا۔

تیسرا مسئلہ: فروعی اختلافات ہیں۔ اس مسئلے میں تو تمام اہلِ نظر کے نزدیک اختلاف کی گنجائش ہے۔ محدثین نے ان مسائل پر اس لیے مباحثے کیے کہ عامۃ الناس بلکہ بعض اہل علم بھی فتنۂ تقلید شخصی کا شکار ہو رہے تھے جس سے ملت کا اجتماعی مقام منتشر ہو رہا تھا۔ محدثین نے اس فتنے سے ملت کو بچانے کے لیے ان مسائل کے متعلق احادیث کی طرف توجہ دلا کر تقلید شخصی کے التزام سے محفوظ رہنے اور مذہبی تعصب ختم کرنے کی جدوجہد کی۔

حافظ اسلم کا کہنا ہے: ''اگر قرآن پر مدار ہوتا تو اس نوعیت کے مسائل پیش نظر رہتے کہ مرکز کو قوی اور صالح العمل کیوں کر رکھا جائے۔'' حافظ صاحب کا یہ کلام حدیث دشمنی

پر مبنی اور حدیث کو قرآن کا مدمقابل بنانے کی کوشش ہے۔ حدیث نے کسی وقت اور کسی مسئلے میں قرآن کی مخالفت نہیں کی بلکہ اس کی تفصیل اور تشریح کی ہے۔

حافظ اسلم مزید کہتے ہیں: ''قرآنی ہدایت کو عام کرنے اور جملہ انسانی برادری کو اس نجات اور سعادت کے راستے پر لانے کے کیا وسائل ہیں؟'' اس کا جواب یہ ہے کہ محدثین نے اس کام کے لیے تین وسائل بنائے ہیں:

1. قرآن وحدیث کی تدریس
2. خطابات ومحاضرات
3. قرآن و حدیث کی تشریح اور وضاحت کے لیے تفاسیر، شروح، اصولِ تفسیر اور اصولِ حدیث کی نشر واشاعت۔

منکرینِ حدیث بتادیں کہ اس کے علاوہ اورکون سے وسائل ہیں کہ محدثین ان سے غافل رہے ہوں اور منکرینِ حدیث نے وہ وسائل استعمال کیے ہوں؟

حافظ صاحب نے مزید کہا: ''کائنات فطرت، جن کی نسبت قرآن نے کہا ہے کہ وہ انسان کے لیے مسخر کیے گئے ہیں، کی مخفی قوتوں کو کن تدابیر میں لاکر انسانی خدمت میں لگایا جاسکتا ہے؟''

ہم کہتے ہیں: ایک تسخیر کونی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان، زمین، پہاڑ، درخت، آگ اور پانی وغیرہ انسانی خدمت میں لگا رکھے ہیں، اس میں انسان کا کوئی دخل نہیں، البتہ ان نعمتوں کو قائم دائم رکھنے کا ذریعہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرعی تعلق قائم رکھنا ہے کیونکہ وہ مسبب الاسباب ہے۔ اس کی ناراضی نعمتوں کے چھن جانے کا ذریعہ بنتی ہے۔ اس بارے میں محدثین اور علمائے امت نے قرآن اور حدیث کے ذریعے سے تزکیۂ نفس کی طرف توجہ دلائی۔

دوسری تسخیر عملی (اختیاری) ہے جسے علم ہیئت، ریاضی، علم الحیوانات، کیمیا، طب، ہندسہ اور علم النباتات وغیرہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس میدان میں بھی ایسے لوگوں نے قابل فخر کارنامے سرانجام دیے ہیں، جن میں بعض بڑے جید علماء تھے جو حدیث کو دین اور حجت سمجھتے تھے۔ اہل مغرب بھی ان کے کارناموں کے معترف ہیں بلکہ اہل مغرب نے ان کی تصنیفات کے تراجم کر کے سائنس اور ان علوم کو ترقی دی۔ تاریخ کی روشنی میں چند نمونے ملاحظہ فرمائیں:

ابراہیم بن حبیب فزاری	متوفی	770ء	ماہر علم ہیئت
جابر بن حیان	//	817ء	ماہر علم کیمیا
عبدالملک	//	821ء	ماہر علم الحیوانات
محمد بن موسیٰ خوارزمی	//	844ء	ماہر علم نجوم، جغرافیہ اور جبر و مقابلہ
یعقوب بن اسحاق کندی	//	850ء	ماہر فلسفہ، حساب، علم الأعداد، ہندسہ اور علم ہیئت
ابوبکر بن زکریا رازی	//	925ء	ماہر ہندسہ، طب اور کیمیا
ابونصر فارابی	//	951ء	ماہر فلسفہ، منطق، ریاضیات اور کیمیا
ابن سینا	//	1037ء	ماہر طب یونانی اور منطق
ابوالہیثم	//	1039ء	ماہر ریاضی، طبعیات اور طب
ابوریحان بیرونی	//	1048ء	ماہر سیاح، فلسفہ، ریاضی، ہندسہ اور طب
ابن رشد	//	1198ء	ماہر فلسفہ، طب اور ہیئت
فخرالدین رازی	//	1210ء	ماہر ریاضی، ہندسہ، طب اور ہیئت
ابن بیطار	//	1248ء	ماہر علم نباتات

ان کے علاوہ اور بھی کئی ایسے علماء ہیں جنھوں نے تسخیرِ کائنات کے علوم میں تفوق حاصل کیا ہے۔ پرویزیوں سے ہماری استدعا ہے کہ وہ بتائیں کہ انھوں نے حدیث سے انکار کر کے ملت وامت کے اندر انتشار پیدا کرنے کے سوا اور کیا کیا ہے؟

پانچواں شبہ

حدیث فرقہ بندی کا سبب ہے۔اس سلسلے میں پرویز صاحب نے لکھا ہے:

''ان احادیث کو دین مان لینے کا نتیجہ یہ ہوا کہ امت میں سینکڑوں فرقے بن گئے اور ملت کا شیرازہ بکھر گیا۔ سنیوں کی حدیثیں الگ ہیں اور شیعوں کی الگ۔ ہر فرقے نے اپنے مذہب کی تعمیر اپنے حسبِ منشا روایات سے کی۔ وہ صرف اپنی ہی حدیثوں کو صحیح سمجھتا ہے اور دوسروں کی حدیثوں کو غلط، جبکہ فرقہ بندی قرآن کریم کی رو سے شرک ہے۔''[1]

حدیث کو دین ماننے کا نتیجہ پرویز صاحب نے یہ لکھا کہ سینکڑوں فرقے بن گئے، یعنی سو سے زائد فرقے بن گئے جبکہ وہ شیعہ اور سنی کے علاوہ تیسرے فرقے کا نام نہ لے سکے۔ان سے پوچھا جا سکتا ہے کہ باقی فرقے کون سے ہیں؟

شیعہ اور سنی فرقہ بندی کا اصل سبب احادیث کا الگ الگ ہونا نہیں بلکہ شیعہ حضرات کے بدعت پر مبنی عقائد ہیں جو ابن سبا نے مسلمانوں میں داخل کر دیے۔ان عقائد ہی کے اختلاف کی وجہ سے شیعوں نے صحتِ حدیث کے لیے اپنی طرف سے یہ شرط اضافی طور پر عائد کر دی کہ وہ حدیث ان کے کسی نہ کسی امام سے مروی ہو جبکہ اہل سنت والجماعت نے صحتِ حدیث کے لیے دو مشہور شرطوں کے علاوہ یہ شرط رکھی کہ وہ روایت کسی بدعت کی مؤید نہ ہو، خواہ وہ حدیث کسی امام سے منقول ہو یا کسی اور سے۔حجیتِ حدیث کے بارے

[1] مقام حدیث، ص: 14.

میں شیعہ وسنی دونوں متفق ہیں تو اختلاف وتفرق کا سبب احادیث نہیں بلکہ بدعی عقائد ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اہلِ تشیع میں سب سے زیادہ فرقے بن گئے۔ ابتدا میں اہلِ تشیع کے تین فرقے بنے۔ ① غالیہ ② زیدیہ ③ رافضیہ

پھر غالیہ کے بارہ، زیدیہ کے چھ اور رافضیہ کے چودہ فرقے بن گئے اور اس طرح شیعہ کل بتیس فرقوں میں تقسیم ہوگئے۔[1]

اسی طرح بدعی عقائد کی وجہ سے معتزلہ (منکرین حدیث) بھی چھ بڑے فرقوں میں تقسیم ہوگئے۔ ہم کہتے ہیں کہ اگر حدیث کو حجت مان لینا اختلاف وتفرق کا سبب ہے تو پھر معتزلہ جو منکرینِ حدیث ہیں وہ اتنے فرقوں میں کیوں بٹ گئے ہیں؟ حقیقت میں انکار حدیث تفرق کا سب سے بڑا سبب ہے۔ موجودہ دور میں منکرینِ حدیث کے مختلف فرقے چکڑالوی کا فرقہ، علامہ مشرقی کا فرقہ، ڈاکٹر جیلانی برق کا فرقہ، سر سید احمد خان کے معتقدین اور پرویز صاحب کی جماعت موجود ہے اور ان کے آپس میں اختلافات ہیں اگرچہ انکارِ حدیث میں یہ سب متفق ہیں۔

اگر کوئی پرویزی اپنے شبہ کی تائید کے لیے مقلدین کے باہمی اختلاف کی مثال دیتا ہے تو اس کا بھی تحقیقی جواب یہ ہے کہ یہ اختلاف حدیث کو حجت ماننے سے پیدا نہیں ہوا بلکہ وہ ایک بدعت پر مبنی عقیدے سے پیدا ہوا ہے اور وہ ہے تقلیدِ شخصی کا التزام، یعنی کسی نہ کسی امام کی تقلید کو واجب سمجھ کر دوسرے کو گمراہ سمجھنا، چنانچہ فرقہ بندی کا اصل سبب بدعی عقائد ہیں اور انکارِ حدیث بھی ایک بدعی عقیدہ ہے، اس وجہ سے منکرینِ حدیث اور فہم قرآن کے لیے اپنی عقل کو معیار سمجھنے والوں میں اختلافِ عقل کی وجہ سے بے شمار اختلافات ہیں اور مزید اختلافات پیدا ہوتے رہیں گے۔

[1] دیکھیے: کتاب الملل والنحل از شہرستانی۔

چھٹا شبہ: آیات قرآنیہ سے استدلال

منکرینِ حدیث حجیتِ حدیث سے انکار میں نمایاں اور ''پرکشش'' انداز میں جو دلیل پیش کرتے ہیں وہ قرآن کریم کی درج ذیل آیات ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ ﴾

''ہم نے آپ پر ایسی کتاب نازل کی جس میں ہر چیز کا بیان ہے۔''[1]

نیز فرمایا:

﴿ وَتَفْصِيْلَ كُلِّ شَيْءٍ ﴾

''ہر بات کی تفصیل (اس کتاب میں) ہے۔''[2]

نیز فرمایا:

﴿ وَّهُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ اِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا ﴾

''وہ ذات جس نے تمھاری طرف کتاب نازل فرمائی جو کہ واضح ہے۔''[3]

نیز فرمایا:

﴿ كِتٰبٌ فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝ ﴾

''ایک کتاب ہے کہ اس کی آیات کو کھول کھول کر بیان کیا گیا ہے، قرآن عربی زبان میں اس قوم کے لیے جو جانتے ہیں۔''[4]

لغت کے اعتبار سے ظاہری معنی یہ ہے کہ قرآن کریم بذات خود ایک جامع، مفصل اور مکمل کتاب ہے جس میں ہر چیز کا بیان ہے۔ اس بات میں تو کسی مسلمان کا اختلاف نہیں لیکن منکرینِ حدیث اس سے یہ مقصد لیتے ہیں کہ قرآن کریم کو سمجھنے اور اس پر عمل کرنے

[1] النحل 89:16. [2] يوسف 111:12. [3] الأنعام 114:6. [4] حٰمٓ السجدة 3:41.

کے لیے ہمیں رسول اللہ ﷺ کی ہدایت کی اتباع اور اس کی تشریح کی ضرورت نہیں۔ نبی ﷺ نے اپنی زندگی میں قرآن کریم پر عمل کر کے ایک صحیح معاشرہ قائم کردیا جو اس وقت کے تقاضے کے مطابق تھا۔ اب ہم اپنے زمانے میں صاحبِ وحی کی طرح قرآن کریم پر عمل کرنے سے حدیث کے بغیر ہی مناسب معاشرہ قائم کرسکتے ہیں۔ ﴿كُلِّ شَيْءٍ﴾ ''ہر چیز'' کے الفاظ میں تمام اصول، فروع، کلیات اور جزئیات شامل ہیں۔ ہر مسئلہ قرآن کریم میں موجود ہے۔

جواب: 1 عقل اور محاورے کے لحاظ سے یہ استدلال بالکل غلط ہے، جزئیات اور فروع لامحدود ہیں، احادیث اور تفسیر وفقہ کی بہت سی کتابیں ہیں لیکن اب بھی ایسی جزئیات اور فروع سامنے آتی ہیں کہ ان کا حل صراحت کے ساتھ ان بہت سی کتابوں میں بھی نہیں۔

لفظ ﴿كُلِّ شَيْءٍ﴾ کبھی لغوی معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے اور اسے استغراق حقیقی کہا جاتا ہے، جیسے فرمایا:

﴿إِنَّ اللَّهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ۝﴾

یعنی کوئی بھی چیز اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اس کے علم سے خارج نہیں لیکن یہ لفظ محاورے کے لحاظ سے عموماً استغراق عرفی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ جیسا کہ قرآن کریم میں تورات کے متعلق فرمایا:

﴿وَكَتَبْنَا لَهُ فِي الْأَلْوَاحِ مِن كُلِّ شَيْءٍ مَّوْعِظَةً وَتَفْصِيلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ﴾

''اور ہم نے اس (موسیٰ علیہ السلام) کے لیے تختیوں پر ہر طرح کی نصیحت اور ہر چیز کی تفصیل لکھ دی۔''[1]

اگر تورات میں ہر چیز کی تفصیل تھی تو پھر اس کے بعد انجیل، زبور اور قرآن کریم

[1] الأعراف 7:145۔

نازل کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ لیکن اس سے مراد یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کے دین میں جو ضروری اصول و کلیات تھے وہ اس (تورات) میں بیان کیے گئے تھے۔ اسی طرح ابراہیم علیہ السلام کے خاص معجزے کے متعلق فرمایا:

﴿ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰى كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ يَأْتِيْنَكَ سَعْيًا ﴾

''پھران میں سے ایک ایک ٹکڑا ہر پہاڑ پر رکھ دیں، پھر انھیں بلائیں تو وہ آپ کی طرف دوڑتے ہوئے آئیں گے۔''[1]

اگر یہاں ﴿ كُلِّ جَبَلٍ ﴾ ''ہر پہاڑ'' سے دنیا کے تمام پہاڑ مراد لیے جائیں تو یہ عادت اور عقل کے خلاف ہے۔ کسی انسان کے اختیار ہی میں نہیں کہ وہ دنیا کے تمام پہاڑوں پر پہنچ سکے۔ یہاں بھی وہ بعض پہاڑ مراد ہیں جو ابراہیم علیہ السلام کے نزدیک تھے۔

شعیب علیہ السلام نے اپنی قوم کو منع کرتے ہوئے فرمایا:

﴿ وَلَا تَقْعُدُوْا بِكُلِّ صِرَاطٍ ﴾

''اور ہر راستے پر نہ بیٹھو۔''[2]

شعیب علیہ السلام کی قوم کے لوگ تمام راستوں میں بیٹھتے تھے نہ بیٹھ سکتے تھے، لہٰذا اس آیت میں بھی کل سے بعض مراد ہے، یعنی وہاں کے نزدیک والے راستے۔

فرعون نے موسیٰ علیہ السلام کے مقابلے میں ساحر جمع کرنے کے لیے ان الفاظ کے ساتھ حکم دیا:

﴿ ائْتُوْنِيْ بِكُلِّ سٰحِرٍ عَلِيْمٍ ۝ ﴾

''تمام ماہر جادوگروں کو میرے پاس لے آؤ۔''[3]

اس آیت میں بھی تمام جادوگروں سے مراد دنیا کے تمام جادوگر نہیں تھے بلکہ صرف مصر میں رہنے والے جادوگر ہی مراد تھے۔ اسی طرح قرآن کریم میں استغراق عرفی کی

[1] البقرة 260:2. [2] الأعراف 86:7. [3] يونس 79:10.

بہت سی مثالیں موجود ہیں تو ﴿ وَّ تَفۡصِیۡلًا لِّکُلِّ شَیۡءٍ ﴾ اور ﴿ تِبۡیَانًا لِّکُلِّ شَیۡءٍ ﴾ سے یہ مراد نہیں کہ تمام اصول وکلیات اور فروع و جزئیات قرآن کریم میں موجود ہیں بلکہ اس سے مراد دین اسلام کے ضروری اصول وکلیات، علوم و معارف اور جزئیات میں سے بعض صراحت کے ساتھ، بعض اشارتاً، بعض دلالتاً، بعض مجمل، بعض مفسر اور بعض متشابہ کے طور پر موجود ہیں، پھر ان میں سے جس کی ضرورت اور اہمیت زیادہ تھی، اس کی شرح احادیث میں بیان کردی اور حدیث کے احکام بھی درحقیقت قرآن کے احکام ہیں جیسا کہ پہلے ثابت کیا گیا ہے۔

2 پرویز صاحب خود بھی اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ قرآن کریم میں سب کچھ نہیں ہے، چنانچہ لکھتے ہیں: ''ہمارا ایمان ہے کہ قرآن تمام انسانوں کی ہدایت کے لیے خدا کی طرف سے نازل ہوا ہے اور اس کی ہدایت قیامت تک نافذ العمل رہے گی۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کے ضابطۂ حیات میں ہر قسم کے مسائل و معاملات کے لیے جزئی اور فروعی احکام نہیں دیے جاسکتے تھے۔''[1]

نیز لکھا ہے: ''دوسری قابل غور حقیقت یہ ہے کہ قرآن میں کچھ احکام دیے گئے ہیں لیکن بیشتر امور میں اصولی ہدایت دی گئی ہے۔ نظام خداوندی کا فریضہ یہ ہے کہ وہ ان اصولوں کے احکام نہیں بلکہ اصولوں کی جزئیات حالات کے تقاضے کے مطابق جماعت مومنین کے مشورہ سے خود مرتب کرے۔''[2]

حاصل کلام یہ ہے کہ پرویزی فکر کے مطابق قرآن میں سارے احکام نہیں ہیں۔ جزئیات فروع کی تفصیل جماعت مومنین (کبھی اسے مرکز ملت کا نام دیا جاتا ہے) کے مشورے سے کی جائے گی۔ کیا اس طرح قرآن ''ہر چیز کی تفصیل'' ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ

① مقام حدیث، ص: 242. ② مقام حدیث، ص: 65.

قرآن کریم میں سارے احکام نہیں ہیں اور جزئیات و فروع کی تفصیل محمد ﷺ نے کی ہے، لہٰذا اہل اسلام غور فرمائیں کہ مرکز ملت اور جماعت مومنین کا مشورہ مفید اور صحیح ہو گا یا محمد ﷺ کی شرح اور تفصیل صحیح ہوگی جو ہر زمانے کے مطابق بھی ہے۔ اور ﴿ وَتَفْصِيلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ ﴾ ''ہر چیز کی تفصیل'' کا مصداق بھی۔

ساتواں شبہ: بذریعہ قرآن تکمیل دین

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ ﴾

''آج کے دن میں نے تمھارے لیے دین کامل کر دیا۔''[1]

حافظ اسلم مندرجہ بالا آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''جب دین مکمل ہو گیا تو پھر احادیث کی ضرورت ہی کیا باقی رہ گئی۔ احادیث کی حیثیت بس تاریخی اور ظنی ہے جو بہت عرصہ بعد لکھی گئی ہیں۔ اگر احادیث بھی دین کا حصہ تھیں تو یہ آدھا یا آدھے سے زیادہ دین جو احادیث میں مندرج ہے اس کے بغیر دور صحابہ میں دین کیسے مکمل ہو گیا تھا۔''

جواب: ① اس آیت میں دین کے مکمل ہونے کا وہی مطلب ہے جو پہلے قرآن میں ﴿ وَتَفْصِيلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ ﴾ ''ہر چیز کی تفصیل'' کی وضاحت کے تحت بیان کیا گیا ہے۔

② اس آیت کا زمانۂ نزول حجۃ الوداع سن 10 ہجری، مقام عرفات، عرفہ کا روز ہے۔ نبی ﷺ نے اس وقت تک قرآن کریم کی صرف تلاوت ہی نہیں کی تھی بلکہ آپ ﷺ نے قولی اور عملی طور پر اس کی شرح اور تفصیل بھی بیان کی تھی جس کا نام احادیث ہے۔

① المآئدة 3:5.

اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ان سب کو دین قرار دیا ہے۔ جس دین کو مکمل کیا گیا احادیث بھی اسی کا حصہ ہیں۔

حافظ اسلم کی تفسیر کا آخری جملہ ہے:

''یہ آدھا یا آدھے سے زیادہ دین جو احادیث میں مندرج ہے، اس کے بغیر دور صحابہ میں دین کیسے مکمل ہو گیا تھا۔''

اس جملے میں بہت تلبیس سے کام لیا گیا ہے۔ اور اس کا جواب یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی احادیث تو صحابۂ کرام کی وساطت سے موصول ہوئی ہیں، لہٰذا جو دین احادیث میں مندرج ہے وہ صحابۂ کرام کے وقت مکمل تھا اور یہ تکمیل حجۃ الوداع کے دن ہو چکی تھی۔ باقی احادیث کی تاریخی یا ظنی حیثیت پر ان شاء اللہ اس کے بعد تفصیلی بحث آئے گی۔

آٹھواں شبہ: حدیثِ قرطاس

منکرینِ حدیث کبھی اپنے مقصد کی احادیث سے استدلال کر کے احادیث کو دینی حجیت سے نکالنے کی کوشش کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ حدیثِ قرطاس میں عمر رضی اللہ عنہ نے نبی ﷺ اور دیگر صحابہ کے سامنے کہا تھا: ''ہمارے لیے اللہ کی کتاب کافی ہے۔''[1] یعنی حدیث کی کوئی ضرورت نہیں۔

پھر منکرینِ حدیث کتاب کا معنی ذکر کرتے ہیں۔ قرآن اپنے آپ کو بار بار کتاب کہتا ہے۔ پہلی آیت ﴿ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ﴾ میں کتاب کا معنی ذکر کیا: ''عرب اس لکھی ہوئی چیز کو کتاب کہتے تھے جو مدون شکل میں سلی ہوئی صورت میں موجود ہو۔''[2]

[1] صحیح البخاري، العلم، باب کتابة العلم، حدیث: 114. [2] قرآنی فیصلے، ص: 668.

کتاب اللہ کے متعلق پرویز صاحب نے لکھا ہے:

''یہ کتاب قرآن ساتھ کے ساتھ ہی محفوظ ہوتی چلی گئی اور جب نبی ﷺ اس دنیا سے تشریف لے گئے ہیں تو یہ بعینہٖ اسی شکل اور اسی ترتیب میں جس میں یہ اس وقت ہمارے پاس ہے لاکھوں مسلمانوں کے پاس موجود اور ہزاروں کے سینوں میں محفوظ تھی، اس کی ایک مستند (ماسٹر) کاپی مسجد نبوی میں ایک ستون کے قریب صندوق میں رکھی رہتی تھی۔ یہ وہ نسخہ تھا جس میں نبی ﷺ سب سے پہلے وحی لکھوایا کرتے تھے، اسے ام یا امام کہتے تھے۔ اور اس ستون کو جس کے قریب یہ نسخہ رہتا تھا استوانۂ مصحف کہا جاتا تھا۔ اس ستون کے پاس بیٹھ کر صحابۂ کرام نبی ﷺ کی زیر نگرانی اس مصحف سے اپنے اپنے مصاحف نقل کیا کرتے تھے۔ اس کتاب کی اشاعت اس قدر عام ہوگئی تھی کہ جب نبی ﷺ نے اپنے آخری حج (حجۃ الوداع) کے خطبہ میں لاکھوں نفوس کو مخاطب کر کے پوچھا: کیا میں نے تم تک خدا کا پیغام پہنچا دیا ہے؟ تو چاروں طرف سے یہ آواز گونج اٹھی: ہاں! آپ نے اسے پہنچا دیا ہے، یہی تھی وہ کتاب جس کے متعلق حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نبیٔ اکرم ﷺ کی حیات طیبہ کے آخری لمحات میں دیگر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی موجودگی میں فرمایا تھا کہ حَسْبُنَا كِتَابُ اللهِ ''ہمارے لیے اللہ کی کتاب کافی ہے۔''

اس اقتباس میں چند امور زیر بحث ہیں:

❁ عرب کے نزدیک کتاب لکھی ہوئی چیز کو کہتے ہیں جو مدون شکل میں سلی ہوئی صورت میں ہو۔

❁ جس شکل اور ترتیب میں اب موجود ہے اس صورت میں نبی ﷺ کے زمانے میں موجود تھی اور لاکھوں مسلمانوں کے پاس موجود تھی۔

❁ مسجد نبوی میں نبی ﷺ کے زمانے میں ماسٹر کاپی موجود تھی، اسے امام کہتے تھے۔

❁ صحابۂ کرام اس سے اپنے مصاحف نقل کرتے تھے۔

❁ نبی ﷺ نے فرمایا: کیا میں نے خدا کا پیغام تمھیں پہنچادیا ہے۔

❁ عمر رضی اللہ عنہ نے اس کتاب کے متعلق کہا: حَسْبُنَا كِتَابُ اللّٰه.

مندرجہ بالا اقتباس میں مذکورہ امور محل نظر ہیں لیکن جواب سے پہلے ہم پرویزیوں سے پوچھتے ہیں کہ یہ سارا قصہ کس حوالے سے نقل کیا گیا ہے۔کوئی آیت یا حدیث پیش کریں، البتہ اس قصے میں دو حدیثوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔(حجۃ الوداع اور مرض موت) اس سے معلوم ہوا کہ حدیث حجت ہے۔ اگر حجت نہیں تو آپ نے کیوں یہ حوالے پیش کیے ہیں؟

اب ہم تفصیل کے ساتھ جواب پیش کرتے ہیں۔ہم کتاب کے معانی کا تعین کرنے کے لیے صرف عرب پر انحصار نہیں کرسکتے۔خود قرآن کریم سے نقل کرتے ہیں۔لفظ کتاب قرآن کریم میں 230 مرتبہ بیان کیا گیا ہے۔اوراس کا مادہ (ک، ت، ب) 319 مرتبہ مذکور ہے۔ یہ لفظ قرآن کریم میں مختلف معانی میں استعمال ہوا ہے۔

1 فرض شدہ چیز کے معنی میں، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا ۝ ﴾

”بے شک نماز مومنوں پر ہمیشہ سے وقت مقررہ پر فرض کردی گئی ہے۔“[1]

2 حجت کے معنی میں، جیسے فرمایا:

﴿ فَاْتُوْا بِكِتٰبِكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ ﴾

”پس تم اپنی کوئی حجت و دلیل پیش کرو اگر تم سچے ہو۔“[2]

3 اجل کے معنی میں، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

---

[1] النسآء 4:103. [2] الصّٰفّٰت 37:157.

﴿ وَمَآ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ اِلَّا وَلَهَا كِتَابٌ مَّعْلُوْمٌ ○﴾

''اور ہم نے کوئی بستی ہلاک نہیں کی مگر یہ کہ اس کی ہلاکت کا وقت مقرر تھا۔''[1]

4 غلام کو مکاتب بنانا، یعنی مال کے عوض اسے آزاد کرنا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَالَّذِيْنَ يَبْتَغُوْنَ الْكِتٰبَ مِمَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ فَكَاتِبُوْهُمْ اِنْ عَلِمْتُمْ فِيْهِمْ خَيْرًا ﴾

''جو غلام تم سے مکاتبت کرنا چاہیں، اگر تمھیں ان میں کوئی بھلائی معلوم ہو تو ان سے مکاتبت کر لو۔''[2]

5 لکھنے کے معنی میں، جیسے فرمایا:

﴿ وَكُلَّ شَيْءٍ اَحْصَيْنٰهُ كِتٰبًا ○﴾

''اور ہم نے ہر چیز لکھنے کے ذریعے سے شمار کر رکھی ہے۔''[3]

6 اعمال نامے کے معنی میں، جیسے فرمایا:

﴿ وَنُخْرِجُ لَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ كِتٰبًا يَّلْقٰهُ مَنْشُوْرًا ○﴾

''ہم روز قیامت اس کے واسطے اعمال نامہ نکال کر سامنے کر دیں گے (اور) وہ اسے کھلا ہوا پائے گا۔''[4]

7 لوح محفوظ کے معنی میں، جیسے فرمایا:

﴿ اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ ○ۙ فِيْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ ○ۙ﴾

''بے شک یہ قرآن بڑی قدر و منزلت والا ہے جو لوح محفوظ میں ہے۔''[5]

8 خط کے معنی میں، جیسے فرمایا:

---

① الحجر 4:15. ② النور 33:24. ③ النبا 29:78. ④ بنيٓ إسرآءيل 13:17. ⑤ الواقعة 78,77:56.

﴿ اِنِّیۡۤ اُلۡقِیَ اِلَیَّ کِتٰبٌ کَرِیۡمٌ ○﴾

''بے شک میری طرف ایک عزت والا خط پھینکا گیا ہے۔''[1]

9 تقدیر میں لکھی ہوئی چیز، مثلاً: اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ اُولٰٓئِکَ یَنَالُہُمۡ نَصِیۡبُہُمۡ مِّنَ الۡکِتٰبِ ﴾

''ان لوگوں کے نصیب میں جو لکھا ہے وہ انھیں مل جائے گا۔''[2]

10 عدت کے معنی میں، جیسے فرمایا:

﴿ وَلَا تَعۡزِمُوۡا عُقۡدَۃَ النِّکَاحِ حَتّٰی یَبۡلُغَ الۡکِتٰبُ اَجَلَہٗ ﴾

''جب تک عدت پوری نہ ہو جائے عقد نکاح کا قصد نہ کرو۔''[3]

11 حکم شرعی کے معنی میں، جیسے فرمایا:

﴿ وَ اُولُوا الۡاَرۡحَامِ بَعۡضُہُمۡ اَوۡلٰی بِبَعۡضٍ فِیۡ کِتٰبِ اللّٰہِ ﴾

''اور رشتے دار حکم شرعی (کتاب اللہ، سنت) کی رو سے ایک دوسرے کے زیادہ حق دار ہیں۔''[4]

12 تدوین شدہ مجموعے کے معنی میں جو عجم کے عرف میں مشہور ہے، جیسے فرمایا:

﴿ وَ ہٰذَا کِتٰبٌ اَنۡزَلۡنٰہُ ﴾

''اور یہ کتاب ہم نے نازل کی ہے۔''[5]

اس تفصیل کا مطلب یہ ہے کہ کتاب کا جو معنی پرویز صاحب نے عربوں کی طرف منسوب کیا ہے کتاب کا صرف وہ معنی نہیں ہے، یہ معنی عجم کے ہاں مشہور ہے اور ان کی اصطلاح ہے جبکہ عرب میں تو لفظ کتاب کے متعدد اور مختلف معانی ہیں۔ پھر ﴿ ذٰلِکَ الۡکِتٰبُ

① النمل 29:27. ② الأعراف 37:7. ③ البقرة 235:2. ④ الأحزاب 6:33. ⑤ الأنعام 155:6.

لَا رَیْبَ ۛۖ فِیْهِ ۛۚ میں کتاب سے مدون شکل میں سلی ہوئی کتاب مراد لینا بڑا عجیب ہے کیونکہ یہ آیت سورۂ بقرہ کی ہے اور سورۂ بقرہ مدینہ طیبہ میں پہلی نازل شدہ سورت ہے۔ اس وقت قرآن کریم کی مکی سورتوں کی تعداد 86 تھی جو اس سے پہلے نازل ہوچکی تھیں، لہٰذا سوال پیدا ہوتا ہے کہ انھیں کس نے مدون کر کے ان کے اوراق کی سلائی کی؟

پرویز صاحب مزید کہتے ہیں کہ یہ جیسے ہمارے پاس موجود ہے بعینہٖ اسی شکل اور اسی ترتیب میں لاکھوں مسلمانوں کے پاس موجود تھی۔ یہ بات پہلی بات سے بھی زیادہ عجیب ہے۔ تاریخ سے ثابت ہے کہ کاغذ 134 ہجری بمطابق 751ء میں ایجاد ہوا۔ اس کا موجد ایک چینی شخص تھا جس نے کتان اور سن کے ریشوں سے کاغذ بنانے کی صنعت شروع کی۔ اس سے پہلے اہل مشرق کے پاس صرف قرطاس موجود تھا۔ یہ کاغذ کی ابتدائی رف سی شکل تھی جو قدیم مصر میں رائج تھی۔ وہ بھی اتنا عام نہیں تھا کہ قرآن جیسی بڑی کتاب کے لیے میسر ہوتا جبکہ دورِ نبوی میں لکھنے کے لیے دو چیزیں دستیاب تھیں، قرطاس جو بہت کم یاب تھا اور ورق جس کا طلوع اسلام میں بھی ذکر ہے کہ ایسے اوراق جو باریک کھال سے بنائے گئے ہوں۔ یہ بھی دورِ نبوت میں عام نہیں تھا۔ ان دنوں پتھر کی سلیں، باریک کھالیں، اور کھجور کی چھال کتابت کے لیے بطور ورق استعمال کی جاتی تھی۔ ان پر قرآن کریم مدون کرنا اور سلا ہوا بنانا عقل سے بعید ہے، البتہ قرآن کریم کو کتاب کہنا اس معنی پر صادق آتا ہے کہ قرآن لوح محفوظ میں، صحفِ ملائکہ میں، صحابۂ کرام کے سینوں میں، پھر پتھروں اور ہڈیوں وغیرہ پر جمع تھا۔ یہ کہنا کہ یہ مجموعہ لاکھوں صحابۂ کرام کے پاس موجود تھا، سراسر جھوٹ ہے۔ اس وقت کوئی چھاپہ خانہ موجود نہ تھا۔ سارے صحابۂ کرام لکھنا نہیں جانتے تھے اور ضرورت کے مطابق اوراق و قرطاس بھی میسر نہیں تھے تو قرآن کریم کا نسخہ لاکھوں صحابۂ کرام کے ہاتھوں میں کس طرح آیا؟ مزید برآں یہ کہنا بھی حقیقت کے خلاف

ہے کہ اسطوانۂ مصحف کے پاس قرآن کی ماسٹر کاپی موجود تھی اور اسے کتاب اور امام کہا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں ایسے ہوا تھا کہ ان کے پاس جو نسخہ تھا اسے امام کہا جاتا تھا اور اس سے دوسرے نسخے نقل کیے گئے تھے۔

عمر رضی اللہ عنہ کے فرمان: حَسْبُنَا كِتَابُ اللّٰهِ ''ہمارے لیے اللہ کی کتاب کافی ہے'' کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اس وقت قرآن مدون شکل میں تھا اور نہ ہی یہ مطلب ہے کہ کتاب اللہ سے صرف قرآن کریم مراد ہے، بلکہ عمر رضی اللہ عنہ کی دوسری ایسی روایات موجود ہیں جن میں انھوں نے کتاب اللہ کا اطلاق اس حکم شرعی پر کیا ہے جو احادیث میں موجود ہے۔

عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی خلافت کے آخری ایام میں مسجد نبوی میں صحابۂ کرام کو جو خطبہ ارشاد فرمایا تھا، اس میں فرمایا:

«اَلرَّجْمُ فِي كِتَابِ اللهِ حَقٌّ عَلٰى مَنْ زَنٰى إِذَا أُحْصِنَ»

''شادی شدہ شخص جب زنا کرے تو اسے رجم کرنا کتاب اللہ میں حق واجب ہے۔''[1]

رجم کا ذکر قرآن میں صراحت کے ساتھ نہیں ہے لیکن عمر رضی اللہ عنہ نے اس روایت میں فرمایا: ''کتاب اللّٰہ'' یہاں کتاب اللہ سے مراد حکم شرعی ہے، خواہ وہ حدیث میں ہو۔ عمر رضی اللہ عنہ نے جو فرمایا کہ ہمیں کتاب اللہ کافی ہے تو ان کی مراد یہی تھی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت شدت مرض میں مبتلا ہیں، لہٰذا انھیں لکھنے کی تکلیف نہیں دینی چاہیے بلکہ قرآن و احادیث میں جو احکام موجود ہیں وہ ہمارے لیے کافی ہیں ایک اور روایت میں نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ! لَأَقْضِيَنَّ بَيْنَكُمَا بِكِتَابِ اللهِ جَلَّ ذِكْرُهُ الْمِائَةُ شَاةٍ وَّالْخَادِمُ رَدٌّ عَلَيْكَ، وَعَلَى ابْنِكَ جَلْدُ مِائَةٍ وَّتَغْرِيبُ عَامٍ، وَاغْدُ يَا أُنَيْسُ عَلَى امْرَأَةِ هٰذَا فَإِنِ اعْتَرَفَتْ

[1] صحيح البخاري، الحدود، باب رجم الحبلٰى في الزنا......، حديث: 6830.

فَارْجُمْهَا »

''اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! میں اللہ جل ذکرہ کی کتاب کے مطابق تمھارے درمیان فیصلہ کروں گا۔ سو بکریاں اور خادم تجھے واپس کیا جائے گا اور تیرے بیٹے کی سزا یہ ہے کہ اسے سو کوڑے مارے جائیں اور ایک سال کے لیے جلا وطن کردیا جائے۔ اے انیس! صبح اس شخص کی بیوی کے پاس جانا، اگر وہ اعتراف کرلے تو اسے رجم کردینا۔''[1]

اس حدیث میں بھی کتاب اللہ سے مراد وہ حکم شرعی ہے جو صحیح حدیث میں موجود ہے۔

نوٹ: کتاب اللہ اور کلام اللہ میں فرق ہے۔ قرآن کریم اللہ تعالیٰ کا کلام بھی ہے اور اللہ تعالیٰ کی کتاب بھی ہے جبکہ احادیث شرعی حکم کی وجہ سے کتاب اللہ ہیں، کلام اللہ نہیں۔ کلام اللہ کے لیے شرط ہے کہ اس کے الفاظ بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل شدہ ہوں جبکہ کتاب اللہ کے لیے یہ شرط نہیں۔

مزید برآں نبیِ اکرم ﷺ جو چیز لکھوانا چاہتے تھے وہ آپ نے بیان بھی فرما دی تھی، جیسا کہ حدیث سے واضح ہے، لہٰذا ہم اصل حقیقت سامنے لانے کے لیے وہ متن پیش کرتے ہیں:

ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ جمعرات کا دن، کیا ہے جمعرات کا دن؟ پھر رونے لگے یہاں تک کہ انھوں نے نیچے پڑی ہوئی کنکریوں کو آنسوؤں سے تر کردیا، پھر فرمایا: نبی ﷺ کی بیماری شدید ہوگئی تو آپ نے فرمایا: ''ایک کتاب (لکھنے کی کوئی چیز) لاؤ کہ میں تمھارے لیے کچھ لکھوں۔ اس کے بعد تم کبھی گمراہ نہیں ہوگے۔'' لیکن وہاں موجود صحابۂ کرام نے اختلاف کیا جبکہ نبی ﷺ کی حالت بدل گئی۔ آپ نے فرمایا: ''مجھے میری

[1] صحيح البخاري، الحدود، باب الاعتراف بالزنا، حديث: 6828.

حالت پر چھوڑ دو۔ میری یہ حالت اس چیز سے بہتر ہے جس کی طرف تم مجھے بلاتے ہو۔" پھر آپ نے تین باتوں کی وصیت فرمائی: ① مشرکوں کو جزیرۂ عرب سے نکال دو۔ ② وفد کو عطیہ دیا کرو جیسا کہ میں دیتا ہوں جبکہ تیسری چیز کے بارے میں راوی بھول گیا۔

اس سے معلوم ہوا کہ نبی ﷺ جو لکھوانا چاہتے تھے وہ زبانی طور پر بیان کر دیا اور دین میں کوئی نقص اور کمی نہیں چھوڑی۔[1]

نواں شبہ: نبیٔ اکرم ﷺ کا صرف ایک مجلد کتاب کا چھوڑنا

پرویز لکھتے ہیں:

"ابن عباس رضی اللہ عنہما سے شداد بن معقل نے پوچھا: نبی ﷺ نے امت کے لیے کیا چھوڑا ہے؟ تو انھوں نے فرمایا: آپ نے صرف یہ ایک مجلد کتاب چھوڑی ہے۔"[2]

اسی طرح محمد بن حنفیہ سے پوچھا گیا تو انھوں نے بھی یہی جواب دیا۔"

اس کا جواب واضح ہے کہ موجودہ صورت میں جو قرآن ہے وہ تو ابو بکر رضی اللہ عنہ، پھر عثمان رضی اللہ عنہ نے جمع کیا تھا۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما اور محمد بن حنفیہ نے جو اشارہ کیا ہے اس سے مراد یہ ہے کہ اس وقت وہ دو گتوں کے درمیان جمع شدہ تھا اور اس وقت واقعتاً قرآن مجلد شکل میں موجود تھا۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے جو فرمایا: ماترك "نہیں چھوڑا" تو اس سے مراد یہ ہے کہ قرآن کریم کے سوا جمع شدہ کوئی چیز نہیں چھوڑی کیونکہ نبی ﷺ کے دور میں ساری احادیث ایک مجموعے کی صورت میں موجود نہیں تھیں لیکن مجموعے کی صورت میں

① صحيح البخاري، العلم، باب كتابة العلم، حديث: 114، نیز یہ حدیث امام بخاری نے متعدد مقامات پر نقل کی ہے اور ان سب کا خلاصہ یہاں مذکور ہے، اس لیے مزید دیکھیے: حدیث نمبر: 3053 و 3168 و 4431 و 4432 و 5669 و 7366. ② صحيح البخاري، فضائل القرآن، باب من قال: لم يترك النبي......، حديث: 5019.

موجود نہ ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ احادیث محفوظ نہیں تھیں یا وہ حجت نہیں۔

دسواں شبہ: احادیث ظنی ہیں

طلوع اسلام نے اس بات پر بہت زور دیا ہے کہ دین یقینی چیز ہوتی ہے اور یقینی چیز صرف قرآن ہے جبکہ احادیث ظنی ہیں، لہٰذا ظن دین نہیں ہوسکتا۔ پرویز صاحب کی متعدد تحریروں میں سے ایک درج ذیل ہے:

''دین کے متعلق ایک چیز سے متعلق تو یقیناً آپ متفق ہوں گے، یعنی کہ دین وہی ہوسکتا ہے جو یقینی ہو، ظنی اور قیاسی نہ ہو۔''[1]

طلوع اسلام والے لفظ ظن کو صرف وہم اور شک کے معنی میں استعمال کر کے عام مسلمانوں کو مغالطہ دیتے ہیں کہ احادیث ظن ہیں اور ظن دین نہیں ہوسکتا، لہٰذا احادیث حجت نہیں۔ اس میں چند ضروری امور توجہ طلب ہیں:

1. ظن اور یقین کا لغوی معنی
2. قرآن میں لفظ ظن کا استعمال
3. ظن غالب پر دین کی بنیاد

ہم ان تینوں امور پر الگ الگ مختصر بات کریں گے جس سے یہ شبہ دور ہوجائے گا۔

① ظن اور یقین کا لغوی معنی

❀ **یقین:** یہ وہ عقیدہ ہے جو استدلال کے ذریعے سے شک زائل ہوجانے کے بعد حاصل ہو۔ اسی لیے یہ اللہ تعالیٰ کی صفات میں مستعمل نہیں ہوتا۔ امام راغب فرماتے ہیں: یقین علم کی صفت ہے جو معرفت و درایت سے بڑھ کر ہے۔ اور کہا: سُكُونُ الْفَهْمِ مَعَ

[1] مقام حدیث، ص: 3.

ثُبَاتِ الْحُكْمِ ''حکم کی مضبوطی اور پختگی کے ساتھ فہم کا سکون''[1] قرآن کریم میں عقیدے کے حوالے سے ''یقین'' کا ایجاباً اور سلباً ذکر کیا گیا ہے اور ظن کے مقابلے میں یہ دو مرتبہ مذکور ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿مَا لَهُمْ بِهِ مِنْ عِلْمٍ إِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ ۚ وَمَا قَتَلُوهُ يَقِينًا ۝﴾

''ان کے پاس اس معاملے میں ظن کی پیروی کے سوا کوئی یقینی علم نہیں اور انھوں نے یقیناً اسے (عیسیٰ کو) قتل نہیں کیا۔''[2]

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿إِنْ نَظُنُّ إِلَّا ظَنًّا وَمَا نَحْنُ بِمُسْتَيْقِنِينَ ۝﴾

''ہم تو اسے صرف معمولی سا گمان کرتے ہیں اور ہمیں اس پر ہرگز یقین نہیں۔''[3]

❁ ظن: امام راغب رحمہ اللہ نے ظن کے متعلق لکھا ہے: ''ظن اس چیز کا نام ہے جو علامات سے حاصل ہو اور جب یہ علامات قوی ہوں تو اس سے علم (یقین) حاصل ہوتا ہے اور جب یہ علامات بہت کمزور ہوں تو وہ نتیجہ وہم کی حد سے تجاوز نہیں کرتا، یعنی اس صورت میں ظن، وہم کے معنی میں ہوتا ہے اور جب ظن قوی ہو یا قوی کی طرح متصور ہو تو اس کے بعد أَنَّ یا أَنْ مُخَفَّفَةٌ مِنَ الْمُثَقَّلَةِ استعمال ہوتا ہے اور جب وہ کمزور ہو تو اس کے بعد أَنْ استعمال ہوتا ہے جو معدوم چیزوں کے ساتھ خاص ہے، خواہ قول ہو یا فعل۔[4] (امام راغب رحمہ اللہ نے اس کے بعد مختلف قرآنی آیات بطور مثال پیش کی ہیں)'' اس بحث سے یہ ثابت ہوا کہ ظن کبھی وہم کے معنی میں آتا ہے اور کبھی یقین کے معنی میں اور محدثین نے جو فرمایا ہے کہ احادیث ظنی ہیں تو اس سے بھی یقین مراد ہے، وہم نہیں۔

[1] مفردات القرآن: 1180/2، وتفسير الخازن: 4/3. [2] النسآء 157:4. [3] الجاثية 32:45.

[4] مفردات القرآن: 657/2.

② قرآن کریم میں لفظ ظن کا استعمال

لفظ ظن، قرآن کریم میں مختلف معانی میں اور مختلف صیغوں کے ساتھ 69 مرتبہ مذکور ہے۔ چند معانی اوران کا استعمال درج ذیل ہے:

❁ **ظن بمعنی یقین:** اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَاَنَّهُمْ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ۝ ﴾

"وہ جو یقین رکھتے ہیں کہ وہ اپنے رب سے ملاقات کرنے والے ہیں اور بلاشبہ وہ یقین رکھتے ہیں کہ وہ اس کے حضور لوٹ کر جانے والے ہیں۔"[1]

﴿ اِنِّيْ ظَنَنْتُ اَنِّيْ مُلٰقٍ حِسَابِيَهْ ۝ ﴾

"مجھے یقین تھا کہ میں اپنے حساب سے ملنے والا ہوں۔"[2]

اوراسی طرح وہ ساری آیات جن میں ظن کے مادے کے بعد أَنَّ مشددہ یاأَنْ مخففة من المشددة استعمال ہوا ہے، کیونکہ أَنَّ تاکید کے لیے آتا ہے۔ تو یہ دلیل ہے کہ ظن، یقین کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

❁ **ظن بمعنی گمان:** جب کسی چیز کے متعلق کوئی فیصلہ نہ کیا جاسکتا ہو تو اس کو شک کا مرتبہ کہا جاتا ہے اور جب دل میں ایسی کیفیت پیدا ہوجائے کہ ایک جانب کو ترجیح دے تو اس صورت میں راجح جانب کو ظن اور مرجوح جانب کو وہم کہا جاتا ہے۔ عرف عام میں اسے غالب گمان کہا جاتا ہے، جیسا کہ فرمایا:

﴿ اِنْ ظَنَّآ اَنْ يُّقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ﴾

"اگر وہ دونوں (میاں بیوی) گمان کریں کہ وہ اللہ کی حدود قائم کریں گے۔"[3]

① البقرة 46:2. ② الحآقة 20:69. ③ البقرة 230:2.

یہاں ظن یقین کے معنی میں نہیں کیونکہ انسان اپنے مستقبل کے بارے میں یقینی علم نہیں رکھتا اوراس غالب گمان پر علم کا اطلاق کیا جاتا ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کا کلام نقل کرتے ہوئے فرمایا:

﴿ وَمَا شَهِدْنَآ اِلَّا بِمَا عَلِمْنَا وَمَا كُنَّا لِلْغَيْبِ حٰفِظِيْنَ ○ ﴾

''ہم نے تو اپنے علم کے مطابق گواہی دی تھی اور ہمیں غیب کی کچھ خبر نہیں تھی۔''[1]

یعنی علامات کے ذریعے سے ہمیں علم حاصل ہوا اور علامات کے ذریعے سے حقیقت میں ظن غالب حاصل ہوتا ہے۔ اسی لیے انھوں نے کہا کہ ہم نے اپنے علم (ظن غالب) کے مطابق گواہی دی تھی جبکہ اصل حقیقت سے ہم واقف نہیں تھے۔

❀ ظن بمعنی غیر اختیاری خیال: اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ فَظَنَّ اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَيْهِ ﴾

''پس انھوں (یونس علیہ السلام) نے (غیر اختیاری طور پر) خیال کیا کہ ہم اس پر قادر نہیں۔''[2]

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوْا ﴾

''اور انھوں نے (غیر اختیاری طور پر) خیال کیا کہ ان کی تکذیب کی گئی ہے۔''[3]

ان دونوں آیتوں کا یہ معنی ایک توجیہ کے لحاظ سے ہے جبکہ ان دونوں آیتوں کی اور بھی توجیہات ہیں۔

❀ ظن بمعنی جھوٹ: ظن، جھوٹ بولنے کے معنی میں اس وقت استعمال ہوتا ہے جب وہ حق کے مقابلے میں ہو جیسا کہ قرطبی رحمہ اللہ نے الانباری سے نقل کیا ہے کہ عرب لفظ ظن کو یقین، شک اور جھوٹ کے لیے استعمال کرتے ہیں ظن بمعنی جھوٹ کی مثال اللہ تعالیٰ کا

[1] يوسف 81:12. [2] الأنبياء 87:21. [3] يوسف 110:12.

یہ فرمان ہے:

﴿ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ ۝ ﴾

''اور وہ محض اٹکل پچو باتیں (جھوٹ) بنایا کرتے ہیں۔''[1]

نیز فرمایا:

﴿ وَمَا يَتَّبِعُ اَكْثَرُهُمْ اِلَّا ظَنًّا ۭ اِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْـًٔا ﴾

''اوران میں سے اکثر تو ظن (جھوٹی دلیل) کی پیروی کرتے ہیں جبکہ ظن (جھوٹ) حق سے بے نیاز نہیں کرسکتا۔''[2]

ان آیات میں ظن سے مراد ان کی جھوٹی دلیلیں اور خودساختہ نظریات ہیں۔

❀ ظن بمعنی اجتہاد: اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَظَنَّ دَاوٗدُ اَنَّمَا فَتَنّٰهُ ﴾

''اور داود (علیہ السلام) نے ظن (اجتہاد) کیا کہ ہم نے اسے آزمایا ہے۔''[3]

❀ ظن بمعنی تہمت: اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ ۡ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ ﴾

''اے ایمان والو! بہت زیادہ ظن سے اجتناب کرو کیونکہ بعض ظن گناہ ہیں۔''[4]

مفسر قرآن امام قرطبی رحمہ اللہ نے یہاں ظن سے کسی پر تہمت لگانا مراد لیا ہے۔

③ ظن غالب پر دین کی بنیاد

اکثر دینی مسائل ظن کی بنیاد پر ہیں اس دعویٰ کے اثبات کے لیے ہم چند نقلی اور عقلی دلائل پیش کرتے ہیں۔ قرآن کریم نے بہت سے احکام کی بنیاد گواہی پر رکھی ہے، جیسا کہ

① البقرة 78:2. ② یونس 36:10. ③ صٓ 24:38. ④ الحجرات 12:49.

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَيْهِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ ﴾

”پس ان پر اپنے آدمیوں میں سے چار کو گواہ بنا لو۔“[1]

نیز فرمایا:

﴿ وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ ﴾

”اور اپنے مردوں میں سے دو گواہ بنا لیا کرو۔“[2]

نیز فرمایا:

﴿ وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ ؕ وَمَنْ يَّكْتُمْهَا فَاِنَّهٗۤ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ ﴾

”اور گواہی کو نہ چھپاؤ اور جو گواہی کو چھپاتا ہے تو اس کا دل گناہ گار ہے۔“[3]

نیز فرمایا:

﴿ وَّاَشْهِدُوْا ذَوَيْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ وَاَقِيْمُوا الشَّهَادَةَ لِلّٰهِ ﴾

”اور اپنے میں سے دو عادل شخصوں کو گواہ بنا لو اور اللہ کے لیے ٹھیک گواہی دو۔“[4]

مندرجہ بالا آیات میں اللہ تعالیٰ نے زنا کے اثبات، مالی معاملات اور نکاح و طلاق کے بارے میں گواہ مقرر کرنے اور گواہی لینے کا حکم دیا ہے۔ یہ شہادت ظن کا فائدہ دیتی ہے اور یہ ظنِ غالب ہوتا ہے کہ گواہ نے صحیح گواہی دی ہے لیکن اس ظنِ غالب کو بھی شرعی حکم کی حیثیت حاصل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ فَجَزَآءٌ مِّثْلُ مَا قَتَلَ مِنَ النَّعَمِ يَحْكُمُ بِهٖ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ هَدْيًا بٰلِغَ الْكَعْبَةِ ﴾

”(جو شخص حرم میں جان بوجھ کر شکار کرے) تو اس کی سزا یہ ہے کہ اس نے جس طرح کا جانور شکار میں مارا ہے۔ اس کے معاوضے میں چوپایوں میں سے اس

[1] النسآء 4:15. [2] البقرة 2:282. [3] البقرة 2:283. [4] الطلاق 65:2.

سے ملتا جلتا جانور، جس کے متعلق تم میں سے دو منصف فیصلہ کردیں، بطور قربانی کعبہ تک پہنچایا جائے۔''[1]

یہاں شہادت نہیں بلکہ کسی جانور کے متعلق فیصلہ کرنا ہے کہ یہ جانور اس شکار میں مارے گئے جانور کے مماثل ہے۔ اس کے لیے دو عادل آدمیوں کا فیصلہ کافی ہے۔ یہ بھی ظنی مسئلہ ہے جس میں عادل آدمیوں سے بھی غلطی ہوسکتی ہے لیکن ان کے فیصلے کو تسلیم کرنا پڑے گا۔

رسول اللہ ﷺ کی سنت سے استدلال

[1] رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«إِنَّكُمْ تَخْتَصِمُونَ إِلَيَّ، وَلَعَلَّ بَعْضَكُمْ أَنْ يَكُونَ أَلْحَنَ بِحُجَّتِهِ مِنْ بَعْضٍ فَأَقْضِيَ عَلَى نَحْوِ مَا أَسْمَعُ، فَمَنْ قَضَيْتُ لَهُ بِحَقِّ أَخِيهِ شَيْئًا فَلَا يَأْخُذْهُ، فَإِنَّمَا أَقْطَعُ لَهُ قِطْعَةً مِّنَ النَّارِ»

''تم تنازعات و مقدمات لے کر میرے پاس آتے ہو، ممکن ہے کہ تم میں سے کوئی اپنا موقف پیش کرنے میں زیادہ فصاحت رکھتا ہو اور میں اس کی سنی ہوئی گفتگو کے مطابق فیصلہ کردوں (اور وہ فیصلہ مطابقِ حقیقت نہ ہو) تو میں جس شخص کو اس کے کسی بھائی کا کوئی حق دے دوں تو وہ اسے نہ لے کیونکہ میں تو اس کے لیے صرف آگ کا ایک ٹکڑا کاٹ رہا ہوں۔''[2]

اس حدیث کا حاصل یہ ہے کہ گواہوں کے بیانات میں جھوٹ کا امکان ہوتا ہے

(1) المائدة 5:95. (2) صحيح البخاري، الأحكام، باب موعظة الإمام للخصوم، حديث:7169.

اور اس وجہ سے قاضی کے فیصلے میں غلطی ممکن ہے۔ ان امکانات کے باوجود عدالت کسی شخص کے حق میں غلط فیصلہ بھی دے دیتی ہے اور وہ فیصلہ نافذ بھی ہوجاتا ہے اور یہ سارا عمل شرعی قضا کی اطاعت کا مسئلہ ہے۔ یہ عین دین ہے اور یہ ظن پر مبنی ہے۔ پرویزی بھی یہ حدیث مانتے ہیں کیونکہ وہ بھی عدالتوں اور ججوں کے فیصلوں کو اسی بنیاد پر مانتے ہیں اگرچہ وہ بھی ظنیات ہیں۔

2 قبلہ کے متعلق شرعی حکم یہ ہے کہ جب کسی شخص پر قبلہ رخ کا تعین کرنا مشتبہ ہوجائے اور اس کی راہنمائی کرنے والا بھی کوئی نہ ہوتو پھر اسے اختیار حاصل ہے کہ وہ ظن غالب کی بنا پر کسی طرف قبلے کا تعین کرلے اور اس طرف رخ کرکے نماز پڑھ لے۔ اگر بعد میں اسے پتا چلے کہ اس نے قبلے کے علاوہ کسی اور سمت رخ کرکے نماز پڑھ لی ہے تو اب اس پر لازم نہیں کہ وہ نماز دہرائے، حالانکہ یہ حکم اور یہ عمل بھی ظن کی بنیاد پر ہوا تھا۔[1]

نمازی کو دوران نماز شک واقع ہوجائے کہ آیا اس نے دو رکعتیں پڑھی ہیں یا تین تو پھر وہ ظن غالب کی بنیاد پر رکعتوں کا تعین کرے اور پھر اسی تعین کی بنا پر نماز مکمل کرے اور آخر پر سجدہ سہو کرلے۔ یہ بھی ظن کا مسئلہ ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ ان تمام معاملات یا عبادات میں اطاعت الٰہی اور اخلاص نیت مقصود ہے۔ اگر اس میں اجتہاد یا نسیان کی وجہ سے کوئی غلطی بھی ہوجائے تو اس سے دین میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس تمام بحث کا حاصل یہ ہے کہ احادیث اگر ظنی ہیں اور محدثین نے اس پر ظن کا اطلاق کیا ہے تو اس ظن سے مراد یقینی علم یا ظن غالب ہے اور اس درجے میں ظن دین کی بنیاد بنتا ہے۔ اسماء الرجال میں اصحاب نقد و جرح سے غلطی یا بشری کمزوری کا احتمال ہوسکتا ہے لیکن ان امکانات کے باوجود ان احادیث کی دین میں حجیت

① جامع الترمذي، الصلاة، باب ماجاء في الرجل يصلي لغير القبلة……، حديث: 345.

پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

گیارھواں شبہ: منافقین کی عدم معرفت

اگر چہ احادیث صحابۂ کرام سے مروی ہیں لیکن اس وقت مدینہ اور گردونواح میں منافق لوگ بھی تھے اور کسی کو معلوم بھی نہیں تھا کہ فلاں شخص مخلص ہے یا منافق تو اس بنا پر احادیث کی دینی حجیت مشکوک بن جاتی ہے۔

جواب: قرآن کریم کی بہت سی سورتوں میں مومنوں اور منافقوں کی صفات کا ذکر ہے جن کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ مومن کون ہیں اور منافق کون ہیں۔

مومن کی صفات

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ○ وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ○ ﴾

''جو غیب پر ایمان لاتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں اور ہم نے جو کچھ انھیں دے رکھا ہے۔ وہ اس میں سے خرچ کرتے ہیں اور وہ آپ پر نازل کی گئی کتاب پر ایمان رکھتے ہیں اور جو آپ سے پہلے کتابیں نازل کی گئیں ان پر بھی ایمان لاتے ہیں اور وہ آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔''[1]

نیز فرمایا:

﴿ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَاٰتَى

[1] البقرة 2:3،4.

الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۙ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ۝

''لیکن نیکی تو یہ ہے کہ کوئی شخص اللہ پر، روز آخرت پر، فرشتوں پر، کتابوں پر اور نبیوں پر ایمان لائے اور اللہ کی محبت میں قریبی رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں، سوال کرنے والوں اور غلاموں کے آزاد کرانے کے لیے مال دے اور نماز کی پابندی کرتا رہے اور زکاۃ دیتا رہے اور ایسے لوگ عہد کرکے اسے پورا کرنے والے ہیں، تنگ دستی، تکلیف اور جنگ کے وقت ثابت قدم رہنے والے ہیں، یہی لوگ حق وصداقت پر ہیں اور یہی لوگ متقی ہیں۔''[1]

نیز فرمایا:

اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ الْحٰمِدُوْنَ السَّآئِحُوْنَ الرّٰكِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَالْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ ؕ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝

''توبہ کرنے والے، عبادت کرنے والے، حمد وثنا کرنے والے، روزہ رکھنے والے، رکوع کرنے والے، سجدہ کرنے والے، نیکی کا حکم کرنے والے، برائی سے روکنے والے، اللہ کی حدود کی حفاظت کرنے والے ہیں اور (ایسے) مومنوں کو خوش خبری سنا دیجیے۔''[2]

نیز فرمایا:

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ۙ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ۝ۙ وَالَّذِيْنَ هُمْ

[1] البقرة 2:177. [2] التوبة 9:112.

عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۙ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ۚ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ۚ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ﴾

''بلاشبہ مومنوں نے فلاح پائی، جو اپنی نماز میں خشوع اختیار کرتے ہیں، وہ بے ہودہ باتوں سے کنارہ کش رہتے ہیں، جو زکاۃ ادا کرنے والے ہیں، جو اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں، مگر اپنی بیویوں یا اپنی لونڈیوں سے نہیں کیونکہ (ان سے مباشرت کرنے میں) ان پر کوئی ملامت نہیں، پس جو شخص اس کے علاوہ (برائی کا) خواہاں ہو تو ایسے لوگ حد سے نکل جانے والے ہیں اور وہ جو اپنی امانتوں اور معاہدوں کو ملحوظ رکھتے ہیں اور وہ جو اپنی نمازوں کی پابندی و حفاظت کرتے ہیں۔''[1]

نیز فرمایا:

﴿ وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا ﴾

''اور رحمٰن کے بندے تو وہ ہیں جو آہستگی کے ساتھ زمین پر چلتے ہیں اور جب جاہل لوگ ان سے مخاطب ہوتے ہیں تو وہ سلام کہہ دیتے ہیں۔''[2]

نیز فرمایا:

﴿ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ۭ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا ۡ سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ﴾

[1] المؤمنون 23:1-9. [2] الفرقان 25:63.

''محمد (ﷺ) اللہ کا رسول ہے اور جو لوگ اس کے ساتھ ہیں وہ کافروں پر سخت اور آپس میں نہایت رحم دل ہیں، تو انھیں اس حال میں دیکھے گا کہ رکوع کرنے والے ہیں، سجدہ کرنے والے ہیں اپنے رب کا فضل اور (اس کی) رضا ڈھونڈتے ہیں، ان کی شناخت ان کے چہروں میں موجود ہے، سجدے کرنے کے اثر سے۔''[1]

نیز فرمایا:

﴿ اِلَّا الْمُصَلِّیْنَ ۝ الَّذِیْنَ هُمْ عَلٰی صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ ۝ ﴾

''مگر نماز پڑھنے والے جو اپنی نمازوں پر ہمیشگی کرنے والے ہیں۔''[2]

ان آیات کریمہ کا پہلا مصداق صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم تھے۔ ان آیات کے علاوہ اور بھی بہت سی آیات ہیں جن میں مومنوں کی صفات بیان کی گئی ہیں، ان آیات پر غور وفکر کرنے سے مخلص مومن اور کامل مسلمان کا پتا چل جاتا ہے اور ان صفات کو پہچان کر انسان فیصلہ کرسکتا ہے کہ فلاں شخص مومن ہے۔

منافق کی صفات

قرآن کریم نے منافقوں کی علامتیں بھی بیان کی ہیں جن کے مطالعے سے منافقوں کا پتا چل جاتا ہے اور ان علامتوں کی وجہ سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ فلاں شخص منافق ہے۔

① البقرۃ: (2:8-16)

② آل عمران: (3:118-120 و 153 و 168)

③ النسآء: (4:7 و 60-66 و 77,78 و 82-91 و 107-114 و 137-143)

④ التوبۃ: (9:38 و 101 و 107 و 125,126)

---

[1] الفتح 48:29. [2] المعارج 70:22,23.

5 اسی طرح سورۂ نور، أحزاب، محمد، فتح، مجادلہ، حشر، منافقون اور ماعون میں بھی منافقوں کی علامتیں بیان کی گئی ہیں۔ یہ تقریباً 203 آیاتِ کریمہ ہیں، ان آیات پر غور کرنے سے منافق شخص کا پتا چل سکتا ہے۔

قرآن کریم نے مومنوں کی جو صفات بیان کی ہیں وہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم میں موجود تھیں اور منافقین کی جو صفات بیان کی گئی ہیں وہ اس وقت کے منافقوں میں موجود تھیں۔ ان صفات کی روشنی میں ایک عام شخص بھی مومن اور منافق میں فرق کرسکتا ہے۔ اب صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین جو فہم وفراست کے اعلیٰ درجے پر فائز تھے، وہ تو مومن اور منافق میں واضح فرق سمجھتے تھے۔ انھوں نے مومنوں سے روایات لی ہیں اور جہاں تک منافقوں کا تعلق ہے، انھوں نے ان سے دنیوی معاملات کرنے سے بھی اجتناب کیا ہے، لہٰذا یہ کیسے ممکن ہوسکتا ہے کہ وہ دنیوی معاملات میں تو ان سے اجتناب کریں اور دین کے معاملے میں ان سے روایات نقل کریں۔

اللہ تعالیٰ نے زمانۂ نبوت میں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو مختلف مصائب اور پریشانیوں کے ذریعے سے آزمایا جس کی وجہ سے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اور منافقین کے درمیان فرق واضح ہوگیا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلٰى مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتّٰى يَمِيْزَ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ ﴾

''اللہ مومنوں کو اس حالت میں ہرگز نہ رہنے دے گا جس میں تم اس وقت ہو، یہاں تک کہ وہ پاک کو ناپاک سے علیحدہ کردے۔''[1]

اللہ تعالیٰ نے اس آیتِ کریمہ میں ان لوگوں کے سوال کا جواب دیا ہے جو اعتراض کیا

[1] آل عمرٰن 179:3.

کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے غزوۂ احد میں مومنوں کو اس پریشانی سے کیوں دوچار کیا کہ 70 صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم شہید کر دیے گئے اور بہت سے زخمی ہوئے حتی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دندان مبارک بھی شہید کر دیے گئے۔ اس سارے واقعے میں اللہ تعالیٰ کی یہی حکمت تھی کہ وہ مومنوں اور منافقوں کے درمیان فرق ظاہر کر دے۔ جب اللہ تعالیٰ نے اس آزمائش کے ذریعے سے مومنوں اور منافقوں کے درمیان فرق کر دیا تو پھر کیسے ممکن ہے کہ کوئی صحابی یا کوئی تابعی منافق شخص سے روایت کرے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَمَآ اَصَابَكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ فَبِاِذْنِ اللّٰهِ وَلِيَعْلَمَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ وَلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ نَافَقُوْا ﴾

”اور احد کے دن جب دونوں لشکر باہم ٹکرائے تو تمھیں جو (نقصان) پہنچا وہ اللہ کے حکم سے تھا اور اس لیے تھا کہ اللہ جان لے کہ مومن کون ہیں اور یہ بھی جان لے کہ منافق کون ہیں۔“[1]

علاوہ ازیں یہ بات ثابت کی گئی ہے کہ احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وحی ہیں اور وحی کی حفاظت کا ذمہ اللہ تعالیٰ نے خود لیا ہے ﴿ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۝ ﴾ لہٰذا دین (حدیث) محفوظ طریقے سے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے ذریعے سے ہم تک پہنچا ہے۔

سوال سورۂ انفال اور سورۂ توبہ کی درج ذیل آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابۂ کرام بلکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی منافقوں کو نہیں جانتے تھے، چنانچہ اللہ نے فرمایا:

”تم انھیں نہیں جانتے، اللہ انھیں جانتا ہے۔“[2]

نیز فرمایا:

”نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ ان (منافقوں) کو نہیں جانتے، ہم انھیں جانتے ہیں۔“[3]

[1] آل عمرٰن 167,166:3. [2] الأنفال 60:8. [3] التوبة 101:9.

جواب اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ کے لیے منافقین کے متعلق ایسے علم کا اثبات فرمایا ہے جس کا تعلق علامتوں کے ساتھ ہے، جیسے ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَلَتَعْرِفَنَّهُمْ فِي لَحْنِ الْقَوْلِ ﴾

''آپ ان کے طرزِ کلام سے انھیں پہچان لیں گے۔''[1]

پس منافقوں کی جو علامتیں بیان کی گئی ہیں ان کے ذریعے سے نبی ﷺ بھی انھیں پہچان سکتے ہیں اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم بھی، جبکہ سورۂ انفال اور سورۂ توبہ میں جس علم کی نفی کی گئی ہے وہ علم یقینی اور علم تفصیلی ہے۔ جبکہ سورۂ محمد کی آیت میں جو اثبات کا ذکر ہے وہ علامتوں کے ذریعے سے حاصل ہونے والا علم اجمالی ہے، لہٰذا ان دونوں قسم کی آیات میں کوئی تعارض نہیں۔

بارھواں شبہ: احادیث کا اخبار آحاد ہونا

پرویزیوں کے نزدیک تمام احادیث اخبار آحاد ہیں۔ وہ انھیں متواتر اور مشہور نہیں مانتے وہ کہتے ہیں کہ اخبار آحاد پر یقین نہیں ہوتا، لہٰذا وہ کیسے حجت بن گئیں؟

جواب: یہ شبہ بھی سابقہ شبہے کی طرح ہے، صرف تعبیر میں فرق ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن کریم میں بہت سے ایسے واقعات ہیں جو خبر واحد سے ثابت ہوئے ہیں۔

قرآن سے خبر واحد کی حجیت کا ثبوت

ارشاد الٰہی ہے:

﴿ لَقَدْ أَرْسَلْنَا نُوحًا إِلَىٰ قَوْمِهِ فَقَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ ﴾

[1] محمد 30:47.

''بے شک ہم نے نوح (علیہ السلام) کو اس کی قوم کی طرف بھیجا، تو انھوں نے کہا: اے میری قوم! اللہ کی عبادت کرو، اس کے سوا تمھارا کوئی معبود نہیں۔''[1]

نیز فرمایا:

﴿ وَاِلٰی عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا ؕ قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ ﴾

''اور قوم عاد کی طرف ان کے بھائی ہود (علیہ السلام) کو بھیجا، انھوں نے کہا: اے میری قوم! اللہ کی عبادت کرو، اس کے سوا تمھارا کوئی معبود نہیں۔''[2]

نیز فرمایا:

﴿ وَاِلٰی ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا ۘ قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ ﴾

''اور ثمود کی طرف ان کے بھائی صالح (علیہ السلام) کو بھیجا، انھوں نے کہا: اے میری قوم! اللہ کی عبادت کرو، اس کے سوا تمھارا کوئی معبود نہیں۔''[3]

نیز فرمایا:

﴿ وَلُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖۤ ﴾

''اور جب لوط (علیہ السلام) نے اپنی قوم سے کہا۔''[4]

نیز فرمایا:

﴿ وَاِلٰی مَدْیَنَ اَخَاهُمْ شُعَیْبًا ؕ قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ ﴾

''اور مدین والوں کی طرف ان کے بھائی شعیب (علیہ السلام) کو بھیجا، انھوں نے کہا: اے میری قوم! اللہ کی عبادت کرو، اس کے سوا تمھارا کوئی معبود نہیں۔''[5]

[1] الأعراف 59:7. [2] الأعراف 65:7. [3] الأعراف 73:7. [4] الأعراف 80:7. [5] الأعراف 85:7.

مذکورہ بالا آیات سے ثابت ہوا کہ ان انبیاء علیہم السلام نے اکیلے ہی اپنی اپنی قوم کو توحید کی دعوت پیش کی اور جب قوم نے انھیں جھٹلایا تو اللہ تعالیٰ نے ان پر عذاب نازل فرمایا۔ یہ آیات خبرِ واحد کی حجیت کے لیے یقینی ثبوت ہیں۔ اس سے ثابت ہوا کہ خبر واحد کو جھٹلانا عذاب الٰہی کا سبب بنتا ہے۔ یہاں کوئی یہ اعتراض نہیں کرسکتا کہ یہ خبرِ واحد نبی کی نبوت اور رسول کی رسالت کی وجہ سے حجت ہے، اصولی طور پر حجت نہیں کیونکہ قرآن کریم میں ایسے نہیں فرمایا کہ اس نبی اور رسول کی خبر نبوت یا رسالت کی وجہ سے مان لو بلکہ انبیاء کو ناصح اور امین کہا گیا ہے، یعنی خبرِ واحد دینے والا امانت دار اور مخلص ہے، لہٰذا اس کی خبر قابل قبول اور حجت ہے۔

قرآن کریم میں نبی کے علاوہ عام شخص کی خبر واحد کا بھی تذکرہ کیا ہے اور اسے قوم کے لیے حجت قرار دیا ہے۔

1 جیسا کہ فرمایا:

﴿وَجَآءَ مِنْ اَقْصَا الْمَدِيْنَةِ رَجُلٌ يَّسْعٰى قَالَ يٰقَوْمِ اتَّبِعُوا الْمُرْسَلِيْنَ ۝﴾

”اور شہر کے دور کے مقام سے ایک آدمی دوڑتا ہوا آیا، اس نے کہا: اے میری قوم! ان رسولوں کی بات مانو۔“[1]

پس جب قوم نے اس شخص کی بات نہ مانی اور اسے قتل کردیا تو اللہ تعالیٰ نے ان پر عذاب نازل فرمایا:

﴿اِنْ كَانَتْ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً فَاِذَا هُمْ خٰمِدُوْنَ ۝﴾

”وہ عذاب تو بس ایک سخت آواز تھی کہ وہ بجھ کر رہ گئے۔“[2]

2 اور فرمایا:

[1] یٰسٓ 20:36. [2] یٰسٓ 29:36.

﴿ وَجَآءَ رَجُلٌ مِّنْ اَقْصَا الْمَدِيْنَةِ يَسْعٰى ۫ قَالَ يٰمُوْسٰٓى اِنَّ الْمَلَاَ يَاْتَمِرُوْنَ بِكَ لِيَقْتُلُوْكَ فَاخْرُجْ اِنِّىْ لَكَ مِنَ النّٰصِحِيْنَ ○ فَخَرَجَ مِنْهَا خَآئِفًا يَّتَرَقَّبُ ﴾

''اور شہر کی دوسری جانب سے ایک شخص دوڑتا ہوا آیا، اس نے کہا: اے موسیٰ! سردارانِ قوم تمھارے متعلق مشورہ کر رہے ہیں کہ تمھیں ہلاک کر ڈالیں، لہٰذا تم یہاں سے نکل جاؤ! بے شک میں تیرے خیر خواہوں میں سے ہوں، چنانچہ وہ (موسیٰ علیہ السلام) وہاں سے ڈرتے ہوئے انتظار کرتے ہوئے نکل کھڑے ہوئے۔''[1]

یہاں بھی صرف ایک شخص نے موسیٰ علیہ السلام کو خبر دی تو انھوں نے اس کی بات کو سچا سمجھ کر اس پر عمل کیا اور وہاں سے نکل کھڑے ہوئے، اس طرح وہ ظالم قوم سے بچ گئے۔

3 اور فرمایا:

﴿ اِنَّ اَبِىْ يَدْعُوْكَ لِيَجْزِيَكَ اَجْرَ مَا سَقَيْتَ لَنَا ﴾

''میرے والد تمھیں بلاتے ہیں کہ تم نے جو ہمارے لیے پانی پلایا تھا اس کا معاوضہ ادا کریں۔''[2]

موسیٰ علیہ السلام اس لڑکی کی بات سن کر اس کے والد کے پاس گئے۔ اس میں یہ اشارہ ہے کہ مرد تو درکنار عورت کی خبر واحد بھی قبول ومنظور ہے۔

4 اسی طرح فرمایا:

﴿ وَقَالَ الَّذِىْٓ اٰمَنَ يٰقَوْمِ اتَّبِعُوْنِ اَهْدِكُمْ سَبِيْلَ الرَّشَادِ ○ ﴾

''اور اس مومن شخص نے کہا: اے میری قوم! میرے نقش قدم پر چلو! میں تمھیں ہدایت کی راہ بتلاتا ہوں۔''[3]

اس آیت میں اس شخص کا ذکر ہے جو موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آیا تو اس نے قوم کو بہت

[1] القصص 21,20:28. [2] القصص 25:28. [3] المؤمن 38:40.

حکیمانہ انداز میں دعوت دی۔ اس دعوت کی تفصیل سورۂ مومن کی آیت: 38 تا45 میں موجود ہے۔ اور آخر میں اس نے فرمایا:

﴿فَسَتَذْكُرُونَ مَآ أَقُولُ لَكُمْ﴾

''تم عنقریب میری بات کو یاد کرو گے۔''[1]

اس میں اس عذاب کی طرف اشارہ ہے جو حق جھٹلانے کی پاداش میں ملتا ہے، پھر اللہ تعالیٰ نے اس شخص اور قوم کے انجام کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

﴿فَوَقٰىهُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِ مَا مَكَرُوْا وَحَاقَ بِاٰلِ فِرْعَوْنَ سُوْٓءُ الْعَذَابِ ۝﴾

''پس اللہ نے اس کو ان کی تدبیر کی مضرتوں سے بچا لیا اور آلِ فرعون کو بہت بڑے عذاب نے آ گھیرا۔''[2]

اس سے پتا چلا کہ اللہ تعالیٰ نے اس شخص کو بچا لیا اور قوم نے اس کی بات نہ مانی تو وہ عذاب کا شکار ہوگئی۔

5 اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَآفَّةً ۭ فَلَوْ لَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآىِٕفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْٓا اِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ ۝﴾

''اور ممکن نہیں کہ ایمان والے سب کے سب نکل جائیں، سو ان کے ہر گروہ میں سے کچھ لوگ کیوں نہ نکلے تاکہ وہ دین میں سمجھ حاصل کریں اور تاکہ جب اپنی قوم کی طرف واپس جائیں تو انھیں ڈرائیں تاکہ وہ بچ جائیں۔''[3]

مفسرین نے (طائفہ) کا لغوی معنی کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ایک شخص کو بھی طائفہ کہا جا سکتا ہے، یعنی ایک شخص علم حاصل کرے اور پھر وہ علم اپنی قوم کو پہنچائے اور قوم اس شخص

[1] المؤمن 44:40. [2] المؤمن 45:40. [3] التوبة 122:9.

کی بات مان کر بے دینی سے بچ جائے۔ اس سے واضح ہوا کہ ایک عادل عالم کی بات حجت ہے۔

6 اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَإٍ فَتَبَيَّنُوا﴾

''اے ایمان والو! اگر کوئی فاسق شخص تمھارے پاس کوئی خبر لے کر آئے تو پہلے تحقیق کر لیا کرو۔''[1]

اس آیت میں لفظ فاسق کا مفہوم مخالف یہ ہے کہ اگر ایک عادل شخص کوئی خبر لائے تو تحقیق کے بغیر اسے مان لیا کرو اور مفہوم موافق یہ ہے کہ فاسق کی خبر بھی تحقیق کرنے کے بعد قابلِ اعتبار ہے۔ دونوں مفہوم خبر واحد کے حجت ہونے پر دلالت کر رہے ہیں۔

احادیث سے خبر واحد کی حجیت کا ثبوت

1 تحویل قبلہ کا حکم نازل ہونے سے پہلے لوگ مسجد قباء میں بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز فجر ادا کر رہے تھے۔ اتنے میں ایک صحابی نے آ کر انھیں تحویلِ قبلہ کی خبر دی تو انھوں نے دورانِ نماز میں ہی اپنا رخ بیت اللہ کی طرف کر لیا۔[2]

یہ بھی ایک آدمی ہی کی خبر تھی جس پر اہل قباء نے عمل کیا اور نبی ﷺ نے ان پر کوئی تنقید نہیں فرمائی، لہٰذا خبر واحد حجت ہے۔

2 انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں شراب کی حرمت سے پہلے ابوعبیدہ، ابوطلحہ اور ابی بن کعب رضی اللہ عنہم کو شراب پلا رہا تھا کہ اتنے میں ایک شخص نے خبر دی کہ شراب حرام ہو گئی ہے۔ یہ سن کر ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: انس! اٹھو اور شراب کو انڈیل دو، چنانچہ میں نے اسے

[1] الحجرات 6:49. [2] صحیح البخاري، الصلاة، باب ماجاء في القبلة ومن لم ......، حديث:403.

انڈیل دیا۔[1]

3 نبی ﷺ نے حج کے موقع پر میدان عرفات میں مربع انصاری رضی اللہ عنہ کو حکم دیا تو انھوں نے لوگوں کو کہا کہ میں رسول اللہ ﷺ کا ایلچی ہوں۔ آپ کا فرمان ہے کہ میدان عرفات سارا موقف (ٹھہرنے کی جگہ) ہے۔ ہر شخص اپنی اپنی جگہ وقوف کرے۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے اس ایک شخص کے اعلان کو حجت تسلیم کیا۔[2]

ہم انھی واقعات پر اکتفا کرتے ہیں ورنہ احادیث میں بے شمار واقعات مذکور ہیں جن میں خبر واحد پر اکتفا کیا گیا ہے اور اس پر احکام شرعیہ مرتب کیے گئے ہیں۔

عہد صحابہ میں خبر واحد کی حجیت

عہد صحابہ میں بہت سے واقعات پیش آئے جن میں ایک صحابی کی خبر پر تمام صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے اتفاق کیا، اس لیے کہ ان کے نزدیک خبر واحد حجت تھی۔ کچھ واقعات بطور مثال پیش کیے جاتے ہیں۔

1 نبی ﷺ کی تدفین کے وقت مسئلہ پیدا ہوا کہ آپ کو کہاں دفن کیا جائے تو ابوبکر رضی اللہ عنہ نے انھیں ایک حدیث سنائی:

«مَاقَبَضَ اللّٰهُ نَبِيًّا إِلَّا فِي الْمَوْضِعِ الَّذِي يُحِبُّ أَنْ يُّدْفَنَ فِيهِ»

''اللہ تعالیٰ نبی کی روح اس جگہ قبض کرتے ہیں جہاں پر اس کا دفن ہونا پسند کرتے ہیں۔''

تمام صحابۂ کرام نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خبر واحد کو قبول کیا اور نبی ﷺ کو ام المؤمنین

[1] صحيح البخاري، الأشربة، باب نزل تحريم الخمر وهي ......، حديث: 5582. [2] سنن أبي داود، المناسك، باب موضع الوقوف بعرفة، حديث: 1919، وجامع الترمذي، الحج، باب ماجاء في الوقوف بعرفات......، حديث: 883.

عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرے میں دفن کیا کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہیں وفات پائی تھی۔[1]

2 نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت خلافت کے متعلق اختلاف واقع ہوا تو ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما دونوں سقیفۂ بنی ساعدہ تشریف لے گئے جہاں انصار جمع تھے۔ بحث سننے کے بعد ابوبکر رضی اللہ عنہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث سنائی کہ

«اَلْأَئِمَّةُ مِنْ قُرَيْشٍ»

''امام (خلیفہ) قریش کے خاندان سے ہوگا۔''[2]

چنانچہ اس حدیث پر تمام صحابہ مہاجرین اورانصار نے اتفاق کر کے ابوبکر رضی اللہ عنہ کو خلیفہ مقرر کردیا۔

3 نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد سیدنا عباس اور فاطمہ رضی اللہ عنہما وراثت کا مطالبہ کرنے ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس آئے تو انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث سنائی:

«لَا نُورَثُ مَا تَرَكْنَاهُ صَدَقَةٌ»

''ہم وارث نہیں بناتے بلکہ ہم جو ترکہ چھوڑیں وہ صدقہ ہے۔''[3]

ان واقعات سے ثابت ہوا کہ صحابۂ کرام خبر واحد کو حجت مانتے تھے۔ان روایات میں خبر واحد اس لیے حجت نہیں کہ وہ ایک صحابی نے روایت کی ہے بلکہ اس کی وجہ ایک عادل متقی شخص کی روایت ہے،خواہ وہ صحابی ہو یا کوئی اور۔

عہد تابعین میں عموماً ہر شہر میں ایک محدث ہوتا تھا جو فتویٰ دیا کرتا تھا۔لوگ اس کی علمی دیانت کی وجہ سے اس کے فتوے کو تسلیم کرتے تھے۔

[1] جامع الترمذي، الجنائز، باب أين تدفن الأنبياء، حديث: 1018، وسنن ابن ماجه، الجنائز، باب ذكر وفاته ودفنه، حديث: 1628. [2] فتح الباري شرح صحيح البخاري: 7/30-32، تحت حديث: 3668. [3] صحيح البخاري، المغازي، باب غزوة خيبر، حديث: 4241، وصحيح مسلم، الجهاد، باب قول النبي ﷺ: لانورث......، حديث: 1758.

حاصل بحث یہ ہے کہ قرآن و حدیث اور عمل سلف سے یہ واضح ہوتا ہے کہ خبر واحد دین میں حجت ہے۔

بعض صحابہ نے حدیث کے لیے شہادت کا مطالبہ کیا ہے، مثلاً: ابوبکر رضی اللہ عنہ نے میراث کے متعلق مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کی روایت کے ساتھ شہادت طلب کی تو محمد بن سلمہ رضی اللہ عنہ نے تائید کی۔[1]

اسی طرح عمر رضی اللہ عنہ نے اجازت لینے کے متعلق ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کی روایت کے متعلق شہادت طلب کی تو ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے ان کی تائید کی۔[2]

تو ایسے واقعات میں شہادت طلب کرنے کا یہ مطلب نہیں کہ وہ خبر واحد نہیں مانتے تھے بلکہ انھوں نے زیادہ تائید و تاکید کے لیے ایسے کیا اور یہ ایک احتیاطی پہلو ہے۔

تیرھواں شبہ: کثرت احادیث

کثرت احادیث کے متعلق منکرین حدیث اپنے زعم میں یہ اعتراض نہایت شدومد کے ساتھ کرتے ہیں کہ محدثین نے احادیث کا اتنا بڑا ذخیرہ کہاں سے حاصل کیا، پھر کہتے ہیں کہ محدثین نے اس ذخیرہ احادیث کا 95 فی صد موضوع قرار دے کر رد کر دیا اور باقی پانچ فی صد میں اتنا اختلاط ہے کہ اس کا الگ الگ کرنا کسی انسان کے بس کا کام نہیں۔

جواب: ان لوگوں کا پہلا تعجب کثرت احادیث پر ہے جسے وہ انکارِ حدیث کا سبب بنا رہے ہیں۔ اس کے بعد انھوں نے خود ساختہ دعویٰ کیا ہے کہ ان میں سے 95 فی صد موضوع روایات ہیں۔ پہلی بات کا جواب یہاں عرض کیا جاتا ہے جبکہ دوسری بات کا

[1] سنن أبي داود، الفرائض، باب في الجدّة، حديث:2894، وجامع الترمذي، الفرائض، باب ماجاء في ميراث الجدة، حديث:2100. [2] صحيح البخاري، البيوع، باب الخروج في التجارة......، حديث:2062.

جواب ان شاء اللہ چودھویں شبہ کے جواب میں دیا جائے گا۔

کثرتِ احادیث عقل کے لحاظ سے کوئی تعجب کی بات نہیں، علامہ فضل احمد غزنوی نے لکھا ہے کہ ماہرینِ لسانیات تسلیم کرتے ہیں کہ ایک شخص روزانہ اوسطاً 36 ہزار کلمات بولتا ہے۔[1] پرویزی اور دیگر منکرین حدیث سائنس دانوں کی بات کو قرآن و حدیث سے بھی زیادہ قوی سمجھتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنی نبوت کی 23 سالہ زندگی کے شب و روز دعوت و تبلیغ میں صرف کیے تو آپ ﷺ کے 36 ہزار روزانہ کلمات کے حساب سے 23 سال کے کلمات کا اندازہ لگائیں تو یہ 29 کروڑ، 80 لاکھ اور 80 ہزار کلمات بنتے ہیں۔

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے آپ ﷺ کے اقوال و احوال کو حفظ کیا اور کتابت و روایت کے ذریعے سے انھیں محفوظ رکھا تو اس میں کون سی حیرت کی بات ہے۔ منکرینِ حدیث نے اپنی تحریک کے تھوڑے سے عرصے میں کتنی کتابیں اور رسالے شائع کیے ہیں۔ اور پرویز صاحب کے مقلدین ان کے اقوال و نظریات کو کس طرح یاد کرتے اور انھیں نقل کرتے ہیں۔ کیا خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے الصادق المصدوق نبی ﷺ کے ارشادات مبارکہ کی کوئی حفاظت نہیں کی؟ لہٰذا کثرتِ احادیث سے انکار کرنا بے دینی کے علاوہ بے عقلی کی بھی انتہا ہے۔

کثرتِ احادیث کے اسباب

1. کثرتِ احادیث کے اسباب میں سے بنیادی سبب ایک ہی متن کے لیے کئی سندوں کا ہونا ہے۔ متن حدیث ایک ہوتا ہے لیکن مختلف راویوں کے بیان کرنے اور سندوں کی کثرت سے وہ ایک ہی حدیث محدثین کی اصطلاح میں کئی حدیثیں شمار ہوتی ہیں

[1] صحیح مقام حدیث۔

علاوہ ازیں محدثین کے نزدیک حدیث کا مفہوم عام ہے۔ وہ رسول اللہ ﷺ کی مرفوع احادیث اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے موقوف آثار کو بھی حدیث کہتے ہیں بلکہ بعض تو تابعین کی مقطوع روایات کو بھی حدیث کہتے ہیں، اس طرح احادیث کی کثرت کی انتہا نہیں ہو سکتی۔ خاص طور پر بعض مسانید اور مصنفات، جیسے مصنف ابن ابی شیبہ اور مصنف عبدالرزاق وغیرہ میں تو مرفوع، موقوف اور مقطوع سب روایات جمع کی گئی ہیں۔

2 جب صحابۂ کرام نبی ﷺ کی مرفوع روایات کو عمل میں لائے اور وہ ان روایات کی کیفیات و تفصیلات لکھنے لگے تو ان تھوڑے تھوڑے ارشادات سے بڑے بڑے دفاتر بن گئے۔ یہ احادیث موقوف عملی ہیں۔

3 محدثین نے موضوع احادیث کی اسناد اور طرق یاد رکھے اور انھیں اپنی کتابوں میں جمع کیا تاکہ لوگوں کو بتایا جائے کہ یہ احادیث موضوع ہیں اور وہ ان پر عمل کرنے سے اجتناب کریں تو ایسی روایات بھی جمع کرنے سے احادیث کی کثرت ہوگئی۔ اگرچہ وہ موضوع روایات فی نفسہٖ احادیث نہیں۔

چودھواں شبہ: موضوع احادیث کی عدم معرفت

منکرینِ حدیث کا ایک بڑا اعتراض یہ ہے کہ موضوع روایات اقوالِ رسول ﷺ کے ساتھ یوں خلط ملط ہو چکی تھیں کہ حق کو باطل سے الگ کرنا ناممکنات میں سے تھا۔ حافظ اسلم نے یہ بھی اضافہ کیا ہے کہ وضاعین اشخاص نے ناقدینِ حدیث اور ماہرینِ اسماء الرجال کی گرفت سے بچنے کے لیے ایسا بھی کیا کہ سند میں مشہور ثقہ راویوں کے نام درج کر دیے تھے۔ اس طریقہ سے وہ وضعی روایات بھی قبولیت کا درجہ حاصل کر لیتی تھیں۔[1]

1 مقام حدیث، ص: 155.

جواب: اس میں تین مباحث ہیں:

① وضع حدیث کی حکمت

② وضع حدیث کی ابتدااوراس کے اسباب

③ موضوع روایات کی چھان بین میں علمائے امت کی محنت

① وضعِ حدیث کی حکمت

وضعِ حدیث کی ایک بڑی حکمت یہ ہے کہ یہ حجیتِ حدیث کے لیے بہت بڑی دلیل ہے کیونکہ حدیث حجت نہ ہوتی تو حدیث گھڑنے والا شخص کس مقصد کے لیے حدیث وضع کرتا۔ اس کی مثال یہ ہے کہ ملک میں رائج الوقت کرنسی کی اہمیت ہوتی ہے تو جعلی کرنسی بنانے والا اس کے مقابلے میں اپنی جعلی کرنسی لاتا ہے۔ رائج الوقت کرنسی کی ضرورت و اہمیت نہ ہوتو پھر جعلی کرنسی بنانے والا یہ زحمت کیوں اٹھائے۔ معلوم ہوا کہ جب سے وضعِ حدیث کا کام شروع ہوا، اس وقت سے پہلے ہی مسلمانوں کے نزدیک حدیث حجت چلی آرہی ہے۔ آج بھی بعض نادان قسم کے لوگ جھوٹ کے طور پر کسی قول یا فعل کو رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اس شخص کے نزدیک حدیث حجت ہے۔

اس میں دوسری حکمت یہ ہے کہ جب وضعِ حدیث شروع ہوئی اسی وقت تنقیدِ حدیث کی جدوجہد شروع ہوئی اور جیسے وضعِ حدیث میں تیزی آتی گئی ویسے ہی نقدِ حدیث میں شدت پیدا ہوگئی۔ علم اسماء الرجال اور راویوں کے متعلق جرح و تعدیل کی بحثیں شروع ہوئیں اور موضوع احادیث کو الگ کیا گیا اور جنھوں نے یہ محنت کی ان کے لیے یہ محنت اجرِ عظیم کا باعث بن گئی۔

② وضعِ حدیث کی ابتدا اوراس کے اسباب

وضعِ حدیث کا ایک واقعہ تو نبی ﷺ کی زندگی میں رونما ہوا تھا۔ بریدہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ مدینے سے دو میل کے فاصلے پر بنولیث کا ایک ذیلی قبیلہ آباد تھا۔ اس قبیلے کے ایک شخص نے دورِ جاہلیت میں کسی شخص کو اس کی بیٹی کے لیے پیغامِ نکاح بھیجا تو قبیلے والوں نے انکار کردیا، پھر وہ شخص نبی ﷺ کے لباس جیسا لباس پہن کر ان کے پاس آیا اور انھیں کہا: رسول اللہ ﷺ نے بطور نشانی یہ لباس پہنا کر تمھارے پاس بھیجا ہے تاکہ میں تمھارے مالوں اور جانوں کے متعلق فیصلہ کروں، پھر وہ شخص اس عورت کے پاس گیا جسے پیغامِ نکاح بھیجا تھا تاکہ زبردستی اس سے نکاح کرلے۔ اس قبیلے والوں نے رسول اللہ ﷺ کے پاس قاصد بھیجا اور اس نے پورا واقعہ آپ ﷺ کو بتایا تو آپ نے فرمایا: ''اللہ کے اس دشمن نے جھوٹ بولا ہے۔'' پھر آپ ﷺ نے ایک شخص بھیجا اور اسے فرمایا: ''اگر تم اس شخص کو زندہ پاؤ تو اسے قتل کردینا اور اگر مردہ پاؤ تو اسے جلادینا۔'' جب وہ شخص وہاں پہنچا تو اس نے دیکھا کہ ایک بڑے اژدہا نے اسے ڈس لیا تھا جس سے وہ ہلاک ہوچکا تھا، چنانچہ اس قاصد نے اسے جلادیا اس وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدًا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ»

''جو شخص عمداً مجھ پر جھوٹ باندھے تو وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنالے۔''[1]

اس واقعے سے معلوم ہوا کہ وضعِ احادیث کی ابتدا نبی ﷺ کے زمانے سے ہوئی تھی لیکن اس سے تقریباً بیس سال بعد عثمان رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت کے آخر میں یہ فتنہ اجتماعی

① اس واقعے کے بغیر یہ حدیث صحیح بخاری میں موجود ہے۔ صحيح البخاري، العلم، باب إثم من كذب على النبي ﷺ، حدیث: 110 اور یہ واقعہ الموضوعات الکبرٰی لملاعلي قاري، ص: 4 میں ہے۔ جبکہ اس معنی کی ایک حدیث المعجم الأوسط للطبراني: 568/1، حدیث: 2091 میں بھی ہے۔

صورت میں نمودار ہوا۔ اس فتنے کا سرغنہ عبداللہ بن سبا یہودی تھا جس نے اسلام کا دعویٰ کیا لیکن اس نے اپنی طرف سے کچھ غلط عقیدے وضع کیے اور اپنے عقائد پھیلانے کے لیے اس نے کوفہ، بصرہ، شام اور مصر کا رخ کیا کیونکہ وہاں کے باشندے نئے نئے مسلمان ہوئے تھے۔ مصر میں بالخصوص عبداللہ بن سبا کی تحریک کامیاب ہوئی۔ اس نے علی رضی اللہ عنہ کے متعلق کہا کہ خلافت کے حقیقی حق دار تو علی رضی اللہ عنہ ہیں۔ اسی فتنے کی وجہ سے عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کر دیا گیا۔ اسی ٹولے کی سازشوں کی وجہ سے جنگِ جمل اور جنگِ صفین ہوئیں اور مسلمان دو فرقوں میں تقسیم ہو گئے۔ شیعانِ علی اور خوارج۔ بعض شیعانِ علی نے علی رضی اللہ عنہ کو خدا کا درجہ دے دیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان زندیقوں کو آگ میں جلا دیا تو انھوں نے کہا: ہم صحیح کہتے تھے کہ علی رضی اللہ عنہ خدا ہیں کیونکہ خدا اپنے بندوں کو آگ میں جلانے کا اختیار رکھتا ہے۔ خوارج نے علی رضی اللہ عنہ کی تنقیص کی یہاں تک کہ وہ انھیں کافر سمجھنے لگے، پھر ان دونوں فریقوں نے اپنی حقانیت ثابت کرنے کے لیے احادیث بنانا شروع کر دیں پہلے فریق نے علی رضی اللہ عنہ کی تعریف میں غلو سے کام لے کر احادیث وضع کر کے علی رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب کیں۔ اسی طرح انھوں نے ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما کی تنقیص اور ان کو غاصب ثابت کرنے کے متعلق احادیث، علی رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب کر کے وضع کیں، البتہ خوارج نے وضعِ حدیث میں بہت کم حصہ لیا۔ وضعِ حدیث کا یہ پہلا سبب تھا۔ اس کے بعد جتنے مبتدعین پیدا ہوئے انھوں نے اپنے بدعی عقائد و اعمال کے اثبات اور پرچار کے لیے اپنی طرف سے احادیث وضع کیں۔

③ موضوع روایات کی چھان بین کے بارے میں علمائے امت کی محنت

سب سے پہلے علی رضی اللہ عنہ نے سبائیوں کی تکذیب میں واضح الفاظ میں فرمایا:

«مَالِي وَلِهٰذَا الْخَبِيثِ الْأَسْوَدِ مَعَاذَ اللهِ أَنْ أُضْعِرَ لَهُمَا إِلَّا الْحَسَنَ الْجَمِيلَ»

''مجھے اس کالے خبیث (ابن سبا) سے کیا سروکار۔ اللہ کی پناہ! کہ میں ان دونوں (ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما) کے حق میں اچھی بات کے سوا کچھ کہوں۔''

آپ یہ فرما کر منبر پر تشریف لائے حتی کہ لوگ اکٹھے ہوگئے، پھر انھوں نے ان دونوں کی مدح میں ایک لمبا واقعہ بیان کیا۔ [1]

نیز آپ نے سبائی فرقے کے متعلق مندرجہ ذیل سخت کلمات فرمائے:

«قَاتَلَهُمُ اللهُ أَيَّ عِصَابَةٍ بَيْضَاءَ سَوَّدُوا وَأَيَّ حَدِيثٍ مِّنْ حَدِيثِ رَسُولِ اللهِ ﷺ أَفْسَدُوا»

''اللہ تعالیٰ ان (سبائیوں) کو غارت کرے انھوں نے کتنی روشن جماعت (امت مسلمہ) کو سیاہ کر دیا اور رسول اللہ ﷺ کی کتنی احادیث کو خراب کر دیا۔'' [2]

اس طرح کے واقعات کے بعد آپ نے موضوع احادیث کے مقابلے میں صحیح احادیث کی عام تشہیر کا پختہ عزم کیا۔ آپ کی تلوار کی نیام میں زکاۃ، دیت اور فرائض کے احکام پر مشتمل جو صحیفہ پڑا ہوتا تھا اس کی اشاعت کی اور اپنے ساتھیوں کو اس کے لکھنے کی ترغیب دی تاکہ لوگ اس میں مشغول ہو کر موضوع احادیث سے توجہ ہٹا لیں۔

مزید برآں علماء نے موضوع احادیث پہچاننے کے لیے ایک ایسا معیار بتایا ہے جس کے پہچاننے سے حدیث کا موضوع ہونا معلوم ہو جاتا ہے، علامہ ابن الجوزی فرماتے ہیں:

«كُلُّ حَدِيثٍ يُخَالِفُ الْعُقُولَ وَيُنَاقِضُ الْأُصُولَ فَاعْلَمْ أَنَّهُ مَوْضُوعٌ»

[1] لسان الميزان: 344/3. [2] تذكرة الحفاظ: 15/1.

’’ہر وہ حدیث جو عقل کی مخالفت کرتی ہو اور اصول شرعیہ کی متناقض ہو تو جان لو کہ وہ حدیث موضوع ہے۔‘‘

أَوْ يَكُونُ مِمَّا يَدْفَعُهُ الْحِسُّ وَالْمُشَاهَدَةُ أَوْ مُبَايِنًا لِنَصِّ الْكِتَابِ وَالسُّنَّةِ الْمُتَوَاتِرَةِ أَوِ الْإِجْمَاعِ الْقَطْعِيِّ حَيْثُ لَا يَقْبَلُ شَيْءٌ مِنْ ذٰلِكَ التَّاوِيلِ

’’یا وہ (موضوع حدیث) ایسی ہو کہ حس و مشاہدہ اسے قبول نہ کرتا ہو، یا وہ قرآن کریم کے کسی حصے اور سنت متواترہ یا قطعی اجماع، جس کی تاویل کی کوئی گنجائش نہ ہو، کی مخالف ہو۔‘‘ (تو سمجھو کہ وہ روایت موضوع ہے)[1]

اموی خلیفہ عبدالملک بن مروان خود بھی محدث تھے، انھوں نے کہا: ’’ہم پر مشرق (عراق، کوفہ، بصرہ وغیرہ) کی طرف سے احادیث کا سیلاب آگیا جنھیں ہم پہچانتے نہیں۔‘‘[2]

نیز انھوں نے موضوع احادیث کے سیلاب کو روکنے کے لیے مشہور وضاع حارث بن سعید کذاب کو تختہ دار پر لٹکا دیا۔ ان کے بیٹے ہشام بن عبدالملک نے اسی جرم کی وجہ سے غیلان دمشقی کو قتل کر دیا۔ اس کے بعد بنو امیہ کے مشہور گورنر خالد بن عبداللہ القسری نے ایک شخص کو وضعِ حدیث کے جرم میں قتل کیا۔

اس کے بعد عباسی خلفاء کے دور میں وضعِ حدیث کے خلاف بھرپور طریقے سے جہاد شروع کیا گیا۔ ابوجعفر منصور عباسی نے اسی جرم کی پاداش میں محمد بن سعید کو سولی پر چڑھایا۔[3] محمد بن سلیمان عباسی نے مشہور وضاع ابن ابی العوجاء کو قتل کیا۔

قاضی اسماعیل بن اسحاق نے ہیثم بن سہل کو اس وجہ سے خوب مارا کہ وہ موضوع

---

[1] فتح الملهم: 43/1. [2] الطبقات الكبرىٰ لابن سعد: 233/5. [3] یہ تمام واقعات آئینۂ پرویزیت، ص: 594 میں موجود ہیں۔

روایات بیان کررہا تھا۔

بعد کے ادوار میں جب موضوع روایات کا بازار گرم ہوتا رہا تو علمائے حق نے اس کے مقابلے کے لیے ایسے طریقے اختیار کیے جن کے سامنے وضعِ حدیث کارگر ثابت نہ ہوسکی۔

وہ دو قسم کے طریقے ہیں: ① نظری طریقہ ② عملی طریقہ

* نظری طریقہ: نظری طریقے میں ایک قسم کا تعلق متن حدیث کے ساتھ متعلق ہے جس کے لیے انھوں نے گیارہ اصول مقرر کیے ہیں جن سے موضوع روایات پہچانی جاسکتی ہیں۔

1. عقل کے خلاف ہو۔
2. مشاہدے کے خلاف ہو۔
3. قرآن کی قطعی دلالت والی نص یا متواتر حدیث یا اجماع کے خلاف ہو۔
4. عذاب وثواب میں بے حد مبالغہ ہو۔
5. ایسا تاریخی واقعہ جو بڑے مجمع میں ہوا ہو لیکن اسے صرف ایک ہی راوی نقل کرے جبکہ دوسرے لوگ اس سے بے خبر ہوں۔
6. نسلی اور قومی تعصّبات کے متعلق احادیث۔
7. فرقہ وارانہ روایات۔
8. مستند تاریخ کے خلاف ہو۔
9. راوی کا غیر طبعی طویل عمر کا دعویٰ ہو۔
10. کشف اور خواب پر مبنی روایات۔
11. الفاظ یا معانی کی رکاکت ورذالت۔

یہ وہ اصول ہیں جو وضعِ حدیث پر دلالت کرتے ہیں۔ ان اصولوں میں خلافِ عقل

سے مراد یہ ہے کہ وہ تمام اہل عقل کی عقل کے خلاف ہو۔ یہ نہیں کہ منکرینِ حدیث کے چند افراد کی عقل کے خلاف ہو کیونکہ وہ تو صحیح احادیث کو بھی اپنی ناقص عقل کی بنا پر رد کر دیتے ہیں۔

مندرجہ بالا گیارہ اصول مولانا عبدالرحمٰن کیلانی رحمہ اللہ نے مثالوں کے ساتھ بیان کیے ہیں۔[1]

نظری طریق کی دوسری قسم اسناد کے متعلق ہے۔ اس کے لیے علمائے سلف نے چار بڑے علوم میں جدوجہد کر کے اسانید کی چھان بین کرنے کے لیے راستہ ہموار کیا ہے۔

1. علم الجرح والتعدیل۔
2. علم التاریخ والرواۃ۔
3. معرفۃ الصحابہ رضی اللہ عنہم۔
4. علم الأسماء والکنیٰ۔

اور علمائے سلف نے ان علوم میں بڑی بڑی کتابیں تالیف کی ہیں۔

عملی طریقہ: محدثین نے وضاعین کے ناموں کی فہرستیں تیار کی ہیں اور موضوعات کے لیے مستقل کتابیں تالیف کی ہیں۔ ابن جوزی، سیوطی، ملا علی قاری اور شوکانی رحمہم اللہ ایسے علماء ہیں جنھوں نے موضوع روایات کے متعلق مستقل کتابیں تالیف کی ہیں۔ موجودہ دور میں فضیلۃ الشیخ علامہ البانی رحمہ اللہ نے اس موضوع پر تاریخی خدمت سرانجام دی ہے۔ اکثر محدثین نے اپنی کتابوں میں حدیث کے ساتھ اس کی اسنادی حیثیت جیسے صحیح، حسن، ضعیف اور موضوع وغیرہ بیان کرنے کے ساتھ ساتھ ان راویوں کا بھی ذکر کیا ہے جن پر کوئی کلام ہو یا وہ کذاب یا وضاع ہوں۔

اس تفصیل کے بعد منکرینِ حدیث کا یہ شبہ، بلکہ بہانہ بالکل باطل قرار پاتا ہے جو یہ

[1] آئینۂ پرویزیت، ص: 597-599.

کہتے ہیں کہ موضوع احادیث، صحیح احادیث کے ساتھ اس طرح خلط ملط ہوئی ہیں کہ ان کے درمیان فرق کرنا مشکل ہو گیا ہے، یا کسی راوی نے اپنی موضوع روایت کے لیے ثقہ راوی کی سند بیان کی ہو۔ سابقہ تفصیل سے معلوم ہوا کہ منکرین حدیث کے اس طرح کے بہانے اب مسلمانوں کے ہاں نہیں چل سکتے۔

پندرھواں شبہ: تمام راویانِ حدیث کا مطعون ہونا

سوال منکرینِ حدیث کا ایک اعتراض یہ ہے کہ حجیتِ حدیث ثبوت حدیث پر مبنی ہے اور ثبوتِ حدیث کی بنیاد سند کے راویوں پر ہے جبکہ راوی تو سارے متکلم فیہم ہیں، یعنی کسی نہ کسی نے ہر ایک پر اعتراض کیا ہے حتی کہ ائمۂ رجال نے بھی ایک دوسرے پر طعن کیا ہے۔

جواب پہلی بات تو یہ کہنا کہ تمام راوی متکلم فیہم ہیں، یہ بات علی الاطلاق صحیح نہیں کیونکہ ایسے راوی بھی ہیں جو کہ متکلم فیہم نہیں ہیں، دوسری بات یہ ہے کہ بعض راویوں کے بارے میں ائمۂ کرام سے منقول جرح سنداً ثابت نہیں ہوتی، علاوہ ازیں ائمۂ حدیث نے دلائل کی بنیاد پر جرح و تعدیل کے قواعد وضوابط وضع کیے ہیں جن میں ایک قاعدہ یہ بھی ہے کہ جرح تب قبول ہے جب وہ مفسَّر ہو، یعنی اس کا سبب واضح کیا گیا ہو۔ جرح مبہم قبول نہیں۔ اس کی تفصیل کتاب کے آخر میں آ رہی ہے۔

سوال اصولِ حدیث میں مشہور قاعدہ ہے کہ اَلْجَرْحُ مُقَدَّمٌ عَلَى التَّعْدِيلِ "جرح تعدیل پر مقدم ہے" تو پھر جس راوی پر جرح اور تعدیل کی گئی ہو اس کی روایت کیسے مقبول ہو گی؟

جواب اس کا جواب تاج الدین سبکی نے دیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

"محدثین کے قاعدے "جرح، تعدیل پر مقدم ہے" کو مطلق سمجھ لینے سے مکمل طور پر احتیاط برتنی چاہیے کیونکہ درست بات یہ ہے کہ جس شخص کی امامت و

عدالت ثابت ہو،اس کی مدح کرنے والے زیادہ اور جرح کرنے والے نادر ہوں اور وہاں یہ قرینہ بھی موجود ہو کہ مذہبی تعصب وغیرہ اس جرح کا سبب ہے تو پھر اس صورت میں جرح کی طرف التفات نہیں کیا جائے گا۔''[1]

پھر لکھتے ہیں: ''ہم نے آپ کو بتایا ہے کہ جرح کرنے والے کی ایسے شخص کے متعلق جرح قبول نہیں کی جائے گی اگرچہ وہ جرح مفسر ہو، جس کی نیکیاں اس کے معاصی سے، اس کی مدح کرنے والے اس کی مذمت کرنے والوں اور اس کی صفائی پیش کرنے والے اس کی جرح کرنے والوں سے زیادہ ہوں جبکہ وہاں اس بات کا قرینہ بھی ہو کہ جرح کرنے کا سبب مذہبی تعصب یا کوئی دنیوی مقابلہ ہے جیسا کہ ہم عصروں میں ہوتا ہے، امام مالک رحمہ اللہ کے متعلق ابن ابی ذئب رحمہ اللہ، امام شافعی رحمہ اللہ کے متعلق ابن معین اور امام احمد رحمہ اللہ کے متعلق نسائی رحمہ اللہ کے کلام کی طرف التفات نہیں کیا جائے گا۔ اگر ہم اس قاعدے ''جرح تعدیل پر مقدم ہے'' کا مطلق طور پر اطلاق کردیں تو پھر کوئی بھی امام نہیں بچتا کیونکہ کوئی بھی ایسا امام نہیں جس کے متعلق طعن کرنے والوں نے طعن نہ کیا ہو۔''[2]

اس عبارت سے یہ واضح ہوا کہ کسی راوی کے متعلق صرف کلام اور جرح کی وجہ سے فی الفور فیصلہ نہیں کیا جا سکتا کہ اس راوی کی وجہ سے یہ روایت ضعیف یا موضوع ہے اور یہ قانون بھی مطلق طور پر نافذ نہیں کیا جا سکتا کہ ''جرح تعدیل پر مقدم ہے۔'' تیسری بات یہ ہے کہ کبھی کسی حدیث کی اسناد ضعیف ہوتی ہیں لیکن راوی پر جھوٹ یا وضع (احادیث گھڑنے) کی تہمت نہیں ہوتی بلکہ ضعف کا کوئی خفیف سبب ہوتا ہے تو یہاں کثرت اسانید میں سے بعض دوسری اسناد حدیث کو تقویت پہنچاتی ہیں جس کی وجہ سے حدیث صحیح

---

[1] طبقات السبكي بحواله ظفرالأماني في مصطلح الحديث از عبدالحي لكهنوي، ص: 496. [2] ضوابط الجرح والتعديل، تدريب الراوي.

لغیرہ یاحسن لغیرہ ہوکرقابل عمل بن جاتی ہے۔

امام ابن صلاح فرماتے ہیں: ''حدیث میں ضعف کی دوقسمیں ہیں۔ان میں سے ایک ضعف وہ ہے جوسند کے بہت زیادہ طرق ہونے کی وجہ سے زائل ہوجاتا ہےاور یہ تب ہے کہ اس کا ضعف اس کے سوء حفظ کی وجہ سے ہو جبکہ راوی اہل صدق و دیانت میں سے ہو۔ جب ہم اس سے مروی حدیث کو دیکھیں کہ اسے کسی اور نے بھی روایت کیا ہے تو ہم جان لیں گے کہ اس نے اسے حفظ کیا اوراس میں اس کے ضبط میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ اوراسی طرح جب ضعف ارسال کے باعث ہوتو یہ بھی زائل ہوجاتا ہے۔اور ایک ضعف وہ ہے جو زائل نہیں ہوتا کیونکہ یہ ضعف بہت قوی ہوتا ہے جسے زائل کرنے والا کوئی سبب نہیں پایا جاتا۔ اور یہ وہ ضعف ہے جوراوی کے جھوٹ سے مطعون ہونے یا حدیث کے شاذ ہونے کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔''[1]

اس عبارت سے ثابت ہوا کہ راوی کا مطلق ضعف، حدیث کے ضعیف ہونے کا باعث نہیں بنتا بلکہ اس میں مراتب و درجات کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔

اس تفصیل سے ثابت ہوا کہ اثباتِ حدیث صرف سند پر موقوف نہیں اور سند میں صرف مطلق ضعف سے حدیث ضعیف نہیں بنتی، لہٰذا اس بہانے سے حجیتِ احادیث کا انکار کرنا کہ حدیث کا دارومدار راویوں پر ہے اور راوی سارے متکلم فیہم (مطعون) ہیں، غلط اور باطل ہے۔

سولھواں شبہ: حدیث کو قرآن پر پیش کرنے کے متعلق حدیث

منکرین حدیث نے حدیث رد کرنے کے لیے اس روایت پر اعتماد کیا ہے جسے علمائے

[1] مقدمة ابن الصلاح بحواله ظفر الأماني في مصطلح الحديث، ص:171.

اصولِ فقہ نے اپنی کتابوں میں بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«إِذَا رُوِيَ عَنِّي حَدِيثٌ فَأَعْرِضُوهُ عَلٰى كِتَابِ اللهِ فَإِنْ وَافَقَهُ فَاقْبَلُوهُ وَإِنْ خَالَفَهُ فَرُدُّوهُ»

”جب مجھ سے کوئی حدیث روایت کی جائے تو اسے کتاب اللہ پر پیش کرو، پس اگر وہ اس کے موافق ہو تو اسے قبول کر لو اور اگر اس کے مخالف ہو تو اسے رد کر دو۔“[1]

اس سے ثابت ہوا کہ جب حدیث قرآن کریم کے مطابق ہو تب قابل قبول ہے۔

جواب اس حوالے سے درج ذیل نکات ذہن نشین رہیں:

1. کسی حدیث سے استدلال کے لیے شرط یہ ہے کہ وہ حدیث ثابت ہو جبکہ مذکورہ حدیث ثابت ہی نہیں ہے۔ اس حدیث کے متعلق امام خطابی نے معالم السنن میں نقل کیا ہے: ”اس حدیث کو زندیقوں نے وضع کیا ہے۔“ اور نور الانوار کے حاشیے میں بھی اسی طرح لکھا ہے، نیز فیروز آبادی اور صنعانی وغیرہ نے کہا ہے کہ اس باب میں کوئی حدیث ثابت نہیں۔ اور مولانا عبدالحی لکھنوی نے اس قسم کی تفصیل نقل کی ہے۔[2] امام سیوطی نے بھی اس روایت کی تردید کی ہے۔[3]

2. مطابقت کے دو مصداق ہیں۔ ایک یہ کہ قرآن و حدیث کے مضمون میں کوئی فرق نہ ہو، ایسی صورت ہو تو پھر حدیث کی کیا ضرورت باقی رہتی ہے؟

دوسری صورت یہ ہے کہ حدیث قرآن کریم کے مخالف نہ ہو، اس صورت میں ہمارا موقف یہی ہے کہ صحیح و مقبول حدیث کبھی بھی قرآن کے خلاف نہیں ہو سکتی۔ قرآن و حدیث کے درمیان بظاہر جو اختلاف و تعارض نظر آتا ہے علمائے محققین نے اس کا حل

[1] تذكرة المحتاج إلى أحاديث المنهاج: 27/1، حديث: 22. [2] ظفر الأماني، ص: 462.
[3] مفتاح الجنة في الاحتجاج بالسنة، ص: 21,10.

پیش کیا ہوتا ہے، لہٰذا قرآن اور ثابت احادیث کے درمیان کوئی تعارض موجود نہیں ہے۔

سترھواں شبہ: عذابِ قبر

منکرینِ عذاب قبر کے تین نظریات یا تین فریق ہیں جو کہ مندرجہ ذیل ہیں:

پہلا فریق: ایک فرقے کے نزدیک دنیوی اور اخروی حیات کے درمیان کوئی اور حیات ہے نہ کوئی عذاب و تنعیم۔ یہ اکثر معتزلہ کا قول ہے۔ ان کی مشہور دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں دو زندگیوں کا ذکر فرمایا ہے، ایک دنیوی اور دوسری اخروی جبکہ تیسری حیات کا کوئی ذکر نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ۚ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ﴾

''تم لوگ اللہ کا کیونکر انکار کرتے ہو، حالانکہ تم بے جان تھے اس نے تمھیں زندہ کیا، پھر مارے گا، پھر زندہ کرے گا، پھر تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔''[1]

نیز فرمایا:

﴿قَالُوْا رَبَّنَآ اَمَتَّنَا اثْنَتَيْنِ وَاَحْيَيْتَنَا اثْنَتَيْنِ فَاعْتَرَفْنَا بِذُنُوْبِنَا﴾

''وہ کہیں گے: ہمارے رب! تو نے ہمیں دو دفعہ مارا اور دو دفعہ زندہ کیا، پس ہم نے اپنے گناہوں کا اعتراف کر لیا۔''[2]

نیز فرمایا:

﴿اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ ۝ ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عِنْدَ رَبِّكُمْ تَخْتَصِمُوْنَ ۝﴾

''بے شک آپ کو بھی مرنا ہے اور بے شک یہ بھی مرنے والے ہیں، پھر بے شک

[1] البقرة 28:2. [2] المؤمن 11:40.

تم سب اپنے جھگڑے روز قیامت اپنے رب کے حضور پیش کرو گے۔''①

نیز فرمایا:

﴿ ثُمَّ اِنَّكُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ لَمَيِّتُوْنَ ۝ ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ تُبْعَثُوْنَ ۝ ﴾

''پھر اس کے بعد تم نے ضرور مرنا ہے، پھر تمھیں روز قیامت اٹھایا جائے گا۔''②

مذکورہ بالا آیات میں صرف دو زندگیوں کا تذکرہ ہے، حیات دنیوی جو ماں کے پیٹ سے شروع ہوتی ہے اور حیات اخروی جس کی تعبیر بعث بعد الموت ہے اور وہ آخرت ہے تو جب تیسری حیات نہیں تو پھر تنعیم وعذاب کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔

❁ دوسرا فریق: منکرِ حدیث حافظ اسلم نے کہا ہے کہ ''متعدد آیات سے ثابت ہے کہ مرنے کے بعد سے لے کر یوم حشر تک مردوں میں کسی قسم کا احساس وشعور نہیں ہوتا جسم تو ویسے ہی مٹی میں گل سڑ جاتا ہے اور روح پر بھی یہ زمانہ بس ایک گھڑی کے مانند گزرتا ہے۔ بالفاظ دیگر جب کوئی مرتا ہے اس وقت ہی اس کی قیامت قائم ہوتی ہے، لہٰذا برزخ کا زمانہ یا برزخ کی زندگی ناممکن سی باتیں ہیں۔ قبر میں پڑے مردوں کا کسی بات کا سننا درکنار شعور واحساس تک نہیں ہوتا۔''③

ان کی متضاد تحریریں ملاحظہ فرمائیں۔ پہلے تو برزخ سے انکار کیا، پھر کہا برزخ کی مدت مرنے والوں کی موت سے لے کر حشر تک ہے۔④

ایک جگہ لکھا ہے: موت اور حشر میں مردوں کے لیے فصل زمانی نہیں ہے۔⑤

اس فریق کی مشہور دلیل یہ آیتِ کریمہ ہے:

﴿ قَالُوْا يٰوَيْلَنَا مَنْۢ بَعَثَنَا مِنْ مَّرْقَدِنَا ۜ هٰذَا ﴾

① الزمر 31,30:39. ② المؤمنون 16,15:23. ③ بحوالہ آئینۂ پرویزیت، ص:374. ④ قرآنی فیصلے، ص:312. ⑤ قرآنی فیصلے، ص:318.

”ہائے افسوس! کس نے ہمیں ہماری خواب گاہوں سے جگا دیا۔“[1]

اور کہتے ہیں کہ رُقَاد کا معنیٰ ”سونا“ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَتَحْسَبُهُمْ أَيْقَاظًا وَّهُمْ رُقُودٌ ﴾

”اور تم انھیں جاگتے ہوئے خیال کرتے ہو، حالانکہ وہ سوئے ہوئے ہیں۔“[2]

اس فریق نے برزخ اور فصل زمانی کا انکار اس وجہ سے کیا کہ عذاب قبر اور احوال قبر سے انکار کر سکے۔

تیسرا فریق: یہ فریق عذاب قبر کا قائل ہے اور قبر سے برزخ مراد لیتا ہے۔ وہ صرف روح کے لیے عذاب و تنعیم کا قائل ہے۔ بدن کے متعلق کسی قسم کی حیات اور عذاب و تنعیم کا عقیدہ نہیں رکھتا۔ اور دنیاوی قبر میں عذاب سے بالکل منکر ہے، یعنی عذابِ قبر اور عذاب فی القبر میں کوئی فرق نہیں کرتا۔ یہ نظام معتزلی کا قول ہے اور موجودہ زمانہ میں بعض مدعیان توحید ایسا عقیدہ رکھتے ہیں۔

یہ سارے فرقے اس مسئلے میں انکارِ حدیث کے مرتکب ہیں، جبکہ ان کے بالمقابل اہل سنت والجماعت کا عقیدہ ہے کہ قبر معروف (مدفن) میں جو بدن ہے یا بدن کے ذرات جہاں بھی بکھرے ہوئے ہیں اللہ تعالیٰ اپنی قدرت عظیمہ سے ان کو (اگر عذاب کے مستحق ہوں) عذاب میں مبتلا کر دیتا ہے۔ اور اسے عذاب فی القبر (دنیاوی قبر میں عذاب) کہا جاتا ہے۔ اور روح کو بھی عذاب ہوتا ہے، لیکن روح کے لیے الگ مستقر ہے۔[3]

اور اس مستقر میں اللہ تعالیٰ ارواح کو بعض متشکلہ جسم دیتا ہے اور اس کے ذریعے سے انھیں عذاب و تنعیم میں مبتلا کرتا ہے اور اس عقیدے کے مطابق عذاب و تنعیم کا تعلق بدن

[1] یٰسٓ 52:36. [2] الکھف 18:18. [3] مسئلہ مستقر أرواح، شرح عقیدۃ طحاویۃ اور مجموعۃ الفتاوی مولانا عبدالحي لکھنوي اور دیگر کتب میں بالتفصیل موجود ہے۔

اور روح دونوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ لیکن قبر میں سوال و جواب کے علاوہ اوقات میں روح بدن میں نہیں ہوتی۔ اس کو برزخی حیات کہتے ہیں۔

اس مسئلے میں آیات اور احادیث پیش کی جاتی ہیں جو عذابِ قبر اور عذاب فی القبر کے اثبات پر دلالت کرتی ہیں اور ان سے تینوں فریقوں کے شبہات کا ازالہ ہوسکتا ہے۔

احوال قبر سے متعلق آیات

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ اَلْهٰىكُمُ التَّكَاثُرُ ۙ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ۭ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ ثُمَّ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۝ ﴾

''بہتات کی حرص نے تمھیں غفلت میں رکھا۔ یہاں تک کہ تم نے قبریں جادیکھیں۔ ہاں ہاں تمھیں بہت جلد معلوم ہو جائے گا، پھر سن رکھو تمھیں عنقریب معلوم ہو جائے گا۔''[1]

آخری دو آیات میں عذاب قبر کا ڈراوا دیا گیا ہے، کیونکہ اخروی عذاب تو اس کے بعد والی آیات میں مذکور ہے۔ اس سے عذاب فی القبر اور عذاب قبر دونوں ثابت ہوتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰۗىِٕكَةُ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَالُوْا فِيْمَ كُنْتُمْ ۭ قَالُوْا كُنَّا مُسْتَضْعَفِيْنَ فِي الْاَرْضِ ۭ قَالُوْٓا اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا ۭ فَاُولٰۗىِٕكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۭ وَسَاۗءَتْ مَصِيْرًا ۝ ﴾

''جن لوگوں کی اس حالت میں فرشتے جان قبض کرتے ہیں کہ وہ (جان بوجھ کر

[1] التکاثر 102:1-4.

کافروں میں رہ کر) اپنی جانوں پر ظلم کرتے رہے ہوں، پوچھتے ہیں کہ تم کس حال میں تھے؟ وہ کہتے ہیں: ہم دنیا میں بے بس اور کمزور تھے۔ فرشتے کہتے ہیں کہ کیا اللہ کی زمین وسیع وفراخ نہ تھی کہ تم اس میں ہجرت کر کے چلے جاتے۔ یہی لوگ ہیں جن کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ برا ٹھکانا ہے۔''[1]

اس آیت سے معلوم ہوا کہ وفات کے وقت یا اس کے بعد قبر ہی میں فرشتے ایسے لوگوں کو ڈانٹ ڈپٹ کرتے ہیں جنھوں نے فریضۂ ہجرت ترک کردیا تھا تو یہ حالتِ قبر یا حالتِ برزخ ہے جس میں ان پر یہ عذاب مقرر کیا گیا۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَلَوْ تَرَىٰٓ إِذِ ٱلظَّٰلِمُونَ فِى غَمَرَٰتِ ٱلْمَوْتِ وَٱلْمَلَٰٓئِكَةُ بَاسِطُوٓا۟ أَيْدِيهِمْ أَخْرِجُوٓا۟ أَنفُسَكُمُ ۖ ٱلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ ٱلْهُونِ بِمَا كُنتُمْ تَقُولُونَ عَلَى ٱللَّهِ غَيْرَ ٱلْحَقِّ وَكُنتُمْ عَنْ ءَايَٰتِهِۦ تَسْتَكْبِرُونَ ۝ ﴾

''اور اگر آپ اس وقت دیکھیں جبکہ وہ ظالم موت کی تکلیفوں میں ہوں اور فرشتے اپنے ہاتھ پھیلا رہے ہوں کہ اپنی جانیں نکالو، آج تمھیں ذلت کا عذاب دیا جائے گا کیونکہ تم اللہ کے ذمے ناحق باتیں لگاتے تھے اور اس کی آیتوں سے سرکشی کیا کرتے تھے۔''[2]

یہ آیت صراحت کے ساتھ دلالت کرتی ہے کہ وفات کے وقت اور وفات کے بعد فرشتے ظالم لوگوں کو ملامت کے ساتھ ذلت کے عذاب کا ڈراوا دیتے ہیں۔ اور لفظ ﴿ ٱلْيَوْمَ ﴾ ''آج'' واضح دلیل ہے کہ یہ عذاب موت کے وقت سے شروع ہوتا ہے۔ یہ عذابِ قبر اور عذابِ برزخ کے لیے بالکل صریح دلیل ہے۔ اگر کوئی شخص تاویل کرتے

[1] النسآء 4:97. [2] الأنعام 6:93.

ہوئے کہتا ہے کہ یہ قیامت کے دن کا معاملہ ہے تو یہ تاویل لفظ ﴿ اَلْيَوْمَ ﴾ ''آج'' کے بالکل خلاف ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَلَوْ تَرٰٓى اِذْ يَتَوَفَّى الَّذِيْنَ كَفَرُوا ۙ الْمَلٰٓئِكَةُ يَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَاَدْبَارَهُمْ ۚ وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ ○ ﴾

''کاش کہ آپ اس وقت دیکھیں جب فرشتے کافروں کی روحیں قبض کرتے ہیں، وہ ان کے چہروں پر اوران کی پشت پر مارتے ہیں اور (کہتے ہیں!) جلانے والی آگ کے عذاب کا مزہ چکھو۔''[1]

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ فَكَيْفَ اِذَا تَوَفَّتْهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ يَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَاَدْبَارَهُمْ ○ ﴾

''پس ان کا کیا حال ہوگا جب فرشتے ان کی جان قبض کریں گے اور وہ ان کے چہروں اور پشت پر مارتے جائیں گے۔''[2]

ان دونوں آیات میں تصریح ہے کہ وفات کے بعد فرشتے کافروں اور منافقوں کے چہروں اور پشت پر مار مار کر کہیں گے کہ اس عذاب کا مزہ چکھو۔ اگر یہ عذابِ قبر اور عذابِ برزخ نہیں تو پھر اور کیا ہے؟

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُهٗ بَيَاتًا اَوْ نَهَارًا مَّاذَا يَسْتَعْجِلُ مِنْهُ الْمُجْرِمُوْنَ ○ اَثُمَّ اِذَا مَا وَقَعَ اٰمَنْتُمْ بِهٖ ؕ آٰلْئٰنَ وَقَدْ كُنْتُمْ بِهٖ تَسْتَعْجِلُوْنَ ○ ثُمَّ قِيْلَ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ذُوْقُوْا عَذَابَ الْخُلْدِ ۚ هَلْ تُجْزَوْنَ اِلَّا بِمَا كُنْتُمْ تَكْسِبُوْنَ ○ ﴾

[1] الأنفال 8:50. [2] محمد 47:27.

”فرمادیجیے: بھلا دیکھو تو سہی، اگر تم پر اس کا عذاب رات کو یا دن کو آجائے (تو تم کیا بچاؤ کر لو گے؟ آخر) ان مجرموں کو کس بات کی جلدی ہے، کیا پھر جب (عذاب) آ پڑے گا (تب) اس پر ایمان لاؤ گے؟ (اس وقت کہا جائے گا) کیا اب ایمان لاتے ہو؟ اور اس سے پہلے تو تم نے اس کے متعلق جلدی مچا رکھی تھی، پھر ان لوگوں سے جنھوں نے ظلم کیا کہا جائے گا کہ ہمیشہ کا عذاب چکھو، تم انھی اعمال کا بدلہ پاؤ گے جو تم کرتے رہے ہو۔“[1]

ان آیات میں رات یا دن میں عذاب آنا مرنے کا مفہوم رکھتا ہے، یعنی مرنے کے وقت ایمان لائیں گے جبکہ وہ ایمان قبول نہیں ہوگا بلکہ کہا جائے گا کہ ہمیشہ کا عذاب چکھو اور اس عذاب سے مراد عذابِ قبر اور عذابِ برزخ ہے جو مرنے کے بعد متصل ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَخَابَ كُلُّ جَبَّارٍ عَنِيدٍ ۝ مِّن وَرَآئِهِۦ جَهَنَّمُ﴾

”ہر سرکش و متکبر نامراد ہوا اور اس کے آگے جہنم ہے۔“[2]

لفظ ﴿وَخَابَ﴾ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ قبر اور برزخ میں اسے ناامیدی ظاہر ہوگئی ہے کیونکہ وہ عذاب میں گرفتار ہو چکا ہے جبکہ ﴿مِّن وَرَآئِهِۦ﴾ ”اس کے آگے“ سے معلوم ہوا کہ جہنم کا عذاب اس کے بعد ہے۔

نیز فرمایا:

﴿الَّذِينَ تَتَوَفَّاهُمُ الْمَلَائِكَةُ ظَالِمِي أَنفُسِهِمْ ۖ فَأَلْقَوُا السَّلَمَ مَا كُنَّا نَعْمَلُ مِن سُوءٍ ۚ بَلَىٰ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ۝ فَادْخُلُوا أَبْوَابَ جَهَنَّمَ خَالِدِينَ فِيهَا﴾

① یونس 10:50-52. ② إبراهيم 14:15,16.

''وہ لوگ جن کی روحیں فرشتوں نے قبض کی تھیں اس حال میں کہ وہ لوگ اپنی جان پر ظلم کررہے تھے، تو وہ (یہ کہتے ہوئے) سر تسلیم خم کردیتے ہیں کہ ہم نے تو کوئی برا کام نہیں کیا تھا، کیوں نہیں، اللہ کو تمھارے سب اعمال کی خبر ہے، لہٰذا تم جہنم کے دروازوں میں داخل ہو جاؤ۔ ہمیشہ اسی میں رہو گے۔''[1]

نیز فرمایا:

﴿ الَّذِيْنَ تَتَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ طَيِّبِيْنَ ۙ يَقُوْلُوْنَ سَلٰمٌ عَلَيْكُمُ ۙ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝ ﴾

''جب فرشتے پاک باز لوگوں کی روحیں قبض کرتے ہیں تو فرشتے کہتے ہیں کہ تم پر سلامتی ہو، اپنے اعمال کے سبب جنت میں داخل ہو جاؤ۔''[2]

ان آیات میں مشرکین اور موحدین کی وفات اور وفات کے بعد کے احوال کا تقابل پیش کیا گیا ہے۔ پہلی آیات میں مشرکین کی وفات اور بعد الوفات (قبر و برزخ) کا بیان ہے جس میں فرشتوں کے ساتھ مکالمہ، سلام اور شرک سے انکار کا مسئلہ ہے، پھر انھیں کہا جائے گا کہ جہنم میں داخل ہو جاؤ، یعنی ان کی روحیں جہنم میں داخل کی جائیں گی کیونکہ آخرت کی رسوائی کا بیان اس سے قبل آیت: 27 میں ہو چکا ہے جبکہ آیت: 32 میں موحدین کی نعمتوں کا بیان ہے کہ ان کی روحیں جنت میں جائیں گی۔

نیز فرمایا:

﴿ يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ فِي الْاٰخِرَةِ ۚ ﴾

''اللہ ان لوگوں کو جو ایمان لاتے ہیں دنیا و آخرت کی زندگی میں ثابت قدم رکھتا ہے۔''[3]

[1] النحل 29,28:16. [2] النحل 32:16. [3] إبراهيم 27:14.

امام بخاری رحمہ اللہ اور دوسرے علماء نے یہ آیت عذاب قبر کے اثبات کے لیے بیان کی ہے۔ اور اس کی تفسیر میں ایک صحیح حدیث روایت کی ہے جس میں صراحت ہے کہ ﴿ وَفِي الْاٰخِرَةِ ﴾ سے ''قبر'' مراد ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ انسان کے لیے دنیوی اور برزخی حیات میں ثابت قدمی ضروری ہے کیونکہ ان دونوں جگہوں میں انسان پر آزمائشیں آتی ہیں اور ثابت قدمی کی ضرورت آزمائشوں کے وقت ہی ہوتی ہے تو اس آیت کی تفسیر میں جو حدیث ہے، اس میں قبر میں مومن کے ساتھ سوال و جواب کا تذکرہ ہے۔

نیز فرمایا:

﴿ وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى ۝ ﴾

''اور جس نے میری یاد سے منہ موڑا تو بلاشبہ اس کی زندگی تنگ ہوگئی۔ اور قیامت کے دن ہم اسے اندھا کر کے اٹھائیں گے۔''[1]

اس آیت کی تفسیر میں مفسرین نے ایک روایت بیان کی ہے کہ ﴿ مَعِيْشَةً ضَنْكًا ﴾ سے مراد ''عذابِ قبر'' ہے۔ اس کا قرینہ یہ ہے کہ کافروں اور قرآن سے منہ موڑنے والوں کی دنیوی زندگی اکثر لذتوں اور فراوانی میں گزر جاتی ہے۔ اور قیامت کی حالت ﴿ نَحْشُرُهٗ ﴾ میں بیان کی گئی ہے تو پھر ﴿ مَعِيْشَةً ضَنْكًا ﴾ سے قبر کی حالت مراد ہے۔

نیز فرمایا:

﴿ وَحَاقَ بِاٰلِ فِرْعَوْنَ سُوْٓءُ الْعَذَابِ ۝ اَلنَّارُ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَّعَشِيًّا ۚ وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ ۫ اَدْخِلُوْٓا اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ ۝ ﴾

''اور آل فرعون کو بہت برے عذاب نے آگھیرا، وہ صبح و شام دوزخ کی آگ

[1] طٰہٰ 124:20۔

کے سامنے پیش کیے جاتے ہیں اور جس دن قیامت آئے گی تو کہا جائے گا: آل فرعون کو سخت ترین عذاب میں ڈال دو۔''[1]

ان آیات میں فرعون اور اس کی قوم پر تین قسم کے عذاب آنے کا ذکر ہے۔

1 دنیوی عذاب: آل فرعون کو بہت برے عذاب نے آگھیرا۔

2 برزخی عذاب: وہ صبح وشام دوزخ کی آگ کے سامنے پیش کیے جاتے ہیں۔

3 اخروی عذاب: جس دن قیامت آئے گی تو کہا جائے گا: آل فرعون کو سخت ترین عذاب میں ڈال دو۔

دوسری قسم کا عذاب یقیناً برزخی حالت میں ہے کیونکہ قیامت کا ذکر مستقل طور پر الگ کیا ہے۔ اوران دونوں کو اخروی عذاب سمجھنا جیسا کہ حافظ اسلم نے لکھا ہے،[2] محض جہالت ہے۔

نیز فرمایا:

﴿ سَنُعَذِّبُهُمْ مَّرَّتَيْنِ ثُمَّ يُرَدُّوْنَ اِلٰى عَذَابٍ عَظِيْمٍ ۝ ﴾

''اور عنقریب ہم انھیں دو مرتبہ عذاب دیں گے، پھر انھیں عذاب عظیم کی طرف لوٹایا جائے گا۔''[3]

اس آیت میں ﴿ مَّرَّتَيْنِ ﴾ ''دو مرتبہ'' میں سے، پہلی مرتبہ سے دنیوی عذاب اور دوسری مرتبہ سے برزخی عذاب مراد ہے جبکہ عذاب عظیم اخروی عذاب ہے۔ اس پر تمام مفسرین نے اتفاق کیا ہے۔

نیز فرمایا:

﴿ مِمَّا خَطِيْٓـٰٔتِهِمْ اُغْرِقُوْا فَاُدْخِلُوْا نَارًا ﴾

[1] المؤمن 40:45،46. [2] قرآنی فیصلے، ص:326. [3] التوبة 9:101.

''ان کی خطاؤں کی وجہ سے انھیں غرق کر دیا گیا، پھر انھیں آگ میں ڈال دیا گیا۔''[1]

آیت میں ﴿ فَاُدْخِلُوْا نَارًا ﴾ سے برزخی عذاب مراد ہے۔ یہاں آگ سے جہنم مراد نہیں کیونکہ ﴿ فَاُدْخِلُوْا نَارًا ﴾ میں ''فا'' تعقیب مع الوصل پر دلالت کرتا ہے، یعنی انھیں غرق کرنے کے بعد متصل طور پر آگ میں داخل کر دیا گیا تو یہ قبر اور برزخ کا عذاب ہے۔

نیز فرمایا:

﴿ وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ۝ ﴾

''اور جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے جائیں تو انھیں مردہ نہ کہو، وہ زندہ ہیں لیکن تم نہیں سمجھتے۔''[2]

نیز فرمایا:

﴿ وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ ۝ فَرِحِيْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۙ وَيَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِيْنَ لَمْ يَلْحَقُوْا بِهِمْ مِّنْ خَلْفِهِمْ ۙ اَلَّا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ يَسْتَبْشِرُوْنَ بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ ﴾

''اور جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے جائیں انھیں مردہ نہ خیال کرو بلکہ وہ زندہ ہیں، انھیں اپنے رب کی طرف سے روزی مل رہی ہے۔ اللہ نے اپنے فضل سے جو کچھ انھیں دیا ہے اس پر خوش ہیں اور ان (مومن) لوگوں کی نسبت خوش ہو رہے ہیں جو ابھی ان سے ملے نہیں، ان کے پیچھے رہ گئے ہیں کہ نہ تو ان پر کوئی خوف ہوگا اور نہ کسی طرح کا غم کھائیں گے۔ وہ اللہ کی نعمت اور اس کا فضل عطا ہونے پر خوشی محسوس کرتے ہیں اور بے شک اللہ مومنوں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔''[3]

[1] نوح 25:71. [2] البقرة 154:2. [3] آل عمرٰن 171-169:3.

ان آیاتِ کریمہ میں اللہ کی راہ میں شہید ہونے والوں کے لیے برزخی زندگی اور اس میں رزق، خوشیوں اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں اور فضل کی بشارت کا تذکرہ ہے۔ اس سے دنیوی زندگی مراد لینا عقل ونقل دونوں کے خلاف ہے کیونکہ وہ شہید کردیے گئے ہیں۔ ان کے بدن سے روح نکل چکی ہے۔ ان پر اموات کے احکام شرعیہ نافذ کردیے گئے، لہٰذا ان پر حیات دنیوی کا اطلاق کرنا عقل ونقل کے خلاف ہے۔ اس سے حیات اخروی بھی مرادنہیں لی جاسکتی (جیسا کہ معتزلہ کا مسلک ہے) کیونکہ اخروی زندگی تو سب انسانوں کے لیے حق اور یقینی ہے جسے بعث بعد الموت کہا جاتا ہے تو پھر شہداء کے لیے کون سی خصوصیت ہوئی۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''لیکن تم نہیں سمجھتے۔'' جبکہ مومن تو حیات اخروی کو مانتے اور سمجھتے ہیں، لہٰذا معلوم ہوا کہ اس سے برزخی زندگی مراد ہے لیکن اس کا احساس وشعور زندہ لوگوں کے علم سے باہر ہے۔ اس حیات کا احساس نہیں کیا جاسکتا، اگرچہ اس حیات کے آثار بدن اور روح دونوں پر ہوتے ہیں لیکن یہ حیات تفصیل کے لحاظ سے متشابہات میں سے ہے اور اس کی کیفیت ہماری سمجھ سے بالاتر ہے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ۝ ﴾ ''لیکن تم نہیں سمجھتے۔''

البتہ اس قسم کی حیات عام ایمان والوں کے لیے بھی صحیح حدیث سے ثابت ہے جسے ابن کثیر رحمہ اللہ اور دیگر مفسرین نے روایت کیا ہے اگرچہ اس زندگی کے درجات میں تفاوت ہے۔ انبیاء علیہم السلام سب سے اعلیٰ درجے پر ہیں، پھر شہداء اور پھر عام مومنوں کا درجہ ہوگا۔

خلاصۂ بحث یہ ہے کہ مندرجہ بالا اکثر آیات ایسی ہیں کہ وہ اپنے عموم کی دلالت کی وجہ سے قبر کے عذاب، اس کی نعمتوں اور قبر کے علاوہ اس حالت کو بھی شامل ہیں جو موت سے لے کر قیامت تک ہے اور انھی عمومی حالات پر قرآن کریم نے برزخ کا اطلاق کیا

ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَمِنْ وَّرَآىِٕهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ۝﴾

''اور ان کے پیچھے قیامت کے روز تک ایک برزخ (پردہ) ہے۔''[1]

یعنی انسان مرنے کے بعد قبر میں دفن ہو یا اس کے بدن کے ذرات دنیا کے کسی حصے میں بھی ہوں اور روح جس مستقر میں بھی ہو تو وہ برزخ ہے اور برزخ کسی مکان کا نام نہیں بلکہ زمانے اور وقت کا نام ہے۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ ان آیات میں ان تینوں عقیدوں کی تردید ہے جو عذابِ قبر اور عذاب فی القبر (دنیاوی قبر میں عذاب) کا کسی طریقے سے بھی انکار کرتے ہیں۔ ان تمام مذکورہ آیات کے مقابلے میں صرف ایک آیت:

﴿يٰوَيْلَنَا مَنْۢ بَعَثَنَا مِنْ مَّرْقَدِنَا﴾

''ہائے افسوس! ہمیں کس نے ہماری خواب گاہوں سے جگا دیا۔''[2]

سے استدلال کرنا کہ قبر میں کوئی عذاب نہیں بلکہ وہاں سونا اور آرام کرنا ہے، غلط ہے کیونکہ یہی لوگ جب حشر کی ہولناکیاں دیکھیں گے تو وہ قبر انھیں حشر کے مقابلے میں خواب گاہ معلوم ہوگی۔ انسانی فطرت ہے کہ جب اس پر کوئی مصیبت آتی ہے اور پھر اس کے بعد کوئی بڑی مصیبت آجاتی ہے تو وہ پہلی مصیبت کو بھی نعمت سمجھتا ہے۔ اس کی مثال قرآن کریم میں موجود ہے کہ جب لوگ قیامت کے دن اٹھائے جائیں گے تو ان سے پوچھا جائے گا کہ تم نے دنیا اور قبر میں کتنی مدت گزاری تو وہ اپنے احساسات کے تفاوت کی وجہ سے مختلف جواب دیں گے، چنانچہ ان کے جواب کے متعلق ارشاد فرمایا گیا:

﴿يَّتَخَافَتُوْنَ بَيْنَهُمْ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا عَشْرًا۝ نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَقُوْلُوْنَ اِذْ يَقُوْلُ اَمْثَلُهُمْ طَرِيْقَةً اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا يَوْمًا۝﴾

[1] المؤمنون 100:23. [2] یٰسٓ 52:36.

’’وہ آپس میں چپکے چپکے باتیں کرتے ہوں گے کہ تم محض دس دن (دنیا میں) رہے ہو۔ جو کچھ وہ کہتے ہیں ہم اسے خوب جانتے ہیں جبکہ ان کا بہترین رائے والا کہے گا: تم تو محض ایک دن وہاں رہے ہو۔‘‘[1]

نیز فرمایا:

﴿ وَتَظُنُّونَ اِنۡ لَّبِثۡتُمۡ اِلَّا قَلِيۡلًا ۝ ﴾

’’اور تم خیال کرو گے کہ تم دنیا میں بہت ہی کم عرصہ ٹھہرے ہو۔‘‘[2]

نیز فرمایا:

﴿ قٰلَ اِنۡ لَّبِثۡتُمۡ اِلَّا قَلِيۡلًا ﴾

’’کہے گا: تم نے بہت تھوڑی مدت قیام کیا۔‘‘[3]

نیز فرمایا:

﴿ يُقۡسِمُ الۡمُجۡرِمُوۡنَ ۙ مَا لَبِثُوۡا غَيۡرَ سَاعَةٍ ﴾

’’گناہ گار قسمیں کھائیں گے کہ وہ ایک گھڑی سے زیادہ دنیا میں نہیں رہے۔‘‘[4]

نیز فرمایا:

﴿ وَيَوۡمَ يَحۡشُرُهُمۡ كَاَنۡ لَّمۡ يَلۡبَثُوۡۤا اِلَّا سَاعَةً مِّنَ النَّهَارِ يَتَعَارَفُوۡنَ بَيۡنَهُمۡ ﴾

’’اور جس دن وہ (اللہ تعالیٰ) ان کو جمع کرے گا (تو وہ سمجھیں گے کہ) گویا وہ (دنیا میں) دن کی ایک گھڑی سے زیادہ نہ رہے تھے اور وہ وہاں ایک دوسرے کو پہچانیں گے۔‘‘[5]

نیز فرمایا:

① طٰهٰ 104,103:20۔ ② بنيّ إسرآءيل 52:17۔ ③ المؤمنون 114:23۔ ④ الروم 55:30۔
⑤ يونس 45:10۔

﴿ كَأَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَ مَا يُوعَدُونَ لَمْ يَلْبَثُوا إِلَّا سَاعَةً مِّن نَّهَارٍ ﴾

''گویا کہ وہ (کافر) جس دن اس (عذاب) کو دیکھیں گے جس کا ان سے وعدہ کیا جاتا ہے (تو سمجھیں گے کہ) وہ تو (دنیا میں) دن کی ایک گھڑی بھر ہی رہے تھے۔''[1]

نیز فرمایا:

﴿ كَأَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَهَا لَمْ يَلْبَثُوا إِلَّا عَشِيَّةً أَوْ ضُحَاهَا ﴾

''جس دن وہ قیامت کو دیکھیں گے تو سمجھیں گے کہ گویا وہ دنیا میں صرف ایک شام یا ایک صبح ہی رہے ہیں۔''[2]

نیز فرمایا:

﴿ لَقَدْ لَبِثْتُمْ فِي كِتَابِ اللَّهِ إِلَىٰ يَوْمِ الْبَعْثِ ﴾

''تم اللہ کی کتاب کی رو سے روز قیامت تک ٹھہرے ہو۔''[3]

نیز فرمایا:

﴿ قَالُوا لَبِثْنَا يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ﴾

''وہ کہیں گے کہ ہم ایک دن یا ایک دن سے بھی کم رہے ہیں۔''[4]

گناہ گاروں کے یہ مختلف گمان روز حشر کی ہولنا کی کی وجہ سے ہوں گے۔ جس پر زیادہ خوف ہوگا اس کے نزدیک یہ ٹھہرنا اور قیام بہت کم ہوگا اور جس کو سمجھ کم ہے اس کے نزدیک یہ قیام دس دن رات ہے، پھر ان کے اندر بھی مختلف درجات ہیں لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ فیصلہ ہے:

﴿ لَقَدْ لَبِثْتُمْ فِي كِتَابِ اللَّهِ إِلَىٰ يَوْمِ الْبَعْثِ ﴾

[1] الأحقاف 35:46. [2] النازعات 46:79. [3] الروم 56:30. [4] المؤمنون 113:23.

”تم اللہ کی کتاب کی رو سے روز قیامت تک ٹھہرے ہو۔“[1]

اور یہ ٹھہرنا حشر کی نسبت تھوڑا ہے، اسی لیے فرمایا:

﴿قٰلَ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا لَّوْ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴾

”اللہ فرمائے گا: واقعی تم نے (وہاں) بہت کم مدت قیام کیا ہے، کاش! تم (دنیا میں یہ بات) جانتے ہوتے۔“[2]

یہ قیام دنیوی زندگی اور برزخی حالات دونوں کو شامل ہے جو قیامت کی نسبت بہت کم ہے۔ پس ان آیات سے ثابت ہوا کہ انسان کو بڑی مصیبت آنے پر چھوٹی مصیبت محسوس نہیں ہوتی، اسی لیے گناہ گار قیامت کی ہولناکیاں دیکھ کر قبر کی حالت کو مرقد (خواب گاہ) کہیں گے اور قبر کو مرقد کہنے کے متعلق مفسرین کے اور اقوال بھی ہیں۔

اثباتِ عذابِ قبر اور احوالِ برزخ

منکرینِ حدیث کے اس سوال کا جواب پیش خدمت ہے جس میں انھوں نے مندرجہ ذیل آیات سے استدلال کیا ہے۔ فرمان الٰہی ہے:

”تم لوگ اللہ کا کیونکر انکار کرتے ہو، حالانکہ تم بے جان تھے، اس نے تمھیں زندہ کیا، پھر تم پر موت طاری کرے گا، پھر زندہ کرے گا، پھر تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔“[3]

نیز فرمایا:

”وہ کہیں گے: ہمارے پروردگار! تو نے ہمیں دو دفعہ مارا اور دو دفعہ زندہ کیا، ہم نے اپنے گناہوں کا اعتراف کیا۔“[4]

[1] الروم 56:30. [2] المؤمنون 114:23. [3] البقرة 28:2. [4] المؤمن 11:40.

مفصل جواب: اللہ تعالیٰ نے تین دفعہ حیات حقیقی عطا فرمائی۔ سورۂ بقرہ میں اس قسم کے پانچ واقعات مذکور ہیں۔

﴿ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ﴾

''پھر ہم نے تمھاری موت کے بعد تمھیں زندہ کیا تاکہ تم شکر بجالاؤ۔''[1]

اس واقعے میں ان پر عقوبتی موت نازل ہوئی، پھر نبی (موسیٰ علیہ السلام) کی دعا کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے انھیں زندہ کردیا، پھر اس کے بعد انھوں نے موت مؤجل سے وفات پائی۔

نیز فرمایا:

﴿فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا ۭ كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى ۙ وَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ﴾

''پس ہم نے کہا: اس (مقتول) کو اس کا ایک ٹکڑا مارو، اسی طرح اللہ مردوں کو زندہ کرتا ہے اور تمھیں اپنی نشانیاں دکھاتا ہے تاکہ تم سمجھو۔''[2]

اس واقعے میں مقتول اپنی موت مؤجل سے فوت ہوا تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے اسے کچھ وقت کے لیے زندہ کیا، اس نے اپنے قاتل کے بارے میں بتادیا اور پھر مرگیا۔

نیز فرمایا:

﴿فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا ۣ ثُمَّ اَحْيَاهُمْ﴾

''پس اللہ نے انھیں حکم دیا کہ مرجاؤ۔ (وہ مرگئے تو) پھر انھیں زندہ کیا۔''[3]

اس واقعے میں وہ قوم عقوبتی (سزا والی) موت مری تھی، پھر ان کے نبی نے دعا کی تو اللہ نے انھیں زندہ کردیا۔

نیز فرمایا:

[1] البقرة 2:56. [2] البقرة 2:73. [3] البقرة 2:243.

﴿فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهٗ ؕ قَالَ كَمْ لَبِثْتَ ؕ قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ؕ قَالَ بَلْ لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ﴾

''پس اللہ نے اسے سو سال تک مردہ رکھا، پھر اسے زندہ کیا اور پوچھا کہ تم اس حالت میں کتنا عرصہ رہے، اس نے کہا: ایک دن یا دن کا کچھ حصہ، فرمایا: نہیں، بلکہ تم سو سال تک رہے ہو۔''[1]

اس قصے میں اس شخص کا واقعہ نقل کیا گیا ہے جسے اکثر روایات میں عزیر علیہ السلام کہا گیا ہے۔ وہ خرق عادت فوت ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ نے سو سال تک اسے محفوظ رکھا، پھر اللہ تعالیٰ نے اسے زندہ کر دیا لیکن اسے اس مدت کا علم نہیں تھا۔ اس نے اپنے علم کے مطابق کہا کہ وہ ایک دن یا دن کا کچھ حصہ ٹھہرا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے بتایا کہ تم سو سال تک اس حالت میں ٹھہرے ہو اور اسی طرح اس واقعے میں گدھے کے مرنے اور اس کے دوبارہ زندہ کرنے کا تذکرہ ہے۔

اور ایک جگہ ارشاد ہے:

﴿قَالَ فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ اِلَيْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰى كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ يَاْتِيْنَكَ سَعْيًا﴾

''فرمایا: کوئی سے چار پرندے لے لو اور انھیں اپنے آپ سے مانوس کر لو اور پھر ان میں سے ایک ایک ٹکڑا پہاڑوں پر رکھ دو، پھر انھیں بلاؤ تو وہ تمھاری طرف بھاگتے چلے آئیں گے۔''[2]

اس واقعے میں بھی چار پرندوں کو ذبح کرنا، ان کے ٹکڑوں کو پہاڑوں پر رکھنا، ابراہیم علیہ السلام کی پکار پر ان کا زندہ ہو کر دوڑتے ہوئے ان کی طرف آنا مذکور ہے۔

[1] البقرة 2:259۔ [2] البقرة 2:260۔

اسی طرح عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات ہیں۔

فرمایا:

﴿ وَاُحۡیِ الۡمَوۡتٰی بِاِذۡنِ اللّٰہِ ﴾

''میں اللہ کے حکم سے مردوں کو زندہ کر دیتا ہوں۔''[1]

نیز فرمایا:

﴿ وَاِذۡ تُخۡرِجُ الۡمَوۡتٰی بِاِذۡنِیۡ ﴾

''اور جب میرے حکم سے تم مردوں کو (قبروں سے) نکال کھڑا کرتے تھے۔''[2]

ان تمام آیات سے صراحتاً ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے استثنائی صورت میں بعض لوگوں اور بعض حیوانوں کو دنیا میں فوت کر دینے کے بعد دوبارہ زندہ کیا۔ ان آیات کی دور از کار تاویل کرنے والے اللہ تعالیٰ کی قدرت کے منکر معلوم ہوتے ہیں جیسا کہ منکرینِ حدیث نے اس کی مختلف تاویلیں کی ہیں۔

ایک واقعہ: ایک دفعہ رشکئی مردان میں میرا درس قرآن رکھا گیا۔ وہاں کسی شخص نے سوال کیا کہ قانون الٰہی کے مطابق ایک مرتبہ موت اور پھر بعث بعد الموت حق ہے تو یہ مذکورہ بالا واقعات کیسے مان لیے جائیں جو اس قانون الٰہی کے خلاف ہیں۔ میں نے جواب دیا کہ آپ بعث بعد الموت کو قرآن کریم کی آیات سے تسلیم کرتے ہیں یا کسی اور چیز سے؟ اس نے کہا: میں یہ عقیدہ (بعث بعد الموت) قرآن کریم سے مانتا ہوں تو میں نے کہا: یہ قصے بھی تو قرآن کریم کی آیات ہیں، انھیں کیوں نہیں مانتے، تو یہ سن کر وہ خاموش ہو گیا۔

مذکورہ بالا منکرینِ عذابِ قبر میں سے تیسرا فریق عذاب قبر کو عذاب برزخ کی تعبیر کر کے

[1] آل عمرٰن 49:3. [2] المآئدة 110:5.

مانتا ہے جبکہ وہ عذاب فی القبر (دنیاوی قبر میں عذاب) کو بالکل نہیں مانتا۔ وہ اپنے موقف میں کوئی دلیل پیش نہیں کرسکتا۔ اسے چاہیے کہ وہ مذکورہ آیات پر غور وفکر کرے وہ عذاب فی القبر اور عذابِ قبر (بمعنی برزخ) دونوں کوشامل ہیں جبکہ عذاب فی القبر (دنیاوی قبر میں عذاب) کے بارے میں صحیح احادیث میں تصریح موجود ہے۔ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں: نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ یا مکہ کے کسی باغ کے پاس سے گزرے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوانسانوں کی آوازسنی جنھیں ان کی قبر میں عذاب دیا جارہا تھا، تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«يُعَذَّبَانِ وَمَا يُعَذَّبَانِ فِي كَبِيرٍ»

''ان دونوں کو عذاب دیا جارہا ہے اورانھیں کسی کبیرہ گناہ کی وجہ سے عذاب نہیں دیا جارہا۔''[1]

براء بن عازب رضی اللہ عنہما نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا:

«إِذَا أُقْعِدَ الْمُؤْمِنُ فِي قَبْرِهِ»

''جب مومن کواس کی قبر میں بٹھایا جاتا ہے۔''[2]

ابوایوب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

«خَرَجَ النَّبِيُّ ﷺ وَقَدْ وَجَبَتِ الشَّمْسُ فَسَمِعَ صَوْتًا فَقَالَ: يَهُودُ تُعَذَّبُ فِي قُبُورِهَا»

''نبی صلی اللہ علیہ وسلم باہر تشریف لائے تو سورج غروب ہوچکا تھا، آپ نے کوئی آوازسنی تو فرمایا: ''یہودیوں کوان کی قبروں میں عذاب دیا جارہا ہے۔''[3]

① صحيح البخاري، الوضوء، باب من الكبائر أن لا يستتر من بوله، حديث: 216. ② صحيح البخاري، الجنائز، باب ماجاء في عذاب القبر، حديث: 1369. ③ صحيح البخاري، الجنائز، باب التعوذ من عذاب القبر، حديث: 1375.

اس قسم کی اور بھی احادیث صحیحہ موجود ہیں اور ان احادیث میں لفظ فِي قُبُورِهِمَا، فِي قَبْرِهِ اور فِي قُبُورِهَا اس بات کی صریح دلیل ہے کہ عذاب قبر کے اندر ہو رہا ہے۔ جو لوگ عذاب فی القبر کا انکار کرتے ہیں، وہ ان احادیث کی بلاضرورت تاویل کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں: یہاں فِي الْقَبْرِ سے فِي الْبَرْزَخِ مراد ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اگر کسی ایک حدیث میں "فِي الْبَرْزَخِ" کے الفاظ ہوتے تو پھر باقی احادیث میں لفظ فِي القبر کی تاویل کرنے کی گنجائش تھی۔

اٹھارہواں شبہ: تعدد ازواج

پرویز صاحب نے کہا ہے: قرآن عام حالات میں صرف ایک بیوی کی اجازت دیتا ہے۔ اگر بیوی سے نباہ کی کوئی صورت باقی نہ رہے تو مرد طلاق کے بعد دوسری شادی کرسکتا ہے، اس کی موجودگی میں نہیں، دلیل:

﴿ وَإِنْ أَرَدتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ وَآتَيْتُمْ إِحْدَاهُنَّ قِنطَارًا ﴾

"اور اگر ایک بیوی کی جگہ دوسری بیوی لانے کا ارادہ ہو اور تم نے ان میں کسی ایک کو دولت کا ڈھیر بھی دے دیا ہو۔" (صحیح ترجمہ) [1]

پرویزی ترجمہ:

"اگر تم ایک بیوی کی جگہ دوسری بیوی سے نکاح کرنا چاہتے ہو تو پہلی بیوی کا مہر پورا پورا ادا کرو اور پھر اس کی جگہ دوسری بیوی لاؤ۔"

اس سے بالکل واضح ہے کہ ایک بیوی کی جگہ دوسری آسکتی ہے اس کی موجودگی میں نہیں۔ [2]

[1] النسآء 4:20. [2] طاہرہ کے نام خطوط، ص: 313-318، وقرآنی فیصلے، ص: 147.

دوسرا استدلال

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تُقْسِطُوا فِي الْيَتَامَىٰ فَانكِحُوا مَا طَابَ لَكُم مِّنَ النِّسَاءِ مَثْنَىٰ وَثُلَاثَ وَرُبَاعَ ۖ فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تَعْدِلُوا فَوَاحِدَةً أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ ﴾

''اور اگر تمھیں اندیشہ ہو کہ تم یتیم عورتوں کے حق میں انصاف نہ کرسکو گے تو ان کو چھوڑ کر اور جو تمھیں اچھی لگیں، ان میں سے دو دو، تین تین، چار چار نکاح میں لے آؤ، پھر اگر تمھیں خوف ہو کہ تم انصاف نہ کرسکو گے تو پھر ایک ہی بیوی پر اکتفا کرو یا لونڈی پر جو تمھارے قبضے میں ہو۔''[1]

اس آیت کے پہلے حصے کے متعلق لکھا ہے:

''مطلب صاف ہے کہ اگر کسی ہنگامی حالت، مثلاً: جنگ کے بعد جب جوان مرد بڑی تعداد میں ضائع ہوچکے ہوں، ایسی صورت پیدا ہوجائے کہ معاشرہ میں یتیم بچے اور لاوارث جوان عورتیں بغیر شوہروں کے رہ جائیں اس کا کیا علاج کیا جائے، اس ہنگامی صورت سے عہدہ برآ ہونے کے لیے اس کی اجازت دی جاتی ہے کہ تعدد ازواج، یعنی ایک بیوی کے قانون میں عارضی طور پر لچک پیدا کرلی جائے۔''[2]

ان تحریروں سے یہ نتیجہ نکلا کہ یتیموں کی عدم موجودگی میں ایک سے زیادہ عورتوں سے نکاح کی اجازت نہیں۔

پہلی آیت سے ایک بیوی کے ساتھ نکاح پر انحصار کرنے کے لیے پرویز صاحب کی تفسیر سراسر جہالت پر مبنی ہے کیونکہ آیت میں لفظ ﴿إِحْدَاهُنَّ﴾ میں ضمیر جمع مؤنث سے

① النسآء 4:3. ② طاہرہ کے نام خطوط، ص: 315.

صاف واضح ہوتا ہے کہ اس شخص کے پاس ایک سے زیادہ بیویاں ہیں لیکن وہ ان میں سے کسی ایک کو بدلنا چاہتا ہے۔ اگر آیت میں ایک بیوی کی بات ہوتی تو وہاں واحد مؤنث کی ضمیر ہوتی اور یہ لفظ ہوتا وَاٰتَيْتُم إِيَّاهَا اور تم نے اس ایک بیوی کو خزانہ دیا ہو تو اس آیت سے تو تعدد ازواج کا جواز معلوم ہوتا ہے نہ کہ ممانعت۔

نوٹ : اس آیت میں استبدال (بیوی تبدیل کرنے) کی قید اس وجہ سے بڑھائی کہ جب کوئی شخص اپنی بیویوں میں سے کسی ایک کو اس لیے طلاق دینا چاہتا ہے کہ وہ دوسری شادی کرلے اور وہ دوسری شادی کرنے کے لیے پہلی بیوی کو دیا ہوا مہر واپس لینا چاہتا ہے تو اس صورت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ایسا کرنا جائز نہیں۔ مہر واپس کرنے کی شدید ممانعت کی وجہ سے استبدال کا لفظ استعمال فرمایا، اس لیے نہیں کہ پہلی بیوی کی موجودگی میں دوسری بیوی لانا جائز نہیں۔ پرویز صاحب کی یہ تفسیر سراسر تحریف معنوی ہے۔

دوسری آیت سے استدلال بھی درست نہیں ہے کیونکہ:

1 مذکورہ آیت سے پہلی آیت میں یتیموں کے مال حرام طریقے سے حاصل کرنے سے منع فرمایا تاکہ وہ ظلم سے بچ جائیں۔ اب اس آیت میں نکاح کے ذریعے سے یتیم لڑکیوں پر ظلم کرنے سے منع فرمایا ہے۔ وہ اس طرح کہ اگر تمھیں یتیم لڑکیوں سے نکاح کرکے ان پر ظلم کرنے کا اندیشہ ہو تو پھر ان کے بجائے دوسری عورتوں سے نکاح کرلو کیونکہ ان عورتوں کے والدین اور سرپرست ہیں، اس لیے تم ان پر ظلم کرنے سے ڈرتے ہو جبکہ یتیم بچیاں بے سہارا ہیں، اس لیے تمھیں ان کے سرپرستوں کی طرف سے کسی قسم کا اندیشہ نہیں، لہٰذا احتیاط کے طور پر ان سے نکاح کرنے سے بچو، یہ تفسیر امام بخاری رحمہ اللہ نے عائشہ رضی اللہ عنہا سے نقل کی ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ اگر یہاں یتیم لڑکیوں سے نکاح کرنا مراد ہوتا تو ﴿النِّسَآءِ﴾ کی جگہ اَلْيَتَامٰى یا اس کی ضمیر مِنْهُنَّ ہونی چاہیے تھی لیکن

﴿النِّسَآءِ﴾ کی صراحت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے غیر یتیم لڑکیاں مراد ہیں۔

② پرویز صاحب نے ایک سے زائد بیوی کے لیے یتیموں کی کثرت کو شرط قرار دیا ہے اور اسے ہنگامی حالت کا نام دیا ہے یہ ان کی خود ساختہ شرائط ہیں۔ آیت میں یتیموں کی کثرت کا ذکر ہے نہ ہنگامی حالت کا۔

③ ہم کہتے ہیں کہ قرآن نے یتیموں کی کثرت کی شرط عائد نہیں کی ہے بلکہ یتیموں کے بارے میں ﴿وَإِنْ خِفْتُمْ﴾ کے ساتھ انصاف نہ کرنے کے خوف کی شرط عائد کی ہے اور یہ شرط بھی شرطِ لازم نہیں کیونکہ ہر جگہ شرط لازم نہیں ہوتی، مثلاً: فرمان الٰہی ہے:

﴿وَلَا تُكْرِهُوا فَتَيٰتِكُمْ عَلَى الْبِغَآءِ إِنْ أَرَدْنَ تَحَصُّنًا﴾

''اور اپنی لونڈیوں کو زنا کاری پر مجبور نہ کرو اگر وہ پاک باز رہنا چاہتی ہیں۔''[1]

اس آیت میں ''اگر وہ پاک باز رہنا چاہتی ہیں۔'' بالاتفاق شرط لازم نہیں کیونکہ اگر وہ لونڈیاں پاک بازی کا ارادہ نہ بھی رکھتی ہوں تب بھی انھیں زنا پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَبُعُولَتُهُنَّ أَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِي ذٰلِكَ إِنْ أَرَادُوا إِصْلَاحًا﴾

''اور اگر وہ اس دوران میں صلح صفائی کرنا چاہیں تو ان کے شوہروں کو انھیں زوجیت میں واپس لینے کا زیادہ حق ہے۔''[2]

اس آیت میں اصلاح کی شرط لازم نہیں کیونکہ خاوند رجوع کرنے کا ہر وقت حق دار ہے، خواہ وہ اصلاح کا ارادہ کرے یا نہ کرے۔

اس بنا پر اس آیت سے یہ مراد ہے کہ اگر تمھیں خوف ہو کہ یتیم لڑکیوں کے بارے میں تم انصاف نہیں کر سکو گے تو ان کے علاوہ عورتوں سے نکاح کرو جو تمھیں اچھی لگیں۔ اگر

---

① النور 33:24. ② البقرة 228:2.

ایک آدمی کو یتیم لڑکیوں کے بارے بے انصافی کا خوف نہ ہو تو اس کے لیے یتیم اور غیر یتیم عورتوں سے نکاح کرنے کی اجازت بطریق اولیٰ ہے۔

تعدد ازواج کے اثبات پر قرآنی دلائل

نبی ﷺ کا تعدد ازواج قرآن کریم کی بیشتر آیات سے ثابت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَاَزْوَاجُهٗۤ اُمَّهٰتُهُمْ ﴾

''مومنوں پر نبی (ﷺ) ان کی اپنی جانوں سے بھی زیادہ حق رکھتا ہے، اوراس کی بیویاں ان (مومنوں) کی مائیں ہیں۔''[1]

نیز فرمایا:

﴿ وَمَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُؤْذُوْا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَلَاۤ اَنْ تَنْكِحُوْۤا اَزْوَاجَهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖۤ اَبَدًا ﴾

''اور تمھارے لیے جائز نہیں کہ تم اللہ کے رسول کو ایذا دو، اور نہ یہ جائز ہے کہ اس کے بعد کبھی اس کی ازواج مطہرات سے نکاح کرو۔''[2]

نیز فرمایا:

﴿ یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ اِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا وَزِیْنَتَهَا ﴾

''اے نبی! اپنی ازواج مطہرات سے کہہ دیجیے کہ اگر تم دنیا کی زندگی اوراس کے ساز وسامان کی طلب گار ہو۔''[3]

نیز فرمایا:

﴿ یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ اِنَّاۤ اَحْلَلْنَا لَكَ اَزْوَاجَكَ الّٰتِیْۤ اٰتَیْتَ اُجُوْرَهُنَّ ﴾

''اے نبی! ہم نے آپ کے لیے وہ بیویاں حلال کر دی ہیں جن کے مہر آپ نے

[1] الأحزاب 6:33. [2] الأحزاب 53:33. [3] الأحزاب 28:33.

ادا کر دیے ہیں۔‘‘ (1)

نیز فرمایا:

﴿ يَاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَبَنٰتِكَ وَنِسَآءِ الْمُؤْمِنِيْنَ يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ ﴾

’’اے نبی! اپنی بیویوں، اپنی بیٹیوں اور مسلمانوں کی عورتوں سے کہہ دیجیے کہ وہ اپنے اوپر اپنی چادریں لٹکا لیا کریں۔‘‘ (2)

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ يَاَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ ۚ تَبْتَغِيْ مَرْضَاتَ اَزْوَاجِكَ ﴾

’’اے نبی! اللہ نے جو چیز آپ کے لیے حلال کی ہے آپ اسے حرام کیوں ٹھہراتے ہیں، آپ اپنی بیویوں کی خوشنودی چاہتے ہیں۔‘‘ (3)

نیز فرمایا:

﴿ عَسٰى رَبُّهٗٓ اِنْ طَلَّقَكُنَّ اَنْ يُّبْدِلَهٗٓ اَزْوَاجًا خَيْرًا مِّنْكُنَّ ﴾

’’اگر وہ (نبی) تمھیں طلاق دے دے تو امید ہے کہ اس کا رب اسے تم سے بہتر بیویاں بدلے میں دے۔‘‘ (4)

ان تمام آیات سے صراحت کے ساتھ ثابت ہے کہ نبی ﷺ کی ایک وقت میں ایک سے زیادہ ازواج مطہرات تھیں۔ جمع کا صیغہ تین اوراس سے زائد پر دلالت کرتا ہے اور یہ بات احادیث کی نہیں کہ پرویز صاحب اسے تاریخ اور ظن وگمان کا نام دے کر انکار کرسکیں، یہ قرآن کریم کی آیات ہیں۔

اب ہم وہ آیات پیش کرتے ہیں جن سے امت کے لیے تعدد ازواج کا ثبوت ملتا ہے۔

(1) الأحزاب 50:33. (2) الأحزاب 59:33. (3) التحریم 1:66. (4) التحریم 5:66.

﴿ وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ أَزْوَاجُكُمْ إِن لَّمْ يَكُن لَّهُنَّ وَلَدٌ ﴾

”اور جو کچھ تمھاری بیویاں ترکہ میں چھوڑ جائیں اس میں سے نصف کے تم حق دار ہو، بشرطیکہ ان سے اولاد نہ ہو۔“[1]

نیز فرمایا:

﴿ وَالَّذِينَ يُتَوَفَّوْنَ مِنكُمْ وَيَذَرُونَ أَزْوَاجًا ﴾

”اور تم میں سے جو لوگ فوت ہو جائیں اور بیویاں چھوڑ جائیں۔“[2]

نیز فرمایا:

﴿ إِلَّا عَلَىٰ أَزْوَاجِهِمْ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ ﴾

”مگر اپنی بیویوں یا اپنی لونڈیوں سے۔“[3]

نیز فرمایا:

﴿ فَانكِحُوهُنَّ بِإِذْنِ أَهْلِهِنَّ ﴾

”تو تم ان کے مالکوں کی اجازت سے ان سے نکاح کر لو۔“[4]

نیز فرمایا:

﴿ إِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنَاتِ ثُمَّ طَلَّقْتُمُوهُنَّ ﴾

”جب تم مومن عورتوں کو نکاح میں لاؤ اور پھر انھیں طلاق دے دو۔“[5]

نیز فرمایا:

﴿ وَمَن لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنكُمْ طَوْلًا أَن يَنكِحَ الْمُحْصَنَاتِ الْمُؤْمِنَاتِ فَمِن مَّا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُم ﴾

”اور تم میں سے جو شخص آزاد مومن عورتوں سے نکاح کرنے کی طاقت نہ رکھتا ہو،

[1] النسآء 4:12. [2] البقرة 2:234. [3] المؤمنون 23:6. [4] النسآء 4:25. [5] الأحزاب 33:49.

وہ تمھاری ملکیت مومن لونڈیوں میں سے کسی لونڈی سے نکاح کرلے۔'' [1]

مذکورہ بالا آیات میں اگرچہ جمع بمقابلۂ جمع ہے لیکن اس کے باوجود عموم کی وجہ سے ان سے تعدد ازواج کا ثبوت ملتا ہے۔ اوراس تعدد ازواج کے عموم کی تخصیص سورۂ نساء کی آیت نمبر 3 کے مطابق چار تک ہوگی۔

تبصرہ: پرویز صاحب کی قرآنی بصیرت دراصل اس مغربی تخیل کی پیداوار ہے جس میں ایک سے زائد بیویوں سے نکاح کو مذموم سمجھا جاتا ہے۔ اسلام نے ایک سے چار تک بیویوں سے نکاح کی اجازت دی ہے لیکن ایک سے زائد کی اجازت عدل کے ساتھ مشروط ہے۔ اگر کوئی شخص عدل کے تقاضے پورے کرسکتا ہے تو وہ ایک سے زائد، یعنی چار تک شادیاں کرسکتا ہے اور یہ اجازت ہے حکم نہیں۔ قرآن کریم کی ہر اجازت کسی خاص زمان ومکان کے لیے نہیں بلکہ قیامت تک کے لیے عام ہے۔

اگر حقیقی طور پر اندازہ لگایا جائے تو ایک شادی کی پابندی اور تعدد ازواج کو برا سمجھنا بدکاری کا ذریعہ بنتا ہے یہاں تک کہ لوگ جنسی آوارگی میں مبتلا ہوجاتے ہیں جیسا کہ مغربی تہذیب میں یہ بالکل واضح اور عام ہے جبکہ اسلام عفت و پاک دامنی اور نسب کی حفاظت کا درس دیتا ہے اور ہر قسم کی بدکاری وفحاشی سے اجتناب کی ترغیب دیتا ہے۔ تعدد ازواج اس کا اصل وسیلہ اور ذریعہ ہے۔

انیسواں شبہ: سن بلوغ سے پہلے نکاح

اس کے متعلق پرویز اوراس کے ہم نواؤں کے شبہے کا تجزیہ حسب ذیل ہے:

1 قرآن کریم نے بلوغت کو سن نکاح سے تعبیر کیا ہے۔ قرآن کریم میں ہے کہ جب کوئی

[1] النسآء 25:4.

بچے یتیم رہ جائیں تو تم معاملات کے ذریعے سے ان کا امتحان لو۔

﴿حَتّٰۤى اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ﴾

''حتی کہ وہ نکاح کی عمر کو پہنچیں۔''[1]

2 قرآن کریم نے نکاح کو معاہدہ قرار دیا ہے اور معاہدے میں فریقین کی رضامندی اور بالغ ہونا شرط ہے۔ نکاح کی رضامندی کے لیے پرویز صاحب نے (قرآنی فیصلے، ص: 134 میں) یہ دلیل پیش کی ہے۔

﴿لَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرْهًا﴾

''تمھارے لیے حلال نہیں کہ تم عورتوں کو میراث سمجھ کر ان پر زبردستی قبضہ کرلو۔''[2]

3 طبی نقطۂ نگاہ سے بھی نابالغ بچی قابل مجامعت نہیں۔ اس سے مجامعت ضرر انگیز ہے اور کئی جسمانی عوارض کا پیش خیمہ ہوسکتی ہے۔

جواب سن بلوغ سے پہلے نکاح کے جواز کو ہم قرآن کریم سے ثابت کرتے ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ مُّحْصِنِيْنَ﴾

''اور ان کے علاوہ جو عورتیں ہیں، وہ تمھارے لیے حلال کردی گئی ہیں (شرط یہ ہے) کہ تم اپنے مال (مہر) کے بدلے انھیں حاصل کر کے پاک دامنی کے لیے ان سے نکاح کرو۔''[3]

﴿مَا وَرَآءَ ذٰلِكَ﴾ ''جو اس کے علاوہ ہے۔'' اس لفظ کے عموم کے تحت نابالغ لڑکی بھی شامل ہے، اس کی تخصیص کے لیے کوئی صحیح اور صریح دلیل موجود نہیں۔

نیز فرمایا:

[1] النسآء 6:4. [2] النسآء 19:4. [3] النسآء 24:4.

﴿ وَأَنكِحُوا الْأَيَامَىٰ مِنكُمْ ﴾

''تم اپنے میں سے جو بے نکاح ہیں ان کے نکاح کرو۔''[1]

أَيَامىٰ جمع ہے أَيِّمٌ کی اور أَيِّمٌ ہر اس مرد کو کہتے ہیں جس کی بیوی نہ ہو اور اسی طرح ہر اس عورت کو کہتے ہیں جس کا شوہر نہ ہو اور یہ بھی عام ہے، اس میں بالغ و نابالغ کی کوئی تخصیص نہیں۔

نیز فرمایا:

﴿ وَاللَّائِي يَئِسْنَ مِنَ الْمَحِيضِ مِن نِّسَائِكُمْ إِنِ ارْتَبْتُمْ فَعِدَّتُهُنَّ ثَلَاثَةُ أَشْهُرٍ وَاللَّائِي لَمْ يَحِضْنَ ﴾

''اور تمھاری عورتوں میں سے جو حیض سے ناامید ہو چکیں۔ اگر تم کو شک ہو تو ان کی عدت تین ماہ ہے اور اسی طرح وہ عورتیں بھی جنھیں حیض نہیں آتا۔''[2]

اس آیت میں عدت کی ایک قسم بیان کی ہے جو تین ماہ گزارنا ہے اور یہ دو قسم کی بیویوں کے لیے ہے۔ ایک وہ جو بوڑھی ہو جائے اور بڑھاپے کی وجہ سے اس کا حیض منقطع ہو جائے اسے عربی میں ''آيِسَة'' کہتے ہیں۔ دوسری وہ بیوی جسے عدم بلوغت کی وجہ سے ابھی تک حیض شروع نہیں ہوا۔ مذکورہ آیت میں عدت طلاق کا مسئلہ ہے، یعنی نکاح کے بعد طلاق دی گئی ہے اور طلاق کے بعد اب عدت گزارنی ہے۔ یہ بات ثابت ہے کہ طلاق کے جواز کے لیے ضروری ہے کہ پہلے نکاح ہوا ہو، لہٰذا اس آیت سے سن بلوغت سے پہلے نکاح کا جواز ثابت ہوتا ہے۔

بعض متجاہل قسم کے لوگوں نے ﴿ لَمْ يَحِضْنَ ﴾ کے متعلق لکھا ہے کہ اس سے وہ عورتیں مراد ہیں جو بالغ ہوں لیکن کسی عارضے کی وجہ سے انھیں حیض نہیں آتا تو اس سے

[1] النور 32:24. [2] الطلاق 4:65.

نابالغ بچی کے نکاح کے جواز پر استدلال کرنا صحیح نہیں۔

جواب ① یہ تحریف معنوی ہے، عربی گرامر کے بالکل خلاف ہے۔ عربیت کا قانون یہ ہے کہ حرف لَمْ جب فعل مضارع میں داخل ہو جائے تو وہ اس فعل مضارع کو فعل ماضی کے معنی میں بدل دیتا ہے۔ تو پھر ﴿ لَمْ يَحِضْنَ ﴾ کا معنی یہ ہے کہ ''انھیں حیض نہیں آیا'' اردو مفسرین نے اسی قسم کا معنی کیا ہے۔ شاہ رفیع الدین نے فرمایا: ''اور وہ جو کہ حائض نہیں ہوئی۔'' فتح الحمید میں ہے: ''جن کو ابھی حیض نہیں آنے لگا۔'' اور تفہیم القرآن میں ہے: ''اور یہی حکم ان کا ہے جنھیں ابھی حیض نہ آیا ہو۔'' اس مفہوم کے اور بھی شواہد ہیں جبکہ اس اعتراض میں جس ترجمے کا ذکر ہے، اس کے لیے اردو تراجم میں کوئی شہادت نہیں ملتی، چنانچہ ''حیض نہیں آیا'' کا صاف مطلب یہ ہے کہ وہ نابالغ ہے۔

② اگر وہی معنی تسلیم کرلیا جائے جو سوال میں مذکور ہے تو پھر آیت کا یہ ٹکڑا ﴿ لَمْ يَحِضْنَ ﴾ تین قسم کی عورتوں کو عام ہے۔

- نابالغ ہونے کی وجہ سے حیض نہ آتا ہو
- کسی بیماری کی وجہ سے کافی عرصہ حیض نہ آنا
- ساری عمر حیض نہ آنا

تو عموم کی وجہ سے پہلی قسم کو بھی محیط ہے تو پھر بھی آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ نابالغ لڑکی سے نکاح کرنا جائز ہے۔ قرآن سے استدلال کے تذکرے کے بعد ہم ان کے شبہات کے جوابات کی طرف آتے ہیں۔ ان کے شبہات مع جوابات مندرجہ ذیل ہیں:

[1] ان کا پہلا استدلال ﴿ حَتَّىٰٓ إِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ ﴾ ''حتی کہ وہ نکاح کی عمر (بلوغت) کو پہنچ جائیں۔'' سے ہے۔

- اس استدلال کا جواب یہ ہے کہ اس آیت سے یہ قانون ثابت نہیں ہوتا کہ نکاح کے

لیے بلوغت شرط ہے بلکہ آیت کا مقصد یہ ہے کہ جب انسان بالغ ہوکر اپنی مرضی سے نکاح کرنا چاہتا ہے تو اس وقت اس کے لیے مال کی ضرورت پڑتی ہے تو دانش مندی معلوم کرنے کے بعد اس کا مال اس کے حوالے کردو، یعنی ﴿النِّكَاحَ﴾ میں الف لام عہدی ہے۔اس نکاح سے مراد وہ ہے جو سورۂ نساء کی آیت:3 میں امر کے صیغے سے مذکور ہے، یعنی اس سے مراد اپنی مرضی سے نکاح کرنا ہے۔

❁ اس کا یہ جواب بھی ہوسکتا ہے کہ قرآن کریم بعض اوقات جو شرط لگاتا ہے وہ لازمی نہیں ہوتی بلکہ کسی خاص فائدے کے لیے بیان کی جاتی ہے۔یہاں بھی فائدہ یہ ہے کہ جب انسان بالغ ہوجائے تو اسے نکاح کی ضرورت ہوتی ہے، اس کے لیے مال کی ضرورت ہوتی ہے لیکن اگر بالغ ہوجائے اور وہ نکاح نہ کرنا چاہے تو اس کی صلاحیت کا امتحان لینے کے بعد اس کا مال اسے دے دیا جاتا ہے۔

❁ یہاں لفظ نکاح سے لغوی معنی مراد ہے، یعنی جماع کرنا، اوراس قید کا فائدہ یہ ہے کہ جب انسان میں قوت شہوانیہ پیدا ہوتی ہے تو اس میں قوتِ حفاظتِ مال ضرور آجاتی ہے۔

2 نکاح معاہدہ ہے اور معاہدے میں فریقین کی رضامندی شرط ہے اور رضا کے لیے بلوغت ضروری ہے۔

یہ صحیح ہے کہ انعقاد نکاح کے لیے عاقدین کی رضامندی ضروری ہے لیکن رضامندی کی دو قسمیں ہیں۔ 1 بذات خود بشرطیکہ فریقین میں اہلیت ہو۔ 2 بواسطہ وکیل، متولی و نائب وغیرہ۔ پوری دنیا میں عقود، خرید و فروخت، ملازمت اور نوکری وغیرہ کے انعقاد کے لیے دونوں طریقے جاری ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿فَإِنْ كَانَ الَّذِي عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيهًا أَوْ ضَعِيفًا أَوْ لَا يَسْتَطِيعُ أَنْ يُمِلَّ هُوَ فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهُ بِالْعَدْلِ﴾

”اگر وہ شخص کہ جس کے ذمے حق ہے، نادان یا کمزور ہو یا خود لکھوانے کی طاقت نہ رکھتا ہو تو چاہیے کہ اس کا ولی انصاف سے لکھواتا جائے۔“[1]

اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں تین صورتوں میں ولی کو معاہدہ کرنے کا مختار بنایا ہے۔

1 نادان ہو۔ 2 ضعیف ہو، اس میں نابالغ بچے بھی داخل ہیں کیونکہ صفت ضعف قرآن کریم نے بچے کے لیے بیان کی ہے، فرمایا: ﴿ وَلَهٗ ذُرِّيَّةٌ ضُعَفَآءُ ﴾ ”اس کے لیے چھوٹے کمزور بچے ہوں۔“[2] 3 لکھوانے کی اہلیت نہیں رکھتا، یعنی لغت نہیں سمجھتا یا زبان سے گونگا ہو جبکہ نابالغ میں یہ تینوں صفات بیک وقت موجود ہیں۔ بالغ کے نکاح کے لیے ولی کی رضامندی شرط ہے، جس کے ذریعے سے عقد نکاح اور دوسرے عقود صحیح ہو سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں عورت کی رضامندی کی شرط کے لیے پرویز صاحب نے

﴿ لَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرْهًا ﴾

”اور تمھارے لیے جائز نہیں ہے کہ تم زبردستی عورتوں کو وراثت میں لے لو۔“[3]

سے جو استدلال کیا ہے وہ ناقص ہے۔ اس میں بالغہ عورت کے نکاح کا تذکرہ ہے۔ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ ایک شخص وفات پا گیا اور اس کی منکوحہ ہے تو وارث اس کی بیوہ کے ساتھ اس کی رضامندی کے بغیر خود نکاح کر سکتے ہیں نہ اس کا نکاح کسی دوسرے شخص سے کر سکتے ہیں تو ظاہر ہے کہ منکوحہ بالغہ ہے۔ اور اگر بالغہ نہیں تو پھر ﴿ كَرْهًا ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ اس کے ولی کی رضامندی کے بغیر نکاح نہیں کر سکتے۔

3 طبی نقطۂ نظر سے نابالغہ سے مجامعت مضر ہے۔ یہ اعتراض تب بنتا ہے کہ نکاح کے ساتھ ساتھ رخصتی بھی بچپن میں ہو جائے۔ عربوں کا معمول تھا کہ وہ نکاح تو بچپن میں کر دیتے جبکہ رخصتی بلوغت کے بعد کرتے تھے جیسا کہ ہمارے ہاں بھی بعض لوگ اس طرح

[1] البقرۃ 2:282. [2] البقرۃ 2:266. [3] النسآء 4:19.

کر لیتے ہیں۔ اسی طرح عائشہ رضی اللہ عنہا کا نکاح بچپن میں ہوا اور رخصتی نو سال کی عمر میں (بلوغت کے بعد) ہوئی۔ عائشہ رضی اللہ عنہا کے نکاح کو چھ سال کی عمر میں ہونے کو پرویز نے بھی مشروط طور پر تسلیم کیا ہے۔[1] لیکن پھر اس نے اسے منسوخ قرار دیا ہے اگرچہ یہ نظریہ غلط ہے۔

مزید برآں طبی نقطۂ نظر سے نابالغہ سے مجامعت کے متعلق یہ خیال غلط ہے کہ یہ مضر ہے۔ بسا اوقات بلوغت سے قبل زمانۂ ''مراہقت'' میں جماع کیا جاسکتا ہے اور اس پر کوئی بدنی ضرر مرتب نہیں ہوتا۔

نوٹ : عائشہ رضی اللہ عنہا کے چھ سال کی عمر میں نکاح اور نو سال کی عمر میں رخصتی کے متعلق حدیث صحیح ہے امام بخاری اور امام مسلم رحمہما اللہ نے صحیح اسانید کے ساتھ اسے نقل کیا ہے،[2] البتہ دور حاضر کے بعض خود ساختہ ناقدین نے اس حدیث کی سند پر جرح کی ہے جو قابل اعتماد نہیں۔

بیسواں شبہ: حدرجم

اس سلسلے میں منکرین حدیث کے مندرجہ ذیل اعتراضات ہیں:

1. قرآن کریم سے اس کا ثبوت نہیں ملتا۔
2. ہر قسم کے زانی کی سزا سو کوڑے ہے۔
3. اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ فَإِذَآ أُحۡصِنَّ فَإِنۡ أَتَيۡنَ بِفَٰحِشَةٖ فَعَلَيۡهِنَّ نِصۡفُ مَا عَلَى ٱلۡمُحۡصَنَٰتِ مِنَ ٱلۡعَذَابِ ﴾

---

[1] قرآنی فیصلے، ص: 35. [2] صحيح البخاري، مناقب الأنصار، باب تزويج النبي ﷺ عائشة وقدومها......، حديث: 3894، وصحيح مسلم، النكاح، باب جواز تزويج الأب البكر الصغيرة، حديث: 1422.

''پس جب یہ عورتیں نکاح میں آجائیں اور پھر اگر ان سے بے حیائی کا کام ہوجائے توانھیں آزادعورتوں سے نصف سزادی جائے گی۔''[1]

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ زنا کی سزا صرف کوڑے مارنا ہے کیونکہ رجم تو نصف نہیں ہوسکتا۔

4 عمر رضی اللہ عنہ کے خطبے سے معلوم ہوتا ہے کہ آیت رجم قرآن کریم میں تھی تو پھر وہ کہاں گئی؟

5 ہوسکتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حد رجم سورة النور نازل ہونے سے پہلے نافذ کی ہو اور پھر اس سورت کے نزول کے بعد رجم کا حکم منسوخ ہوگیا ہو۔

جواب جہاں تک پہلے شبہے کا تذکرہ ہے تو اس سلسلے میں عرض ہے کہ قرآن کریم میں زنا کے سلسلے میں مختلف سزاؤں کا تذکرہ موجود ہے۔

1 اگر کوئی شخص کسی پر زنا کی تہمت لگائے، خواہ وہ مرد ہو یا عورت اور پھر وہ چار چشم دید گواہ پیش نہ کرسکے تو اس کی (سزا حد قذف) اسی کوڑے ہے۔ اور اس کی گواہی کبھی بھی قابل اعتبار نہیں ہوگی۔[2]

2 شوہر اپنی بیوی پر زنا کی تہمت لگائے اور پھر گواہ پیش نہ کرسکے تو ان کے درمیان لعان کرایا جائے گا۔[3]

3 جس کسی عورت سے زنا ہوجائے، چار گواہ گواہی بھی دے دیں تو پھر اس کی سزا یہ ہے کہ اسے گھر میں محبوس کیا جائے اور تفصیلی سزا کا انتظار کیا جائے۔[4]

یاد رہے کہ سورۂ نساء غزوۂ احد کے بعد سے لے کر سن 4 ہجری کے آخر تک مختلف اوقات میں نازل ہوتی رہی ہے۔

[1] النسآء 4:25۔ [2] دیکھیے: سورة النور 24:4۔ [3] دیکھیے: سورة النور 24:6-8۔ [4] دیکھیے: سورة النسآء 4:5۔

4 غلام اور لونڈی سے زنا ہو جائے اور وہ شادی شدہ ہوں تو ان کی سزا پچاس کوڑے ہے۔[1]

5 آزاد مرد اور آزاد عورت غیر شادی شدہ ہونے کی صورت میں زنا کا ارتکاب کر لیں تو ان کی سزا سو کوڑے ہے۔[2]

یہ پانچ قسمیں قرآن کریم کی مختلف آیات میں صراحت کے ساتھ مذکور ہیں۔

6 آزاد مرد اور آزاد عورت سے شادی شدہ ہونے کی صورت میں زنا کا ارتکاب ہو جائے تو ان کی سزا رجم ہے اور یہ قرآن کریم میں اشارتاً موجود ہے، یعنی تورات میں مذکور ہے۔ نبی ﷺ نے اس حد کو جاری فرمایا تو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ پر کوئی عتاب نہیں فرمایا۔ یہ واقعہ سورۃ المائدۃ: (5:41-43) میں مذکور ہے۔ درج ذیل آیت بھی انھی آیات میں سے ہے:

﴿ إِنْ أُوتِيتُمْ هَٰذَا فَخُذُوهُ وَإِن لَّمْ تُؤْتَوْهُ فَاحْذَرُوا ﴾

''اگر تمھیں یہی حکم دیا جائے تو لے لو اور اگر یہ نہ دیا جائے تو اس سے بچو۔''[3]

﴿ هَٰذَا ﴾ یہ اس حکم کی طرف اشارہ ہے جو انھوں نے اپنی طرف سے تحریف کر کے جاری کیا تھا کہ شادی شدہ زانی کی سزا یہ ہے کہ اس کا منہ کالا کر کے الٹے رخ گدھے پر سوار کیا جائے لیکن عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نے، جو پہلے یہود کے بڑے عالم تھے، عرض کیا: اے اللہ کے رسول! ان سے تورات منگوائیں۔ جب تورات لائی گئی تو ایک یہودی عالم نے آیت رجم پر ہاتھ رکھ دیا اور اس سے اگلی اور پچھلی عبارت پڑھنے لگا تو عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نے اسے فرمایا کہ اپنا ہاتھ اٹھاؤ۔ جب اس نے ہاتھ اٹھایا تو وہاں آیت رجم مذکور تھی، پس نبی ﷺ نے ان دونوں کو رجم کرنے کا حکم فرمایا۔ ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ ان دونوں کو بلاط (مدینہ میں ایک جگہ) کے پاس رجم کر دیا گیا۔[4] جب قرآنی آیت

---

[1] دیکھیے: سورۃ النسآء 25:4. [2] دیکھیے: سورۃ النور 2:24. [3] المآئدۃ 41:5. [4] صحیح البخاري، المحاربین، باب الرجم في البلاط، حدیث: 6819، وصحیح مسلم، الحدود، باب رجم الیهود، أهل الذمة، في الزنى، حدیث: 1699.

میں اس واقعے کی طرف واضح اشارہ موجود ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس حکم کے متعلق نبی ﷺ پر کوئی عتاب نہیں فرمایا تو معلوم ہوا کہ آپ ﷺ کا یہ حکم بحوالۂ تورات قرآن کا بھی ہے، لہٰذا یہ کہنا درست ہے کہ حد رجم قرآن کریم کی انھی آیات (المآئدة5:41-43) سے ثابت ہے اور پھر رسول اللہ ﷺ اور خلفائے راشدین نے ہر دور میں اس حکم پر عمل کیا ہے۔

فائدہ: امام بخاری رحمہ اللہ نے اس حدیث کو کتاب المحاربین میں اس لیے بیان کیا ہے کہ وہ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ شادی شدہ ہونے کی صورت میں زنا کا ارتکاب کرنے والے، محاربین کی فہرست میں شامل ہیں جبکہ محاربین کی سزا میں یہ بھی شامل ہے کہ انھیں قتل کیا جائے، لہٰذا زانیوں کو رجم کرنا قرآن کریم کے اس اشارے سے بھی ثابت ہے۔

شبہ نمبر 2 منکرینِ حدیث درج ذیل آیت سے استدلال کرتے ہیں کہ اس میں رجم نہیں اور وہ کہتے ہیں کہ یہ آیت شادی شدہ اور غیر شادی شدہ دونوں کو شامل ہے۔

﴿ اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ ﴾

”زنا کرنے والی عورت اور زنا کرنے والا مرد، دونوں میں سے ہر ایک کو سو سو کوڑے مارو۔“[1]

جواب 1 تمام مفسرین اور محدثین کا اجماع ہے کہ اس آیت سے غیر شادی شدہ مراد ہیں۔ اس کا قرینہ یہ ہے کہ زانیوں کے نکاح کا ذکر اس کے بعد آیت:3 میں کیا گیا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ یہ غیر شادی شدہ ہیں اور وہ زنا کے بعد نکاح کرنا چاہتے ہیں تو ان کے لیے آیت:3 میں قانون بیان کیا گیا ہے۔

2 اگر اس آیت سے شادی شدہ اور غیر شادی شدہ دونوں مراد لیے جائیں تو جائز ہے لیکن قرآن کریم نے بظاہر ایک سزا کا ذکر کیا ہے جو دونوں کو محیط ہے، یعنی شادی شدہ کو

[1] النور 24:2.

بھی پہلے کوڑے مارے جائیں اور پھر رجم کیا جائے جیسا کہ بعض احادیث سے یہ ثابت ہے۔ اس بنا پر اس آیت میں صرف ایک سزا بیان کی گئی جبکہ دوسری سزا (رجم) قرآنی اشارات اور احادیث سے ثابت ہے جس کا قرآن کریم کے ساتھ کوئی اور تضاد نہیں۔

شبہ نمبر③ : اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿فَإِذَآ أُحْصِنَّ فَإِنْ أَتَيْنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنَٰتِ مِنَ الْعَذَابِ﴾

''پس جب یہ عورتیں نکاح میں آجائیں تو اگر ان سے بے حیائی کا کام سرزد ہو تو انھیں آزاد عورتوں سے نصف سزا دی جائے گی۔''①

وہ اس آیت سے یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ حد زنا میں رجم نہیں کیونکہ رجم نصف نہیں ہوسکتا۔

جواب یہ اپنی جگہ درست ہے کہ یہاں نصف سزا پچاس کوڑے ہی مراد ہے اور رجم کی تنصیف نہیں ہوسکتی لیکن اس آیت کے آغاز پر غور وفکر کرنا چاہیے۔

﴿وَمَن لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنكُمْ طَوْلًا أَن يَنكِحَ الْمُحْصَنَٰتِ﴾

''تم میں سے جو شخص اس بات کی استطاعت نہ رکھتا ہو کہ وہ آزاد مومن عورتوں کو نکاح میں لا سکے۔''②

﴿الْمُحْصَنَٰتِ﴾ سے آزاد غیر شادی شدہ عورت مراد ہے کیونکہ عادتاً اس کا مہر اور نفقہ زیادہ ہوتا ہے۔ بعض مرد اس کی استطاعت نہیں رکھتے، پھر آیت کے دوسرے حصے ﴿نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنَٰتِ﴾ میں بھی اس سے وہی عورت مراد ہے جو آیت کے آغاز میں مذکور سے ہے، یعنی کنواری عورت، چنانچہ جب آزاد غیر شادی شدہ پر زنا کی صورت میں سو کوڑے

① النسآء 4:25. ② النسآء 4:25.

سزا ہے تو پھر لونڈی اگرچہ شادی شدہ ہو اس کی سزا پچاس کوڑے ہے، یعنی آیت کا رجم کے ثبوت اور عدم ثبوت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں کیونکہ یہاں ﴿الْمُحْصَنٰتِ﴾ میں شادی شدہ عورت مراد نہیں۔

شبہ نمبر 4: عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے خطبہ میں فرمایا: کتاب اللہ میں رجم کے متعلق آیت تھی جس کو ہم پڑھتے تھے اور ہم نے اس پر عمل بھی کیا اور اس خطبے میں ہے: کتاب اللہ میں رجم کا حکم اس شخص کے بارے میں حق ہے جو شادی شدہ ہونے کی صورت میں زنا کرے۔ اس پر پرویزی اعتراض یہ ہے کہ اگر یہ آیت موجود تھی تو کہاں گئی؟[1]

جواب اس آیت کی تلاوت منسوخ ہوگئی اور حکم باقی ہے اور نسخ قرآن کریم سے ثابت ہے۔

﴿مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا﴾

”جو آیت ہم منسوخ کرتے ہیں یا اسے بھلوا دیتے ہیں تو ہم اس سے بہتر یا اس جیسی آیت نازل فرما دیتے ہیں۔“[2]

ناسخ ومنسوخ کی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں، اس لیے ہم اس سے صرف نظر کرتے ہیں۔

نیز فرمایا:

﴿سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰٓى ۝ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ۭ اِنَّهٗ يَعْلَمُ الْجَهْرَ وَمَا يَخْفٰى ۝﴾

”ہم عنقریب آپ کو اسی طرح پڑھائیں گے کہ اسے بھولیں گے نہیں، مگر جو اللہ چاہے۔ بے شک وہ ظاہر اور پوشیدہ کو جانتا ہے۔“[3]

اس آیت میں ﴿مَا شَآءَ﴾ سے نسخ کی ایک قسم مراد ہے۔ ہاں آیت رجم جب منسوخ التلاوۃ ہوئی تو اثبات رجم کے اشارات سورۂ مائدہ اور احادیث متواترہ میں موجود ہیں جس سے لفظی اور عملی تواتر ثابت ہے۔

① قرآنی فیصلے، ص: 182. ② البقرة 106:2. ③ الأعلىٰ 7،6:87.

شبہ نمبر 5: بعض لوگ اس اشتباہ میں ہیں کہ شاید سورۂ نور میں مذکورہ سزا بعد میں اور رجم کا اثبات اس سے پہلے کا ہے، لہٰذا رجم کا حکم منسوخ ہوگیا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ سورۂ نور سن 6 ہجری میں نازل ہوئی اور ترتیب نزولی کے لحاظ سے اس کا نمبر 102 ہے جبکہ سورۂ مائدہ صلح حدیبیہ کے بعد نازل ہوئی، یعنی سن 7 ہجری میں اور ترتیب نزول کے لحاظ سے اس کا نمبر 112 ہے۔ اس طرح رجم کے بعض واقعات سورۂ نور کے نزول کے بعد کے ہیں، مثلاً:

1 غامدیہ کو رجم کرنے میں خالد بن ولید رضی اللہ عنہ شامل تھے [1] اور وہ صلح حدیبیہ اور فتح مکہ کی درمیانی مدت میں مسلمان ہوئے اور یہ دونوں واقعات سورۂ نور کے بعد کے ہیں۔

2 ایک گھریلو مزدور لڑکے نے شادی شدہ عورت سے زنا کیا، پھر عورت کے شوہر اور لڑکے کے باپ نے مالی عوض کے بدلے آپس میں صلح کرلی۔ لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس صلح کو مسترد کردیا اور لڑکے کو کوڑے مارنے اور عورت کو رجم کرنے کا فرمایا۔ اس واقعے میں ابوہریرہ رضی اللہ عنہ خود حاضر تھے جو غزوۂ خیبر کے وقت سن 7 ہجری میں اسلام قبول کرکے مدینہ آئے تھے، لہٰذا یہ واقعہ بھی سورۂ نور کے بعد کا ہے۔ [2]

نوٹ: منکرینِ حدیث سے سوال ہے کہ شادی شدہ مرد اور عورت کی سزا یا تو غیر شادی شدہ کے مساوی ہوگی یا معمولی تعزیر ہوگی یا رجم ہوگا۔ پہلی دونوں صورتوں میں تو بالکل ناانصافی ہے کہ شادی شدہ اور غیر شادی شدہ کو مساوی سزا دی جائے کیونکہ شادی شدہ کا جرم زیادہ سنگین ہے۔ اسی لیے اسلام نے غیر شادی شدہ کے لیے سو کوڑے اور شادی شدہ کے لیے رجم کی سزا مقرر کی ہے لیکن مغربی کفار فحاشی اور بدکاری کے لیے ہر طریقے سے

[1] صحیح مسلم، الحدود، باب من اعترف علٰی نفسہٖ بالزنٰی، حدیث: 1695. [2] صحیح البخاري، الصلح، باب إذا اصطلحوا علٰی صلح جور……، حدیث: 2696,2695، وصحیح مسلم، الحدود، باب من اعترف علٰی نفسہٖ بالزنٰی، حدیث: 1698,1697.

راہیں ہموار کر رہے ہیں اور وہ ان سزاؤں کو جو فحاشی روکنے کا ذریعہ ہیں، وحشیانہ سزائیں کہتے ہیں۔ منکرینِ حدیث جو اصل میں مغرب کے آلۂ کار ہیں وہ بھی اسی قسم کے شبہات کو ہوا دیتے ہیں تاکہ مسلمانوں میں فحاشی عام ہو جائے۔

اکیسواں شبہ: یتیم پوتے کی وراثت

اس شبہے کا تجزیہ مندرجہ ذیل ہے:

1. پوتے کو چچا کی موجودگی میں دادا کی میراث سے حصہ نہ دینا ناانصافی اور ظلم ہے۔
2. فقہاء کی غلطی ہے کہ دادا کو پوتے کا وارث بناتے ہیں جبکہ پوتے کو دادا کا وارث نہیں بناتے، حالانکہ نسبت ایک ہی ہے۔
3. پوتا اپنے باپ کا قائم مقام ہے۔ اس کا چچا واسطہ نہیں، اس کا باپ واسطہ تھا اور وہ فوت ہو چکا ہے تو چاہیے کہ پوتا اپنے باپ کی طرح دادے کا وارث بن جائے۔

جوابات: شبہ نمبر 1: اس شبہ کا جواب دینے سے قبل منکرینِ حدیث سے ایک اہم سوال ہے کہ قرآن کریم میں ایسی کوئی آیت بتائیں جس میں چچا کی موجودگی میں یتیم پوتے کا وراثت میں حصہ بیان کیا گیا ہو۔ یہ مسئلہ صراحتاً یا اشارتاً ضرور قرآن کریم میں ہونا چاہیے تھا لیکن کسی طریقے سے بھی بیان نہیں کیا گیا۔ کیا اللہ تعالیٰ نے اس ظلم کو روکنے کی طرف توجہ نہیں فرمائی؟ جبکہ اللہ تعالیٰ کی صفت ہے:

﴿وَمَا اللّٰهُ يُرِيْدُ ظُلْمًا لِّلْعِبَادِ ۝﴾

''اور اللہ اپنے بندوں پر ظلم نہیں کرنا چاہتا۔''[1]

ہاں! اللہ تعالیٰ نے یتیم کے ساتھ ہمدردی کرنے کے دیگر بہت سے طریقے بتائے ہیں۔

[1] المؤمن 31:40.

1 اللہ تعالیٰ نے ہر آیت میراث میں حصص میراث بیان کرنے کے ساتھ یہ بھی فرمایا:

﴿ مِّنۢ بَعۡدِ وَصِيَّةٍ تُوصُونَ بِهَآ أَوۡ دَيۡنٍ ﴾

''تمھاری اس وصیت کی تکمیل کے بعد جو تم وصیت کرتے ہو اور قرضے کی ادائیگی کے بعد۔''[1]

یعنی اللہ تعالیٰ نے وصیت کا بیان فرمایا تو دادا کو چاہیے کہ یتیم پوتے کے لیے وصیت کردے اور ایک تہائی سے زیادہ وصیت نہیں کرنی چاہیے۔ اگر دادا پوتے کے لیے ایک تہائی کی وصیت کر جائے تو پھر یتیم پوتے کو دو چچے ہونے کی صورت میں ان کے ساتھ برابر حصہ مل جائے گا اور اگر چچے زیادہ ہوں تو پھر ایک تہائی وصیت کی صورت میں اس کا حصہ ان سے بڑھ جائے گا۔

2 اگر دادا نے وصیت نہیں کی تو چچا اس کو اپنے مال میں شریک کرسکتا ہے بلکہ وہ اپنا سارا مال بھی اسے دے سکتا ہے کیونکہ قرآن کریم میں یتیموں کو مال دینے کی ترغیب مذکور ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَءَاتَى ٱلۡمَالَ عَلَىٰ حُبِّهِۦ ذَوِي ٱلۡقُرۡبَىٰ وَٱلۡيَتَٰمَىٰ ﴾

''اور جس شخص نے اللہ کی محبت میں قریبی رشتہ داروں اور یتیموں کو مال دیا۔''[2]

نیز فرمایا:

﴿ قُلۡ مَآ أَنفَقۡتُم مِّنۡ خَيۡرٖ فَلِلۡوَٰلِدَيۡنِ وَٱلۡأَقۡرَبِينَ وَٱلۡيَتَٰمَىٰ ﴾

''کہہ دیجیے: جو کچھ تم اپنے مال سے خرچ کرو تو وہ والدین، رشتہ داروں اور یتیموں کو دو۔''[3]

اس طرح اور بھی بہت سی آیات ہیں جن میں یتیموں پر مال خرچ کرنے کی ترغیب ہے۔

[1] النسآء 12:4. [2] البقرة 177:2. [3] البقرة 215:2.

3 اگر چچا یتیم بھتیجے کو کچھ نہ دے تو دوسرے رشتہ دار اس کے ساتھ ہمدردی کر سکتے ہیں۔ درج ذیل آیت مبارکہ میں اس بات کی طرف اشارہ ہے۔ ارشاد ہوا:

﴿ وَ اِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ اُولُوا الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰكِیْنُ فَارْزُقُوْهُمْ مِّنْهُ ﴾

”جب تقسیم ترکہ کے وقت رشتہ دار، یتیم اور مساکین موجود ہوں تو اس میں سے انھیں بھی کچھ دو۔“[1]

اسلام نے یہ مذکورہ تین طریقے اس لیے مقرر کیے ہیں کہ اگر کہیں پوتا یتیم ہو تو اسے ان میں سے کسی طریقے کے ذریعے سے مدد پہنچائی جا سکتی ہے۔

شبہ نمبر 2: دادے کو یتیم پوتے کا وارث بنایا جاتا ہے۔ لیکن یتیم پوتے کو دادے کا وارث نہیں بنایا جاتا۔

جواب اللہ تعالیٰ نے قانون وراثت کی بنیاد قرب پر رکھی ہے، یعنی جو شخص رشتے میں میت کے زیادہ نزدیک ہو گا وہ میراث کا پہلے حق دار بنے گا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ لِلرِّجَالِ نَصِیْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ۪ وَلِلنِّسَآءِ نَصِیْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ ﴾

”جو کچھ والدین اور قرابت والے ترکہ چھوڑ جائیں، اس میں مردوں کا حصہ ہے، اور (اسی طرح) عورتوں کے لیے بھی اس ترکہ میں حصہ ہے جو ان کے والدین اور رشتہ دار چھوڑ جائیں۔“[2]

آیت کا مفہوم یہ ہے کہ تو الد کے رابطے اور اقربیت کی نسبت کے لحاظ سے میراث ملتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسی طرح میراث کی تینوں آیات میں الأقرب فالأقرب (پہلے قریب تر پھر جو ان کے قریب تر ہوں) کا قانون رکھا ہے، چنانچہ وراثت کے متعلق سورۂ نساء

[1] النسآء 4:8. [2] النسآء 4:7.

کی آیت نمبر 11 میں پہلے اولاد کا ذکر ہے، پھر والدین کا اور یہ الأقرب فالأقرب پر مبنی ہے۔ آیت نمبر 12 میں خاوند اور بیوی کی میراث کا ذکر فرمایا جو توالد کے بعد أقرب نسبت ہے جبکہ آیت نمبر 176 میں اخیافی اور علاتی بھائیوں کی میراث کا تذکرہ فرمایا تو اس میں بھی اخیافی، علاتی پر مقدم ہے۔ یہ بھی الأقرب فالأ قرب کی بنیاد پر ہے۔

اسی اصول کی بنا پر یتیم لڑکے کا چچا، اس کے دادے کے زیادہ قریب ہے کیونکہ وہ اس کا بیٹا ہے اور یتیم لڑکا ایک واسطے (باپ) کی وجہ سے چچا کی نسبت دادے سے دور ہے اور باپ کے وفات پا جانے پر پوتا بیٹے کے مقام پر نہیں آجاتا، وہ پوتا ہی رہتا ہے۔ اس طرح چچا کی موجودگی میں بھتیجا وارث نہیں بن سکتا۔ اگر ایسی صورت میں یتیم پوتے کو میراث میں حصہ دار بنا دیا جائے (جبکہ اس کے لیے کوئی شرعی دلیل بھی نہیں) تو یہ دادے کی طرف سے اپنے بیٹے کی حق تلفی ہوگی۔ اور دادے کو پوتے کا اس لیے وارث بنایا جاتا ہے کہ وہ پوتے کے لیے ''أقرب'' ہے جبکہ چچا ''أبعد'' ہے کیونکہ چچا، دادے کی وساطت سے چچا بنا ہے۔

شبہ نمبر 3: پوتا اپنے باپ کا قائم مقام ہوتا ہے۔

جواب یہ قائم مقامی کا اصول حافظ اسلم اور پرویز صاحب کے خود ساختہ اصول میں سے ہے۔ اس کے لیے وہ قرآن کریم میں سے کوئی ماخذ پیش نہیں کر سکتے بلکہ یہ تو عقلی تقاضے کے بھی خلاف ہے۔ وہ اس طرح کہ پوتا اپنے باپ کی وساطت سے دادے کے قریب تھا جبکہ باپ اس کے دادے سے پہلے وفات پا گیا، اب اس کو واسطہ نہیں کہا جا سکتا۔ یہ حقیقت سے چشم پوشی کے مترادف ہے۔ اگر کوئی شخص اعتراض میں یہ مثال پیش کرے کہ کسی کا باپ فوت ہو جائے اور اس کا دادا زندہ ہو تو دادا باپ کی جگہ پر قائم مقام ہوتا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اس صورت میں دادا اقربیت کی وجہ سے وارث بنتا ہے نہ کہ قائم مقامی کی وجہ سے جبکہ یتیم پوتے کے مسئلے میں ''أقرب'' (چچا) موجود ہے تو یہاں قائم مقامی

کا اصول لاگو نہیں ہوتا۔

بائیسواں شبہ: صحیح بخاری کی قابل اعتراض احادیث

اس عنوان کے تحت پرویز صاحب نے طلوع اسلام میں چالیس احادیث کا صرف اردو ترجمہ نقل کر کے انھیں قابل اعتراض گردانا ہے اور عقل و سائنس کی رو سے ان احادیث پر اعتراض کیا ہے یا اس وجہ سے اعتراض کیا ہے کہ ان کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ اور صحابۂ کرام کی سیرت داغ دار ہوتی ہے یا یہ احادیث قرآن کے خلاف ہیں یا ان سے اللہ تعالیٰ کی ذات پر حرف آتا ہے، پھر انھوں نے لکھا ہے کہ اس قسم کی اور بھی بہت سی احادیث ہیں جو رسول اللہ ﷺ کی نہیں ہوسکتیں۔ ان احادیث میں سے صرف ایک حدیث مسلم کی ہے اور باقی 39 صحیح بخاری کی ہیں۔

اس الزام کا جواب یہ ہے کہ صحیح بخاری کی 7275 احادیث میں سے صرف 39 پر اعتراض ہے تو پھر ان کے علاوہ دوسری ہزاروں احادیث کو کیوں نہیں مانتے۔ صرف چند احادیث کی وجہ سے سارے ذخیرۂ احادیث کے ساتھ استہزا کسی مسلمان کا تو کجا کسی معمولی سمجھ بوجھ رکھنے والے شخص کا کام بھی نہیں ہوسکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ انھیں ان چالیس احادیث کی سمجھ نہیں آئی ورنہ ان میں کوئی قابل اعتراض بات نہیں ہے۔

تفصیلی جوابات

حدیث 1 : پتھر کا موسیٰ علیہ السلام کے کپڑے لے کر بھاگنا

موسیٰ علیہ السلام نے غسل کرتے وقت کپڑے پتھر پر رکھ دیے تو پتھر وہ کپڑے لے بھاگا۔ موسیٰ علیہ السلام بھی اس کے پیچھے دوڑے، بنی اسرائیل نے انھیں برہنہ حالت میں دیکھ لیا تو

انھیں معلوم ہوگیا کہ ان کے بدن میں کوئی بیماری نہیں۔[1]

جواب بنی اسرائیل میں یہ عادت تھی کہ وہ اکھٹے غسل کیا کرتے تھے اور ایک دوسرے کو برہنہ دیکھنے میں کوئی عار نہیں سمجھتے تھے، جیسا کہ اس حدیث میں موجود ہے، اس لیے موسیٰ علیہ السلام کا ان کے سامنے برہنہ حالت میں آنا کوئی عار نہیں تھا۔ اس سے یہ فائدہ حاصل ہوا کہ وہ لوگ موسیٰ علیہ السلام کی طرف جو بیماری منسوب کر رہے تھے اس سے موسیٰ علیہ السلام کی براءت ظاہر ہوگئی۔

حدیث 2 : موسیٰ علیہ السلام کا ملک الموت کو طمانچہ مارنا[2]

جواب اس حدیث میں واضح طور پر موجود ہے کہ ملک الموت انسانی شکل میں آیا اور انھیں (موسیٰ سے) کہا کہ میں تمھیں مارنے کے لیے بھیجا گیا ہوں۔ موسیٰ علیہ السلام نے انھیں (ملک الموت کو) نہ پہچانا اور اسے طمانچہ مار دیا۔ ظاہر ہے کہ اگر کوئی شخص کہے کہ میں تجھے مارنے آیا ہوں تو اس کے ساتھ اس طرح کا سلوک کیا جاسکتا ہے لیکن جب وہ دوسری مرتبہ آیا تو موسیٰ علیہ السلام نے اسے پہچان لیا اور سرِتسلیم خم کر دیا۔

حدیث 3 : سلیمان علیہ السلام کا ایک رات میں سو بیویوں کے پاس جانا[3]

نوٹ: حدیث میں نوے بیویوں کا ذکر ہے۔

طلوع اسلام کی طرف سے اس حدیث پر دو اعتراض ہیں۔

[1] ننانوے یا سو بیویوں کا ایک وقت میں نکاح میں جمع ہونا، روایات میں تعداد کے

---

① صحيح البخاري، أحاديث الأنبياء، باب: 28، حديث: 3404. ② صحيح البخاري، أحاديث الأنبياء، باب وفاة موسىٰ......، حديث: 3407. ③ صحيح البخاري، الأيمان والنذور، باب كيف كانت يمين النبي ﷺ، حديث: 6639.

حوالے سے اضطراب ہے۔

[2] ایک رات میں سب کے ساتھ ایسا جماع کرنا کہ انزال بھی ہوتا کہ ہر ایک بیوی سے بچہ پیدا ہو۔

جواب ① سلیمان علیہ السلام کے لیے ہوا اور جنات مسخر تھے، آپ انھیں قید کرتے اور سزا دیتے تھے، اعلیٰ قسم کے گھوڑے تھے، شاہی شان وشوکت تھی اور دنیا کے اکثر ممالک پر حکومت تھی۔ ان باتوں کا ثبوت قرآن کریم سے ملتا ہے تو ایسے شخص کے لیے سو یا ننانوے بیویاں ہونا عقل سے بعید نہیں۔

② بائبل میں سلیمان علیہ السلام کے لیے سات سو مملوکات اور تین سو بیویوں کا ثبوت ملتا ہے۔[1]

اگر صحیح حدیث سے سو بیویوں کا ثبوت مل جائے تو پھر اس پر اعتراض کیوں؟

③ تعداد (سو یا ننانوے) کے تفاوت سے حدیث میں اضطراب پیدا نہیں ہوتا، اس کی دو وجوہ ہیں:

اول: عدد کے مفہوم مخالف کے بارے میں اہل علم کا اتفاق ہے کہ یہ معتبر نہیں، یعنی تھوڑے عدد کے ذکر سے زیادہ عدد کی نفی لازم نہیں آتی۔

دوم: یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کسی راوی نے بیویوں اور لونڈیوں کو اکٹھا شمار کیا ہو اور کسی نے صرف بیویوں کو شمار کیا ہو اور کسی نے صرف ان کو شمار کیا ہو جو حالت طہر میں تھیں تو اس طرح اضطراب ختم ہو سکتا ہے۔

دوسرے اعتراض کا جواب یہ ہے کہ دانشمندوں نے کہا ہے: ''کار پاکاں را قیاس از خود مگیر۔'' مقصد یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے معجزات برحق ہیں اگرچہ وہ ہماری عقل سے ماورا ہوں۔ حدیث میں وارد ہے کہ نبی کو تیس اور ایک دوسری روایت کے مطابق، چالیس

① سلاطین: 1، باب: 11، آیت 1-5.

مردوں کی طاقت عطا کی گئی ہے۔[1] ابن حجر رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے: انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ہم یہ بات کہا کرتے تھے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تیس مردوں اور دوسری روایت کے مطابق چالیس مردوں کی طاقت دی گئی تھی۔ ابونعیم نے باب صفة الجنة میں مجاہد کی سند سے ایسے نقل کیا ہے، اور آخر میں فرمایا: اس سے جنتی مرد مراد ہیں۔ اور مسند احمد اور سنن نسائی کی روایت جسے امام حاکم نے صحیح قرار دیا ہے، زید بن ارقم رضی اللہ عنہ مرفوع بیان کرتے ہیں کہ جنتی مرد کو سو آدمیوں کے کھانے پینے اور جماع کرنے کی قوت دی جائے گی تو اس حساب سے معلوم ہوا کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تین چار ہزار مردوں کی قوت دی گئی تھی۔[2] اور مرد سے جنتی شخص مراد ہے جس کی قوت سو آدمیوں کی ہوگی تو نبی جس میں تین ہزار یا چار ہزار مردوں کی طاقت ہو تو اس کے لیے ایک رات میں سو بیویوں سے ہم بستری کرنا عقل سے بعید نہیں۔

حدیث 4: ابراہیم علیہ السلام کا اسی (80) سال کی عمر میں اپنا ختنہ کرنا[3]

جواب اس میں اعتراض کرنے کی کوئی گنجائش نہیں کیونکہ انبیاء علیہم السلام کو احکام شریعت کے متعلق وقتاً فوقتاً وحی آتی تھی اور جیسے وحی آتی وہ اس پر عمل کرتے تھے۔ ابراہیم علیہ السلام کو ختنے کے متعلق اسّی (80) سال کی عمر میں حکم ہوا تو انھوں نے اسی عمر میں اللہ کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے اپنا ختنہ کیا، نیز اس وقت طبعی عمریں زیادہ ہوتی تھیں، لہٰذا اسّی (80) سال کی عمر میں وہ کمزور اور ضعیف نہیں تھے۔

حدیث 5: ابراہیم علیہ السلام کا تین جھوٹ بولنا

''ابراہیم علیہ السلام کے متعلق روایت ہے کہ انھوں نے تین جھوٹ بولے تھے جبکہ جھوٹ

[1] السنن الكبرى للبيهقي: 54/7. [2] فتح الباري: 324/6. [3] صحيح البخاري، أحاديث الأنبياء، باب قول الله تعالىٰ: ﴿وَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرٰهِيْمَ خَلِيْلًا﴾، حديث: 3356.

بولنا انبیاء ﷺ کے شایان شان نہیں۔“[1]

❁ پہلا جھوٹ: ابراہیم علیہ السلام نے بتوں کو توڑا تو ان سے پوچھا گیا تو انھوں نے فرمایا:

﴿ بَلْ فَعَلَهٗ ۖ كَبِيْرُهُمْ ﴾

”بلکہ ان کے بڑے نے یہ کیا ہے۔“[2]

❁ دوسرا جھوٹ: قوم نے ابراہیم علیہ السلام کو اپنے تہوار میں شرکت کی دعوت دی تو انھوں نے فرمایا: ﴿ اِنِّيْ سَقِيْمٌ ۝ ﴾ ”میں بیمار ہوں۔“[3]

❁ تیسرا جھوٹ: انھوں نے اپنی اہلیہ کے بارے میں فرمایا کہ یہ میری بہن ہے۔

جواب ان میں سے دو کا ذکر تو قرآن کریم میں ہے، منکرینِ حدیث صرف حدیث پر کیوں اعتراض کرتے ہیں؟ وہ قرآن کریم میں مذکور دو کا جو جواب دیتے ہیں وہی جواب تیسری بات کے متعلق ہے جو حدیث میں مذکور ہے۔

② عربی محاورے میں کذب کا اطلاق کبھی توریہ کرنے پر بھی ہوتا ہے اور توریہ یہ ہے کہ بات کرنے والا ایسے الفاظ میں بات کرتا ہے جس کے دو مفہوم ہو سکتے ہیں، سننے والا اس کے ظاہری مفہوم کو لے لیتا ہے جبکہ بات کرنے والے کے ذہن میں اس بات کا دوسرا مفہوم مراد ہوتا ہے تو یہ کذبات اسی توریہ کے معنی پر محمول ہیں، اور ان کو کذبات پھر اس وجہ سے کہتے ہیں کہ سامع کے مراد کردہ مفہوم کے خلاف ہیں، یعنی سامع کے مفہوم کے لحاظ سے جھوٹ ہیں۔ علاوہ ازیں جھوٹ کی دو قسمیں ہیں ایک مذموم، دوسری قسم وہ جو کہ مستحسن ہے اور بعض اوقات اس کا بولنا واجب ہے تو ابراہیم علیہ السلام کے جھوٹ مذموم جھوٹ نہیں ہیں ورنہ اللہ تعالیٰ مذمت بیان فرماتے یہ مستحسن جھوٹ ہیں ان میں سے پہلے دو تو

---

① صحيح البخاري، أحاديث الأنبياء، باب قول الله تعالى ﴿ وَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرٰهِيْمَ خَلِيْلًا ۝ ﴾، حديث:3358. ② الأنبيآء 63:21. ③ الصّٰفّٰت 89:37.

ایسے جھوٹ ہیں جو مشرکین پر حجت قائم کرنے اور کلمۂ حق کو سر بلند کرنے کے لیے آپ نے بولے ہیں جبکہ تیسرا وہ ہے جو آپ نے اپنے آپ کو بچانے کے لیے بولا ہے اور یہ کوئی مذموم جھوٹ نہیں بلکہ مستحسن اور واجب ہے۔

حدیث 6: گرگٹ مارنے کے متعلق

نبی ﷺ نے گرگٹ مارنے کا حکم دیا اور فرمایا: ''یہ ابراہیم علیہ السلام کو جلانے کے لیے جلائی گئی آگ کو تیز کرنے کے لیے پھونک مارتا تھا۔''[1]

جواب اسے قتل کرنے کا اصل سبب یہ ہے کہ یہ موذی ہے اور موذی جانور جہاں بھی مل جائے، اسے قتل کرنے کا حکم ہے تا کہ لوگ اس کی ایذا سے بچ جائیں۔ اور ابراہیم علیہ السلام کی آگ پر پھونکنا اس کی ایذا رسانی کی ایک خاص مثال ہے۔ اس کی ایذا رسانی کا طریقہ یہ ہے کہ وہ اپنی لمبی زبان سے دور سے تھوکتا ہے۔ اس کے منہ کا لعاب زہریلا ہوتا ہے جس کی وجہ سے کیڑے مکوڑے مر کر اس کی خوراک بنتے ہیں۔ اس کی چار امتیازی خصوصیات اور بھی ہیں جو دوسرے جانوروں میں نہیں پائی جاتیں۔

1. ماحول کے مطابق فوراً رنگ بدل سکتی ہے۔ مشہور ضرب المثل ہے کہ فلاں شخص گرگٹ کی طرح رنگ بدلتا ہے۔
2. اس کی آنکھیں پپوٹوں میں پوشیدہ ہوتی ہیں جن میں چھوٹے سے سوراخ ہوتے ہیں جن سے وہ دیکھتا ہے۔
3. وہ چاروں طرف اور اوپر نیچے دیکھ سکتا ہے۔
4. اگر اس کے جسم کا پچھلا حصہ کٹ جائے تو بھی وہ بہت دیر تک متحرک اور زندہ رہتا

[1] صحیح البخاري، أحادیث الأنبیاء، باب قول الله تعالیٰ: ﴿وَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرٰهِیْمَ خَلِیْلًا﴾، حدیث: 3359.

ہے، ہوسکتا ہے کہ اس کا زہریلا لعاب دہن آگ کے شعلوں کو بھی تیز کرسکتا ہو۔ [1]

حدیث 7: قد آدم اور نسل در نسل اس کا کم ہونا

آدم علیہ السلام کا قد ساٹھ ذراع تھا پھر اب تک یہ قد کم ہوتا جا رہا ہے۔ [2]

جواب حدیث میں لفظ ذراع ہے جس کا معنی گز یا میٹر نہیں بلکہ اس کا معنی ہاتھ ہے جو تقریباً ڈیڑھ فٹ کے برابر ہے۔ منکرینِ حدیث نے کتاب ''مقام حدیث'' میں یہ دھوکا دیا ہے کہ ذراع کا معنی گز ہے۔ اس کے باوجود یہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔ قرآن کریم سے ثابت ہے کہ نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کو ساڑھے نو سو سال تبلیغ کی اور ان کی کل عمر ایک ہزار سال تھی ان کے بعد یہ عمر بتدریج کم ہوتی گئی حتی کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''میری امت کی اوسط عمر ساٹھ سے ستر کے درمیان ہوگی۔'' [3] شاذ و نادر ہی اس سے زیادہ عمر کی مثالیں ہوں گی۔ اس امت کی عمر ہزار سال کی نسبت پندرھواں حصہ بنتی ہے اسی لحاظ سے لوگوں کا اوسط قد بھی اب تقریباً چھ فٹ کے قریب ہی ہے بلکہ بعض علاقوں میں اس سے بھی کم ہے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بتدریج کم ہو رہا ہے۔

اور یہ اعتراض اس لیے بھی باطل ہے کہ قرآن میں بعد میں آنے والی قوم عاد کا ذکر ہے۔ کہ جب ان پر عذاب آیا تو وہ ایسے پڑے ہوئے تھے جیسے کھجور کے تنے، یعنی ان کا قد کھجور کے تنوں کی طرح تھا، حالانکہ یہ آدم علیہ السلام کے بعد آئے ہیں اور ان کے قد اتنے لمبے تھے تو آدم علیہ السلام کا قد ساٹھ ہاتھ مان لینے سے کون سی دینی خرابی لازم آتی ہے۔ عادیوں کے بارے میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿كَاَنَّهُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ خَاوِيَةٍ ۝﴾

[1] ماخوذ از کتاب فتنۂ پرویزیت۔ [2] صحيح البخاري، أحاديث الأنبياء، باب خلق آدم و ذريته، حديث: 3326. [3] جامع الترمذي، الزهد، باب ماجاء في فناء أعمار……، حديث: 2331.

”گویا وہ کھجور کے کھوکھلے تنے ہوں۔“[1]

حدیث 8: فرضیت نماز کیسے ہوئی!

نمازیں کیسے فرض ہوئیں، اس کے متعلق حدیث معراج مشہور ہے۔[2]

منکرین حدیث کی طرف سے اس حدیث پر عام طور پر تین اعتراض کیے جاتے ہیں:

1. اس میں موسیٰ علیہ السلام کی شان ہمارے رسول ﷺ سے بلند بتائی گئی ہے کیونکہ ہمارے رسول ﷺ نے نمازیں کم کرنے کے بارے میں ان سے استفادہ کیا۔ آپ ان کے مشورے پر عمل کرتے رہے جیسا کہ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ کسی یہودی نے اپنے نبی موسیٰ علیہ السلام کی شان بلند کرنے کے لیے یہ حدیث وضع کی ہے۔
2. اللہ تعالیٰ نے پہلے پچاس نمازیں فرض کیں، کیا اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کو اتنا بھی علم نہیں تھا کہ آخری امت اس بوجھ کی متحمل نہیں ہوسکتی یہاں تک کہ موسیٰ علیہ السلام نے توجہ دلائی۔
3. جب آخر میں پانچ نمازیں رہ گئیں اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

مَا يُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَيَّ

”میرے ہاں بات میں تبدیلی نہیں ہوتی۔“

جبکہ یہاں بات کو کئی بار بدلنا پڑا ہے۔

جواب اعتراض اول: کسی سے مشورہ لینا یا کسی کو مشورہ دینا اس میں کسی قسم کا نقص اور عیب لازم نہیں آتا۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اپنے رسول ﷺ کو حکم دیا ہے:

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ

[1] الحآقة 69:7. [2] صحيح البخاري، الصلاة، باب كيف فرضت الصلاة في الإسراء، حديث: 349.

’’اور اہم بات میں ان سے مشورہ کرلیا کریں۔‘‘[1]

اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے بدر کے قیدیوں کے بارے میں صحابۂ کرام سے مشورہ کیا اور ابوبکر رضی اللہ عنہ کے مشورے پر عمل بھی کیا۔ عائشہ رضی اللہ عنہا پر تہمت کے بارے میں صحابۂ کرام سے مشورہ کیا اور اسامہ، بریرہ اور زینب رضی اللہ عنہم کے مشورے پر عمل کیا تو جب موسیٰ علیہ السلام نے رسول اللہ ﷺ کو مشورہ دیا اور آپ نے ان کے مشورے پر عمل کیا، اس سے یہ کہاں لازم آتا ہے کہ ہمارے نبی ﷺ کی شان اور مرتبہ موسیٰ علیہ السلام سے ادنیٰ ظاہر ہوتا ہے، نیز اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کے متعلق فرمایا:

﴿ تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ﴾

’’یہ رسول ہیں جن میں سے بعض کو ہم نے بعض پر فضیلت دی۔‘‘[2]

یہ بعض کو بعض پر جزوی فضیلت ہے جبکہ کلی فضیلت نبی ﷺ کو حاصل ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کسی دوسرے نبی کو جزوی فضیلت نہیں دی۔

جواب اعتراض دوم: جب اللہ تعالیٰ کوئی حکم دیتا ہے اور پھر اس میں تخفیف فرما دیتا ہے تو اس میں اس کی بہت سی حکمتیں ہیں:

1 انسان اللہ تعالیٰ کے حضور تخفیف کے لیے التجا اور تضرع کرے۔

2 اللہ تعالیٰ کی کرم نوازی کا اظہار ہے۔

3 اللہ تعالیٰ کے تصرف اور اختیار کلی کا مظاہرہ ہے۔

احکام نسخ میں بھی اللہ تعالیٰ کی یہی حکمتیں ہیں جن کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ نسخ کو بے علمی پر محمول کرنا یہودیوں کا اعتراض تھا، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے آیت نسخ میں اس کا جواب دیا ہے۔

[1] آل عمرٰن 159:3. [2] البقرۃ 253:2.

جواب اعتراض سوم: لَا يُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَيَّ یہ جملہ اس حدیث کے آخر میں درج ہے۔ تو القول سے پچاس نمازوں کا حکم مراد نہیں بلکہ ایک عمل صالح پر دس گنا ثواب دینا مراد ہے، چنانچہ ارشاد ہوا:

﴿مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا﴾

''جو شخص نیک عمل کرے گا، اس کو اسی طرح کی دس نیکیاں ملیں گی۔''[1]

یا قول سے مراد حدیث میں مذکور یہ الفاظ ہیں: «هُنَّ خَمْسٌ وَّهُنَّ خَمْسُونَ» ''وہ ادا کرنے میں پانچ ہیں جبکہ اجر و ثواب میں وہ پچاس ہیں جبکہ سب سے واضح بات یہ ہے کہ لَا يُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَيَّ سے مراد یہ پانچ نمازیں ہیں، یعنی پانچ مقرر ہونے کے بعد اس میں مزید تبدیلی نہیں ہوگی۔''[2]

حدیث 9: نبی ﷺ پر جادو کرنے کی حدیث[3]

منکرین حدیث کے اعتراضات: ① جادو کفر و شرک ہے، یہ کسی صالح انسان پر خصوصاً نبی پر اثر انداز نہیں ہوتا۔

② اگر نبی پر جادو کا اثر تسلیم کر لیا جائے تو اس سے شریعت قابل اعتماد نہیں رہتی۔ اس طرح پتہ نہیں چلتا کہ نبی نے فلاں کام وحی کی روشنی میں کیا ہے یا جادو کے اثر کی وجہ سے کیا ہے۔

③ قرآن کریم نے کفار مکہ کا قول نقل کیا ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کو مسحور کہا کرتے تھے:

﴿اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا﴾

''تم ایک ایسے آدمی کی پیروی کرتے ہو جس پر کسی نے جادو کر رکھا ہے۔''[4]

① الأنعام 160:6. ② صحيح البخاري، الصلاة، باب كيف فرضت الصلاة في الإسراء، حديث: 349. ③ صحيح البخاري، الطب، باب السحر، حديث: 5766. ④ الفرقان 8:25.

لہٰذا نبی ﷺ پر جادو کا اثر تسلیم کرنا کفار کے قول کی تائید کرنا ہے۔

جواب اعتراض اول: کسی چیز کا حرام ہونا اس بات کو مستلزم نہیں کہ اس میں تاثیر نہیں ہوتی، مثلاً: کسی نے روٹی چوری کی، یہ روٹی کھانے سے بھوک ختم ہو جائے گی اگرچہ وہ حرام ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تمام چیزوں میں تاثیر رکھی ہے۔ حرام میں بھی اللہ تعالیٰ کے اذن سے تاثیر ہوتی ہے اور وہ بندوں کی آزمائش کے لیے ہوتی ہے۔

سحر کی تاثیر کا اثبات قرآن کریم کی بہت سی آیات میں مذکور ہے۔ فرمایا:

﴿ وَمَا هُمْ بِضَآرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ﴾

”وہ اللہ کے حکم کے سوا کسی کو بھی ضرر نہیں پہنچا سکتے۔“[1]

نیز فرمایا:

﴿ مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَ زَوْجِهٖ ﴾

”جس سے زن و شوہر میں جدائی ڈالتے تھے۔“[2]

نیز فرمایا:

﴿ فَلَمَّآ اَلْقَوْا سَحَرُوْٓا اَعْيُنَ النَّاسِ وَاسْتَرْهَبُوْهُمْ ﴾

”پھر جب انھوں نے ڈالا تو لوگوں کی آنکھوں کو مسحور کر دیا اور انھیں خوف زدہ کر دیا۔“[3]

نیز فرمایا:

﴿ يُخَيَّلُ اِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ اَنَّهَا تَسْعٰى ○ ﴾

”ان کے جادو کی وجہ سے موسیٰ علیہ السلام کو (وہ رسیاں) ایسے نظر آنے لگیں جیسے وہ دوڑ رہی ہوں۔“[4]

[1] البقرة 2:102. [2] البقرة 2:102. [3] الأعراف 7:116. [4] طٰهٰ 20:66.

نیز فرمایا:

﴿ وَمِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِي الْعُقَدِ ۝ ﴾

''اور جادو کرنے والی عورتوں کے شر سے (میں تیری پناہ مانگتا ہوں) جو گرہوں پر پھونکیں مارتی ہیں۔''[1]

ان آیات سے ثابت ہوا کہ سحر اور جادو کے لیے اثر ہے اور انبیائے کرام بھی من جملہ بشر ہیں، ان پر بھی جادو اثر انداز ہوسکتا ہے، اس شر کا مقصد سحر آفرینی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ سحر کے آثار عام بندوں پر اور انبیاء علیہم السلام پر بھی ظاہر ہوتے ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام کے متعلق جو سورۂ طٰہٰ میں ﴿ يُخَيَّلُ إِلَيْهِ ﴾ آیا ہے'' اور صحیح بخاری کی روایت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ﴿ يُخَيَّلُ ﴾ کے لفظ سے معلوم ہوا کہ انبیاء علیہم السلام پر سحر صرف ان کی قوت خیالیہ پر پڑتا ہے، اس سے زیادہ اثر نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ انھیں محفوظ رکھتا ہے جبکہ خیال کی تبدیلی تو ایک بیماری کی طرح ہے جیسا کہ انبیاء علیہم السلام پر غشی طاری ہوسکتی ہے۔

جواب اعتراض دوم: جب معلوم ہوا کہ انبیاء علیہم السلام پر سحر کی تاثیر وقتی طور پر خیالی ہوتی ہے، لہٰذا اس سے شریعت پر کوئی اثر نہیں پڑتا، نیز نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر سحر کا واقعہ صرف ایک مرتبہ ہوا، جس کا اللہ تعالیٰ نے دو فرشتوں کے بتانے کے ذریعے سے ازالہ کر دیا اور اس مدت میں نزول وحی کا بھی کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ اگر کوئی وحی ہوتی تو صحابۂ کرام ضرور اسے نقل کرتے یا دشمن ہی اس بات کا پراپیگنڈہ کرتے لیکن اس میں سے کچھ بھی نہیں ہوا۔

جواب اعتراض سوم: مشرکین نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مسحور کہا لیکن اس کا حدیث سحر کے ساتھ کوئی تعلق نہیں، جس کی درج ذیل وجوہ ہیں:

1 اولاً ہم اس کا الزامی جواب دیتے ہیں کہ مشرکین نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں کہا

[1] الفلق 4:113.

کہ آپ بشر ہیں، کھاتے پیتے ہیں بازاروں میں چلتے ہیں۔ یہ کفار کے دعوے تھے، کیا ہم ان باتوں سے صرف اس لیے انکار کردیں کہ اس سے مشرکین کی تصدیق ہوتی ہے؟ اگر ایک بات ثابت ہواور مشرکین اسے کہتے ہوں تو اس سے انکار کرنا کیسے درست ہے؟

2 مسحور سے مراد وہ شخص ہے کہ سحر کی وجہ سے اس کا اس قدر دماغ خراب ہو کہ وہ مجنون ہو جائے جبکہ نبی ﷺ سحر کی وجہ سے مجنون نہیں ہوئے تھے اگرچہ مشرکین نے انبیاء علیہم السلام کو ساحر اور مجنون کہا تھا۔

3 کفار کا نبی ﷺ کو مسحور کہنا مکی سورتوں میں مذکور ہے جبکہ سحر کا واقعہ مدینہ طیبہ میں پیش آیا۔ مکی زندگی میں آپ پر کوئی سحر نہیں کیا گیا۔ مشرکین جھوٹ کی بنا پر آپ کو مسحور کہتے تھے، البتہ مدینہ طیبہ میں آپ پر سحر کیا گیا جس کا آپ پر کوئی خاص اثر نہیں ہوا اور وہ جلد ہی زائل ہو گیا۔

حدیث 10: ''نو ازواج مطہرات کے ساتھ ایک ہی رات میں ہم بستری کرنا''[1]

اس حدیث پر منکرین کی طرف سے دو اعتراض ہیں:

1. ایک رات میں ایک مرد اتنی بیویوں کے ساتھ ہم بستری نہیں کرسکتا۔
2. یہ بیویوں کے درمیان عدل کے خلاف ہے جبکہ نبی ﷺ تو ہر بیوی کے لیے الگ الگ رات مقرر فرماتے تھے۔

جواب اعتراض اول: اسی حدیث میں وارد ہے کہ نبی ﷺ کو تیس مردوں کی طاقت دی گئی تھی، پھر دوسری حدیث میں وارد ہے کہ جنت میں ایک مرد کی طاقت سو مردوں کے برابر ہوگی۔ سلیمان علیہ السلام کے متعلق حدیث میں اس کی وضاحت ہو چکی ہے، نیز انبیاء علیہم السلام

[1] صحيح البخاري، النكاح، باب كثرة النساء، حديث: 5068.

کو اپنے اوپر قیاس نہیں کیا جا سکتا، لہٰذا اس پر تعجب اور انکار کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔

بعض احباب نے یہاں نبی ﷺ کے ازواج مطہرات کے پاس جانے کا مطلب مزاج پرسی پر محمول کیا ہے اور قوت سے شجاعت مراد لیا ہے۔ یہ قول بھی انکار حدیث کے مترادف ہے کیونکہ روایت میں ہے، نبی ﷺ نے تمام بیویوں کے ساتھ مجامعت کرنے کے بعد ایک غسل پر اکتفا کیا۔[1]

محدثین نے لکھا ہے کہ یہ واقعات اس سفر کے ساتھ متعلق ہیں جس میں آپ کی تمام ازواج مطہرات آپ کے ساتھ تھیں، اور یہ حجۃ الوداع کا سفر تھا۔ آپ نے طوافِ زیارت کے بعد احرام اتارا اور اپنی تمام ازواج مطہرات کے ساتھ تعلق قائم کیا اگرچہ عام حالات حضر میں آپ نے باری مقرر کر رکھی تھی، حالانکہ یہ باری مقرر کرنا نبی ﷺ پر فرض نہیں تھا۔

اس ماقبل بیان کے ساتھ ان کے دوسرے اعتراض کا جواب بھی سامنے آیا کہ باری مقرر کرنے کے متعلق روایت اور ایک رات میں مجامعت کرنے کے درمیان کوئی تعارض نہیں جبکہ یہ بالاتفاق معلوم ہے کہ سفر میں عام مردوں پر بھی باری کی تقسیم واجب نہیں۔

حدیث 11 : حالت حیض میں مباشرت[2]

عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں: میں اور رسول اللہ ﷺ ایک برتن سے غسل کرتے تھے جبکہ ہم حالت جنابت میں ہوتے تھے اور حالت حیض میں آپ مجھے حکم دیتے تو میں ازار پہن لیتی اور آپ مجھ سے اختلاط کرتے تھے۔ اور بحالت اعتکاف آپ اپنا سر مسجد سے میری طرف نکال دیتے تھے اور میں اس کو دھو دیتی، حالانکہ میں حائضہ ہوتی تھی۔[3]

[1] صحیح مسلم، الحیض، باب جواز نوم الجنب واستحباب......، حدیث: 309. [2] صحیح البخاري، الحیض، باب مباشرة الحائض، حدیث: 299,300,301. [3] مقام حدیث، ص: 220.

اس حدیث پر سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ حالتِ حیض میں مباشرت قرآن کی رو سے منع ہے جبکہ حدیث میں اس کا اثبات ہو رہا ہے۔

جواب یہ حدیث صحیح ہے لیکن اس بات میں کوئی قباحت نہیں کہ میاں بیوی اپنے گھر میں اکٹھے غسل کریں۔ حالت حیض میں ازار کے اوپر مباشرت کرنے میں بھی کوئی حرج نہیں لیکن مباشرت کا معنی اختلاط (جماع فی الفرج) کرنا تلبیس ہے۔ مباشرت کا معنی ہے: ''بدن کے ساتھ بدن ملانا'' یہ معنی احادیث میں اکثر استعمال ہوتا ہے۔ قرآن میں مباشرت کا معنی مجامعت ہے لیکن ہر آیت میں یہی معنی مراد لینے کا کوئی قرینہ ہوتا ہے۔ یہاں بھی ازار باندھنا اس بات کی صریح دلیل ہے کہ اس سے مجامعت مراد نہیں۔ معتکف کا مسجد سے سر نکالنا اور حائضہ کا اسے دھو دینا جائز ہے کیونکہ حائضہ کے ہاتھ اور پاؤں وغیرہ پاک ہوتے ہیں۔

حدیث 12: حالت استحاضہ میں اعتکاف کرنا[1]

عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ آپ کی اہلیہ نے اعتکاف کیا جبکہ وہ خون اور زردی کو دیکھتی تھیں اور نماز پڑھنے کی حالت میں طشت اس کے نیچے رکھا رہتا تھا۔[2]

جواب حدیث صحیح ہے لیکن طلوع اسلام والوں نے دھوکا دینے کی کوشش کی ہے صرف خون اور زردی کے ذکر سے وہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ حالت حیض تھی جبکہ حدیث میں واضح ہے کہ وہ عورت مستحاضہ تھی اور امام بخاری رحمہ اللہ نے یہ حدیث باب الاستحاضہ میں بیان کی ہے۔ حالت استحاضہ میں مسجد میں داخل ہونا، اعتکاف کرنا اور نماز پڑھنا بالکل

[1] صحیح البخاري، الحیض، باب اعتکاف المستحاضة، حدیث: 309. [2] مقام حدیث، ص:321.

جائز ہے۔ اور وہ طشت اس لیے رکھتی تھیں کہ مسجد گندی نہ ہو۔

حدیث 13: دوران روزہ بیوی کا بوسہ لینا[1]

”عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم روزے کی حالت میں اپنی ازواج مطہرات کا بوسہ لیا کرتے تھے اور مباشرت بھی کیا کرتے تھے مگر وہ اپنی خواہش پر تم سب سے زیادہ قابو رکھنے والے تھے۔“[2]

جواب یہ حدیث بھی صحیح ہے، یہاں بھی منکرینِ حدیث نے مباشرت کو جماع پر محمول کرکے دھوکا دینے کی کوشش کی ہے۔ مباشرت کے لغوی معنی ہیں: ”بدن کے ساتھ بدن ملانا“ حدیث کا آخری جملہ اس کی صریح دلیل ہے کہ آپ اپنی خواہش پر زیادہ ضبط رکھتے تھے، یعنی جماع نہیں کرتے تھے۔ اس میں یہ سبق بھی مضمر ہے کہ امتی اس مسئلے میں آپ کی اتباع نہ کریں کیونکہ انھیں اپنی خواہش پر ضبط وقابو رکھنے کی طاقت نہیں۔

حدیث 14: رمضان میں جنابت سے غسل کیے بغیر روزہ رکھنا[3]

پرویز نے عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی حدیث نقل کی ہے، انھوں نے کہا: میں یقین کے ساتھ بیان کرتی ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم احتلام کے بغیر جماع کی وجہ سے بحالت جنابت صبح کرتے اور پھر روزہ رکھ لیتے تھے۔ ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے بھی اس بات کی تائید کی، پھر ابوجعفر کی روایت بیان کی کہ میں نے ابوعبداللہ سے پوچھا کہ اگر کوئی شخص قصداً کھا پی کر روزہ توڑ دے تو کیا وہ جماع کرنے والے کی طرح کفارہ دے گا۔ انھوں نے کہا: نہیں، کیا تم دیکھتے نہیں کہ حدیث میں یہ الفاظ صاف موجود ہیں:

[1] صحيح البخاري، الصوم، باب المباشرة للصائم، حديث: 1927. [2] مقام حدیث، ص: 321.
[3] صحيح البخاري، الصوم، باب اغتسال الصائم، حديث: 1931.

«لَمْ يَقْضِ عَنْهُ صِيَامُ الدَّهْرِ»

''ساری عمر کے روزے بھی اس کی قضا نہیں دے سکتے۔''[1]

جواب حدیث اول صحیح ہے۔ یہاں دو روایات کو جمع کر دیا گیا ہے۔ اس حدیث میں منکرین کو کون سی قباحت محسوس ہوتی ہے کہ انھوں نے اس پر بھی اعتراض کیا ہے۔ اگر انسان پر غسل جنابت فرض ہو لیکن وہ وقت کی کمی کی وجہ سے پہلے سحری کھا کر روزہ رکھ لے اور پھر بعد میں غسل کر لے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

مزید برآں مجامعت کی وجہ سے روزہ توڑنا اور کچھ کھا پی کر روزہ توڑنے میں طبعی فرق ہے، شہوت کے غلبہ سے انسان کبھی مغلوب الحال ہو جاتا ہے تو اس کے لیے کفارہ دینے سے تلافی ہو سکتی ہے لیکن کھانے پینے کی حالت میں انسان اتنا مغلوب الحال نہیں ہوتا کہ اسے معذور سمجھ کر یہ رخصت دی جائے، لہٰذا کھانے پینے سے روزہ توڑنا زیادہ بڑا جرم ہے، یاد رہے کہ لَمْ يَقْضِ والی حدیث ثابت نہیں ہے، لہٰذا اس کے ساتھ اعتراض کرنا درست نہیں۔ جتنی بات حدیث میں ثابت ہے وہی قبول ہے۔

حدیث 15: صحابہ کا نبی ﷺ کے تھوک مبارک کو اپنے چہروں اور بدن پر ملنا۔''[2]

طلوع اسلام والوں کے نزدیک یہ نفاست کے خلاف ہے۔ صلح حدیبیہ کی حدیث میں اس کی تفصیل موجود ہے کہ عروہ بن مسعود ثقفی نے، جو مشرکین کی طرف سے سفیر مصالحت تھا، واپس جا کر صحابۂ کرام کے بارے میں پانچ ایسی باتیں بیان کیں جن سے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے دلوں میں نبی ﷺ کی بے پناہ محبت اور احترام ظاہر ہوتا تھا اور مشرکین پر دباؤ

[1] سنن أبي داود، الصيام، باب التغليظ فيمن أفطر عمدا، حديث: 2396، و مقام حدیث، ص: 322. [2] صحيح البخاري، الشروط، باب الشروط في الجهاد والمصالحة ...... حديث: 2732,2731.

پڑتا تھا، وہ پانچ باتیں یہ ہیں:

1 جب نبی ﷺ تھوکتے ہیں تو صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اسے اپنے ہاتھوں میں لے کر منہ اور بدن پر مل لیتے ہیں۔

2 جب نبی ﷺ کوئی حکم دیتے ہیں تو وہ اس پر تعمیل میں لپکتے ہیں۔

3 جب آپ ﷺ وضو کرتے ہیں تو صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم وضو کا پانی لینے کے لیے لڑ پڑنے کے قریب ہو جاتے ہیں۔

4 جب آپ ﷺ بات کرتے ہیں تو وہ خاموشی کے ساتھ سنتے ہیں۔

5 ادب اور تعظیم کی وجہ سے نظر بھر کر آپ کی طرف نہیں دیکھتے۔

جواب حدیث بالکل صحیح ہے لیکن افسوس منکرینِ حدیث کی حالت پر، ایک کافر شخص جن افعال کو نبی ﷺ کی تعظیم اور احترام سمجھتا ہے، یہ انھیں نفاست کے خلاف سمجھتے ہیں۔ یہ لوگ مقامِ محبت کو نہیں سمجھتے، والہانہ محبت میں، محبت کرنے والے پر اس سے بھی زیادہ جذباتی حالت غالب آ جاتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ انکارِ حدیث نبی ﷺ کے ساتھ صریح دشمنی کے علاوہ اور کچھ نہیں، انھیں محبت رسول سے کیا تعلق۔

حدیث 16: عزل کرنا[1]

معلوم نہیں کہ منکرینِ حدیث اس حدیث عزل پر کیا اعتراض کرتے ہیں لیکن انھوں نے اس حدیث کو بھی انھی احادیث میں شمار کیا ہے جن پر انھیں اعتراض ہے۔ حدیث کے الفاظ

«لَا عَلَيْكُمْ أَلَّا تَفْعَلُوا ذٰلِكُمْ»

”اگر تم یہ نہ کرو تو تم پر کوئی حرج نہیں۔“[2]

[1] صحيح البخاري، النكاح، باب العزل، حديث: 5207-5210. [2] صحيح البخاري، »

کے متعلق محدثین نے دو توجیہات کی ہیں۔ اول یہ کہ اگر تم یہ نہیں کرتے تو تم کو کوئی نقصان نہیں ہوگا، دوم یہ کہ مت کرو تم پر نہ کرنا لازم ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ نبی ﷺ نے عزل کرنا ناپسند فرمایا ہے، البتہ منع کرنا صریح الفاظ میں نہیں، اس میں اختیار ہے کہ کوئی عزل کرے یا نہ کرے لیکن عزل کرنے سے یہ عقیدہ نہ رکھے کہ ایسا کرنے سے بچہ پیدا نہیں ہوگا کیونکہ جو تقدیر میں لکھا ہے اسے کوئی روک نہیں سکتا۔

حدیث 17: بعض مسلمانوں کے ارتداد کی پیشین گوئی

روز قیامت چند آدمی لائے جائیں گے اور فرشتے انھیں جہنم کی طرف لے جائیں گے۔ اس وقت میں کہوں گا: اے رب! یہ میرے صحابی ہیں۔ جواب ملے گا: یہ لوگ تیرے مرنے کے بعد مرتد ہو گئے تھے۔[1] اس حدیث کو درج کرنے کے بعد پرویز صاحب نے لکھا ہے کہ یہ کچھ صحابہ کبار کے متعلق کہا جا رہا ہے۔ (معاذ اللہ) کیا آپ بھی تصور کر سکتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایسے فرمایا ہوگا۔[2]

جواب حدیث بالکل صحیح ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ نبی ﷺ غیب نہیں جانتے تھے، جیسا کہ عیسیٰ علیہ السلام کو بھی علم غیب نہیں تھا۔ مزید برآں اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض لوگ نبی ﷺ کی وفات کے بعد مرتد ہو گئے تھے لیکن وہ کبار صحابہ نہیں تھے بلکہ وہ چند نو مسلم لوگ تھے جن کے ساتھ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جہاد کیا۔ ان کو شرعی اصطلاح میں صحابہ نہیں کہا جا سکتا کیونکہ اصطلاحِ شریعت میں صحابی وہ ہے جس نے نبی ﷺ کو دیکھا، ان پر ایمان لایا اور پھر موت تک حالت ایمان پر قائم رہا، اور بعض اہل علم کا قول ہے کہ انھوں نے زکاۃ ادا

البیوع، باب بیع الرقیق، حدیث: 2229، وصحیح مسلم، النکاح، باب حکم العزل، حدیث: 1438۔ [1] صحیح البخاري، التفسیر، باب: ﴿وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا ......﴾، حدیث: 4625۔ [2] مقام حدیث، ص: 187۔

کرنے سے انکار کیا تھا جس سے ان پر ارتداد حقیقی کا حکم لاگو ہو جاتا ہے۔

حدیث 18: جواز لواطت کے بارے میں منکرینِ حدیث کا جھوٹ

جواب اس مسئلے میں بہت تفصیل ہے لیکن حاصل کلام یہ ہے کہ نبی ﷺ کی کسی صحیح ثابت مرفوع حدیث میں اپنی بیوی کے ساتھ وَطِي في الدُبُر (لواطت) کا جواز نہیں ملتا۔ بلکہ اس کے برعکس حرمت ہی ثابت ہوتی ہے امام بخاری رحمہ اللہ نے ابن عمر رضی اللہ عنہما کا ایک مجمل قول نقل کیا ہے[1] جبکہ ابن عمر رضی اللہ عنہما کے قول کا مطلب یہی ہے کہ بیوی سے فرج میں جماع کیا جائے۔ دیکھیے السنن الکبریٰ للنسائي، حدیث: 8978 علاوہ ازیں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مرفوع حدیث منقول ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«لَا يَنْظُرُ اللّٰهُ إِلٰى رَجُلٍ أَتٰى رَجُلًا أَوِ امْرَأَةً فِي الدُّبُرِ»

''اللہ تعالیٰ اس شخص کی طرف نہیں دیکھتا جس نے کسی مرد یا عورت سے دبر میں جماع کیا۔''[2]

امام ترمذی نے اسے روایت کیا ہے اور لواطت سے ممانعت کی روایات مسند احمد، نسائی، ابن ماجہ اور ابن حبان نے بیان کی ہیں، ابن حبان نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے، لہٰذا حجت احادیث مرفوعہ ہیں، ابن عمر رضی اللہ عنہما سے اس مبہم اجمالی قول کے بالمقابل نہایت صراحت کے ساتھ اس قبیح عمل کی ممانعت ثابت ہے، جیسا کہ نسائی کے حوالے سے گزرا لیکن اہلِ طلوعِ اسلام نے خواہ مخواہ حدیث سے انکار کے لیے راستہ ہموار کرنے کے لیے لکھا ہے:

''اس کے بعد فیصلہ آپ خود کر لیجیے کہ اس تفسیر کو رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کیا

① صحیح البخاري، التفسیر، باب: ﴿نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ فَأْتُوا حَرْثَكُمْ أَنّٰى شِئْتُمْ﴾، حدیث: 4526-4528. ② جامع الترمذي، الرضاع، باب ماجاء في کراهية إتيان......، حدیث: 1165.

جا سکتا ہے اور قرآن کو اس قسم کی حدیثوں کی رو سے سمجھا جا سکتا ہے۔“[1]

حدیث 19: متعہ کرنا[2]

طلوع اسلام والے نے متعہ کے متعلق روایات جمع کر کے ہر ایک کے ساتھ بریکٹ میں معاذ اللہ، نعوذ باللہ اور استغفر اللہ کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ اسی طرح متعہ کی احادیث کو باطل بتا کر تمام احادیث سے انکار کرنے کا دروازہ کھولنا چاہا ہے۔ ان کے نزدیک روایات متعہ پر چند غلط نتائج مرتب ہوئے ہیں جو درج ذیل ہیں:

1. متعہ کی اجازت عہد نبوی میں صرف دوران جنگ کے زمانے سے مخصوص نہ تھی۔
2. صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین میں متعہ کا عام رواج تھا۔
3. رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو بار بار منع کر کے آخر میں ابدی حرمت کا اعلان کیا لیکن پھر بھی آپ کے عہد، دور صدیقی اور عہد فاروقی میں کھلم کھلا یہ کام ہوتا رہا۔
4. یہ کام صحابۂ کرام کی شان وشوکت کے خلاف ہے، لہٰذا (بخاری، مسلم کی) یہ تمام روایات متعہ موضوع ہیں۔
5. ابن عباس رضی اللہ عنہما کا اس کے جواز پر استدلال میں

﴿فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ﴾

”جو تم اس نکاح کے ذریعے سے فائدہ حاصل کرتے ہو۔“[3]

پیش کرنا موضوعیت کے ساتھ ساتھ عجمی سازش کا نتیجہ ہے۔

جواب اس بات سے ہمارا اتفاق ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے آخر میں اس سے صراحتاً منع فرمایا لیکن جو نتائج طلوع اسلام نے مرتب کیے ہیں، وہ غلط ہیں۔ پہلے نتیجے میں یہ نقص ہے

---

[1] مقام حدیث، ص: 185. [2] صحيح البخاري، النكاح، باب نهي النبي ﷺ عن نكاح المتعة أخيرًا، حديث: 5115. [3] النسآء 24:4.

کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں اسلامی فوج کو رخصت متعہ صرف جنگ کی حالت میں ضرورت کی بنا پر دی گئی تھی۔ اس کے متعلق امام بخاری رحمہ اللہ نے چند احادیث بیان کی ہیں:

1 حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے فرمایا:

«إِنَّ النَّبِيَّ ﷺ نَهٰى عَنِ الْمُتْعَةِ وَعَنْ لُّحُومِ الْحُمُرِ الْأَهْلِيَّةِ زَمَنَ خَيْبَرَ»

''بے شک نبی ﷺ نے غزوۂ خیبر کے موقع پر متعہ اور پالتو گدھوں کے گوشت سے منع فرمایا۔''[1]

2 ''ابو جمرہ سے روایت ہے انھوں نے کہا: میں نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے سنا، ان سے عورتوں سے متعے کے بارے میں مسئلہ دریافت کیا گیا تو انھوں نے رخصت دی۔ ان کے آزاد کردہ غلام نے ان سے کہا: یہ حکم تو اس وقت ہے جب حالات سخت ہوں اور عورتوں کی قلت ہو، یا ایسی کوئی بات کہی تو ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ہاں۔''[2]

3 جابر بن عبداللہ اور سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں ہم ایک لشکر میں تھے کہ رسول اللہ ﷺ کا قاصد ہمارے پاس آیا اور اس نے کہا:

«إِنَّهُ قَدْ أُذِنَ لَكُمْ أَنْ تَسْتَمْتِعُوا فَاسْتَمْتِعُوا»

''تمھیں متعہ کرنے کی اجازت دی گئی ہے، پس تم متعہ کرو۔''[3]

4 سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں، آپ نے فرمایا:

«أَيُّمَا رَجُلٍ وَّامْرَأَةٍ تَوَافَقَا فَعِشْرَةُ مَا بَيْنَهُمَا ثَلٰثُ لَيَالٍ فَإِنْ

[1] صحيح البخاري، النكاح، باب نهي النبي ﷺ عن نكاح المتعة أخيرًا، حديث: 5115.
[2] صحيح البخاري، النكاح، باب نهي النبي ﷺ عن نكاح المتعة أخيرًا، حديث: 5116.
[3] صحيح البخاري، النكاح، باب نهي النبي ﷺ عن نكاح المتعة أخيرًا، حديث: 5118, 5117.

أَحَبَّا أَنْ يَتَزَايَدَا أَوْ يَتَتَارَكَا تَتَارَكَا فَمَا أَدْرِي أَشَيْءٌ كَانَ لَنَا خَاصَّةً أَمْ لِلنَّاسِ عَامَّةً قَالَ أَبُوعَبْدِاللهِ وَقَدْ بَيَّنَهُ عَلِيٌّ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ أَنَّهُ مَنْسُوخٌ»

”جو کوئی مرد اور عورت باہم موافقت کر لیں تو ان کے درمیان تین دن اور تین رات کی معاشرت ہوگی، پھر اگر وہ دونوں مدت بڑھانا چاہیں تو بڑھالیں یا چھوڑ دیں۔“ میں نہیں جانتا کہ یہ چیز ہمارے لیے خاص تھی یا تمام لوگوں کے لیے عام۔ ابوعبداللہ (امام بخاری رحمہ اللہ) نے کہا: علی رضی اللہ عنہ نے نبی ﷺ سے اسے بیان کیا ہے کہ یہ منسوخ ہے۔[1]

ان احادیث میں سے حدیث دوم سے صراحتاً معلوم ہوا کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کے نزدیک متعہ کا جواز ضرورت کے ساتھ خاص تھا، عام نہیں تھا۔ حدیث سوم سے معلوم ہوا کہ یہ لشکر، یعنی حالت جنگ کے ساتھ خاص تھا اور اس حدیث سوم کو امام بیہقی رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے جس میں تخصیص کی تصریح کی ہے اور کہا ہے کہ ہمیں (لشکر والوں کو) صرف تین دن کی رخصت دی گئی، پھر رسول اللہ ﷺ نے منع فرما دیا۔

حدیث اول میں مذکور ہے کہ علی رضی اللہ عنہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما کو بتایا کہ رسول اللہ ﷺ نے خیبر کے دن اس سے منع فرما دیا تھا۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ متعے کی رخصت نبی ﷺ کے زمانے میں حالت جنگ کے ساتھ خاص تھی اس کی عام اجازت نہیں دی گئی۔

امام نووی رحمہ اللہ اور دیگر اہل علم نے فرمایا ہے کہ متعے کی تحریم اور اجازت دو مرتبہ ہوئی۔ خیبر سے پہلے حلال تھا تو خیبر میں حرام کیا گیا، پھر یوم اوطاس (فتح مکہ کے قریب)

[1] صحيح البخاري، النكاح، باب نهي النبي ﷺ عن نكاح المتعة أخيرًا، حديث: 5119.

صرف تین دن کے لیے اجازت دی گئی اور پھر قیامت تک کے لیے حرام قرار دے دیا گیا۔ ابو داود کی روایت میں جو ہے کہ نبی ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر اس سے منع فرمایا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ حرمت پہلے اوطاس کے روز سے تھی لیکن اس حرمت کا عام اعلان خطبۂ حجۃ الوداع میں کیا گیا۔

نوٹ: میرے نزدیک نکاح متعہ کی حرمت مکہ مکرمہ میں مکی سورتوں میں نازل ہوئی تھی جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۝ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ۝ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ۝

''اور وہ جو اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں مگر اپنی بیویوں یا اپنی لونڈیوں سے نہیں کیونکہ (ان سے مباشرت کرنے میں) ان پر کوئی ملامت نہیں، پس جو شخص اس کے سوا خواہاں ہو تو ایسے لوگ حد سے نکل جانے والے ہیں۔''[1]

نکاح متعہ سے جو بیوی حاصل ہوتی ہے وہ عرف میں زوجہ نہیں ہے کیونکہ زوجیت میں دوام کا معنی مضمر ہے جبکہ متعے میں دوام کی نیت نہیں ہوتی اور لونڈیوں کو بھی عرف میں زوجہ نہیں کہتے، نیز نکاح متعہ میں لونڈیاں داخل نہیں۔ معلوم ہوا کہ نکاح متعہ جو اس (بیوی اور لونڈی) کے سوا ہے، حرام میں داخل ہے۔

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ علی رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث سے معلوم ہوا کہ نکاح متعہ غزوۂ خیبر تک حلال تھا اور خیبر میں منع کیا گیا، اس کی مثال یہ ہے کہ مردار خون، خنزیر اور جو چیز غیر اللہ کے نام پر ذبح کی جائے، یہ تو ابتدا ہی سے حرام تھیں لیکن سورۂ انعام، نحل، بقرہ اور مائدہ میں اس کے متعلق خصوصی اعلان کیا گیا کہ خصوصاً جو

[1] المؤمنون 23:5-7.

چیز غیراللہ کے نام پر مشہور کی جائے وہ شرک ہے۔ مزید برآں بخاری شریف کی روایت سے ثابت ہے کہ زید بن عمرو بن نفیل اور نبی ﷺ نبوت سے پہلے بھی غیر اللہ کے نام کا ذبیحہ نہیں کھایا کرتے تھے کیونکہ یہ شرک ہے۔ اسی طرح متعہ پہلے حرام تھا لیکن ہوسکتا ہے کہ خیبر میں کسی نے متعہ کرنے کا ارادہ کیا ہو تو نبی ﷺ نے صراحتاً اس سے منع کر دیا ہو۔

فائدہ: ابن عباس، ابن مسعود اور جابر رضی اللہ عنہم کو دائمی ممانعت کی روایت نہیں پہنچی تھی اس لیے وہ متعے کے جواز کے قائل تھے۔ جب ان کو یہ روایت پہنچ گئی تو انھوں نے اپنے قول سے رجوع کرلیا جیسا کہ امام ترمذی نے اسے بیان فرمایا ہے۔

سوال عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں، ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ غزوہ میں شریک تھے اور ہمارے لیے کوئی چیز نہیں تھی تو ہم نے عرض کیا:

«فَقُلْنَا: أَلَا نَسْتَخْصِي؟ فَنَهَانَا عَنْ ذٰلِكَ ثُمَّ رَخَّصَ لَنَا أَنْ نَّنْكِحَ الْمَرْأَةَ بِالثَّوْبِ ثُمَّ قَرَأَ عَلَيْنَا: ﴿يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا......﴾

”کیا ہم اپنے آپ کو خصی نہ کرلیں؟ تو آپ نے ایسا کرنے سے ہمیں منع فرمایا، پھر آپ نے کپڑے کے عوض عورت سے نکاح کرنے کے بارے میں ہمیں اجازت مرحمت فرمائی۔ اس کے بعد آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی: اے ایمان والو! ہم نے تمھارے لیے جو پاکیزہ چیزیں حلال کی ہیں انھیں حرام نہ کرو۔“[1]

اس حدیث سے ثابت ہوا کہ قرآن کے عموم سے متعے کا جواز ثابت ہوتا ہے۔

جواب حقیقت کی نظر سے دیکھیں اس سے بالکل واضح معلوم ہوتا ہے کہ صحابۂ کرام سفر میں تھے اور کثرت شہوت کی وجہ سے وہ اس حالت تک پہنچ گئے تھے کہ انھوں نے آپ

[1] صحيح البخاري، النكاح، باب مايكره من التبتل والخصاء، حديث:5075، والتفسير، باب قوله تعالى: ﴿يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا......﴾ المآئدة 5:87، حديث:4615.

سے اجازت طلب کی کہ وہ اپنے آپ کو خصی کر لیتے ہیں۔ آپ ﷺ نے ان کی یہ اضطراری حالت دیکھ کر انھیں خصی ہونے کے بارے میں اجازت نہ دی بلکہ متعے کی اجازت مرحمت فرمائی لیکن یہ اسلام کے آغاز کا واقعہ ہے، پھر منسوخ ہو گیا جیسا کہ امام محمد نے کتاب الآثار میں متعے کی رخصت کے بارے میں عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی روایت پیش کی ہے کہ صحابۂ کرام کو ایک غزوہ میں متعے کی اجازت دی گئی تھی جب انھوں نے ازواج نہ ہونے کی شکایت کی تھی۔ اس کے بعد آیت نکاح، میراث اور مہر کے متعلق آیات نازل ہوئیں تو متعے کو منسوخ کر دیا گیا۔ ہوسکتا ہے اس آیت کا مصداق زمانۂ رخصت متعہ ہو اور اس وقت اسے حرام کہنا منع تھا۔ اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ طلوع اسلام کے وہ نتائج اخذ کرنا کہ احادیث میں متعے کی اجازت عام ہے، صحابۂ کرام میں اس کا عام رواج تھا اور دور صدیقی اور عہد فاروقی میں کھلم کھلا چل رہا تھا، یہ نتائج سب کے سب باطل ہیں۔ یہ احادیث سے انکار کرنے کا راستہ کھولنے کی بے ہودہ کوشش ہے اور اس سے روافض کا جوازِ متعہ کے لیے استدلال بھی غلط ہے۔

حدیث 20: سورج کا عرش کے نیچے سجدہ کرنا[1]

ابو ذر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ غروب آفتاب کے وقت میں نبی ﷺ کے ساتھ مسجد میں تھا تو آپ نے فرمایا: ''ابوذر! کیا تم جانتے ہو کہ سورج کہاں جاتا ہے؟'' میں نے عرض کیا: اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں۔ آپ نے فرمایا:

«فَإِنَّهَا تَذْهَبُ حَتّٰى تَسْجُدَ تَحْتَ الْعَرْشِ فَتَسْتَأْذِنَ فَيُؤْذَنَ لَهَا وَيُوشِكُ أَنْ تَسْجُدَ فَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا وَتَسْتَأْذِنُ فَلَا يُؤْذَنُ لَهَا

[1] مقام حدیث، ص: 228.

يُقَالُ لَهَا: ارْجِعِي مِنْ حَيْثُ جِئْتِ فَتَطْلُعُ مِنْ مَّغْرِبِهَا فَذٰلِكَ قَوْلُهُ تَعَالٰی:

''وہ جا کر عرش کے نیچے سجدہ کرتا ہے اور پھر طلوع ہونے کی اجازت طلب کرتا ہے تو اسے اجازت دی جاتی ہے۔ اور قریب ہے کہ وہ سجدہ کرے اور وہ قبول نہ ہو اور وہ اجازت طلب کرے اور اسے اجازت نہ ملے اور اسے کہہ دیا جائے کہ جہاں سے آئے ہو واپس لوٹ جاؤ، پس وہ مغرب سے طلوع ہوگا۔''

اس آیت کریمہ ﴿ وَالشَّمْسُ تَجْرِيْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ۭ ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ۝ ﴾[1] کا یہی مطلب ہے۔[2]

اس حدیث کے متعلق منکرینِ حدیث پوری دلچسپی رکھتے ہیں۔ ان کی نظر میں یہ حدیث جدید نظریۂ سائنس کے خلاف ہے۔ جدید نظریۂ سائنس کے مطابق سورج اپنی جگہ پر قائم ہے اس میں طلوع وغروب کی صفت نہیں بلکہ زمین اس کے گرد گھومتی ہے۔ اسی طرح اس حدیث میں حرکت شمس کے ساتھ ساتھ اس کا تحت العرش سکون بھی معلوم ہوتا ہے اور یہ متضاد صفات ہیں۔ سورج میں یہ صفت ثابت نہیں کہ وہ کسی وقت کسی خاص جگہ حرکت بند کر دیتا ہے۔

جواب: سورج کا طلوع وغروب قرآن کریم سے ثابت ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ فَاِنَّ اللّٰهَ يَاْتِيْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِيْ كَفَرَ ﴾

''بے شک اللہ تو سورج کو مشرق کی طرف سے نکالتا ہے، تو مغرب کی طرف سے نکال کر دکھا تو (یہ بات سن کر) وہ کافر لاجواب ہو گیا۔''[3]

---

(1) یٰسٓ 38:36. (2) صحيح البخاري، بدء الخلق، باب صفة الشمس والقمر، حديث: 3199.
(3) البقرة 258:2.

نیز فرمایا:

﴿ حَتّٰٓی اِذَا بَلَغَ مَغْرِبَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَغْرُبُ فِیْ عَیْنٍ حَمِئَةٍ ﴾

”یہاں تک کہ جب وہ سورج کے غروب ہونے کی جگہ تک پہنچ گیا تو اسے ایک دلدل کے چشمے میں ڈوبتا ہوا پایا۔“[1]

اس طرح قرآن کریم میں مشرق ومغرب، مشرقین ومغربین اور مشارق ومغارب کے الفاظ بھی اس بات کی صریح دلیل ہیں کہ سورج طلوع وغروب ہوتا ہے۔ یہ طلوع وغروب اللہ تعالیٰ نے سورج کی صفات میں بیان کیا ہے، لہٰذا ہم سائنس کے اس نظریے کو ماننے کے لیے تیار نہیں جو قرآن کریم کے خلاف ہو کیونکہ سائنسی نظریات بدلتے رہتے ہیں۔ سورج اور زمین کی حرکت کے متعلق اب تک چار نظریات بدل چکے ہیں۔ کبھی زمین ساکن اور سورج متحرک اور کبھی اس کے برعکس تو سورج کے متعلق اس حدیث میں جو صفت بیان کی گئی ہے کہ وہ کہاں جا رہا ہے اور یہ کہ وہ عرش کے نیچے سجدہ کرنے جاتا ہے تو اس سے انکار نہیں ہو سکتا۔ مزید برآں سورج کے سجدہ کرنے سے اس کا کسی خاص جگہ پر ساکن ہونا لازم نہیں آتا۔ مختلف چیزوں کا سجدہ ان کی اپنی حیثیت کے مطابق ہی ہوتا ہے، لہٰذا سورج سجدہ کرتا ہے جس طرح اس کے مناسب حال ہوتا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَّالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدٰنِ ○ ﴾

”اور بیلیں اور درخت سجدہ کرتے ہیں۔“[2]

نیز فرمایا:

﴿ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِی الْاَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَآبُّ وَكَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ ﴾

[1] الکھف 18:86. [2] الرحمٰن 55:6.

"کیا آپ نہیں دیکھتے کہ اللہ کے حضور آسمان و زمین کی کل کائنات، سورج، چاند، ستارے، پہاڑ، درخت، چوپائے اور بہت سے لوگ سجدہ بجالاتے ہیں۔"[1]

اس آیت میں ہر چیز کا سجدہ اس کی شان کے مطابق مراد ہے۔ سورج کا تحت العرش سجدہ کرنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ کہیں رک جاتا ہے۔ وہ تو ہر وقت رب العرش کے حکم کے مطابق چلتا ہے، لہٰذا قرآن کریم میں جو مستقر مذکور ہے اس حدیث کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا درست ہے کہ سورج کے اپنے مستقر کی طرف جانے سے مراد تحت العرش سجدہ کرنا ہے۔

حدیث 21: جہنم کے سانس لینے سے سردی اور گرمی کا موسم بدلنا

نبیٔ کریم ﷺ نے فرمایا کہ جہنم نے اپنے رب سے شکایت کی: اے میرے رب! میرے ایک حصے نے دوسرے حصے کو کھا لیا ہے تو اللہ تعالیٰ نے اسے دو مرتبہ سانس لینے کی اجازت دے دی۔ ایک سانس جاڑے میں اور دوسرا گرمی میں، پس تم جو سخت گرمی اور سردی دیکھتے ہو تو یہ جہنم کا سانس ہے۔[2]

اس میں منکرین حدیث کی طرف سے دو اعتراض سامنے آئے ہیں:

1. گرمی اور سردی دونوں موسم زمین کے سارے حصوں میں نہیں ہوتے، بعض میں ہمیشہ گرمی، بعض میں ہمیشہ سردی اور بعض جگہ موسم معتدل رہتا ہے۔
2. گرمی اور سردی کے موسم بدلنے کا تعلق تو سورج کے ساتھ ہوتا ہے جو حصۂ زمین سورج کے زیادہ قریب ہوتا ہے وہاں گرمی ہے اور جو دور ہے وہاں سردی ہے۔ موسم کی تبدیلی کا جہنم کے ساتھ کیا تعلق ہے؟

[1] الحج 22:18. [2] صحیح البخاري، مواقیت الصلاۃ، باب الإبراد بالظهر في شدة الحر، حدیث: 537، ومقام حدیث، ص: 329.

جواب قرآن وسنت میں وارد جہنم کے ذکر اور اس کی تمام تر کیفیات اور حالات کا ماننا ایمان بالغیب میں داخل ہے جو ایمان والوں کی پہلی صفت ہے، فرمایا:

﴿ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ ﴾

''یہ وہ لوگ ہیں جو غیب پر ایمان رکھتے ہیں۔''[1]

لہٰذا اس حدیث میں جس حالت کا ذکر ہے اس پر ایمان لانا مومن پر فرض ہے، خواہ اس کی حقیقت سمجھ وعقل میں آئے یا نہ آئے ،تو جہنم کا سانس لینا اور اس کی تاثیر سے دنیا میں گرمی اور سردی پیدا ہونا اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اذن کے تحت ماننا ضروری ہے، البتہ اللہ تعالیٰ نے دنیا میں بھی اسباب پیدا کیے ہیں۔ ان کی تاثیر بھی اللہ تعالیٰ کے اذن کے تحت موجود ہوتی ہے تو خطۂ ارضی پر گرمی اور سردی پیدا ہونے کے لیے دو اسباب ہیں ایک باطنی، یعنی جہنم کا سانس لینا اور دوسرا ظاہری، یعنی سورج کا قریب اور دور ہونا۔ صحیح جواب یہ ہے کہ حرارت سورج سے ہے اور سورج آگ، یعنی جہنم سے ہے تو سورج سے حاصل شدہ گرمی اصل میں جہنم سے آتی ہے، دوسرا جواب یہ ہے کہ موسم گرما کی حرارت سورج سے ہے اور سورج کی حرارت جہنم سے مکتسب ہے اور جہنم سے آتی ہے، اس لحاظ سے اگر کہا جائے کہ حرارت جہنم سے ہے تو کوئی حرج نہیں۔

حدیث 22: تین چیزوں: گھر، عورت اور گھوڑے میں نحوست ہے

ان تینوں چیزوں کی نحوست کے بارے میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے دو روایات مروی ہیں پہلی حدیث یہ ہے کہ نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«اَلشُّؤْمُ فِي الْفَرَسِ وَالْمَرْأَةِ وَالدَّارِ»

[1] البقرة 2:3.

’’گھوڑے، عورت اور گھر میں نحوست ہے۔‘‘[1]

دوسری حدیث میں ہے کہ صحابہ نے نبیِ اکرم ﷺ کے پاس نحوست کا تذکرہ کیا تو آپ نے فرمایا:

«إِنْ كَانَ الشُّؤْمُ فِي شَيْءٍ فَفِي الدَّارِ وَالْمَرْأَةِ وَالْفَرَسِ»

’’اگر نحوست کسی چیز میں ہوسکتی ہے تو وہ گھر، عورت اور گھوڑے میں ہوسکتی ہے۔‘‘[2]

اسی طرح حضرت سہل بن سعد ساعدی رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے کہ نبیِ اکرم ﷺ نے فرمایا:

«إِنْ كَانَ فِي شَيْءٍ فَفِي الْفَرَسِ، وَالْمَرْأَةِ، وَالْمَسْكَنِ»

’’اگر نحوست کسی چیز میں ہوتی تو عورت، گھوڑے اور گھر میں ہوتی۔‘‘[3]

معلوم ہوتا ہے کہ طلوع اسلام نے ان احادیث کو صرف اس لیے قابل اعتراض بنایا ہے کہ ان کی زد میں عورت آتی ہے اور ان کا تمام تر رجحان عورت کی طرف ہے تو اسے بچانے کے لیے انھوں نے اعتراض کیا کہ ان احادیث کے درمیان تعارض ہے کہ ایک حدیث میں مطلقاً تین چیزوں میں نحوست کا اثبات ہو رہا ہے جبکہ دوسری حدیث میں تعلیق وشرط کے طور پر اس کا ذکر ہو رہا ہے۔

جواب ان احادیث میں کوئی تعارض نہیں بلکہ اصول حدیث میں ہے کہ جب کسی حدیث میں لفظ زیادہ ہو اور راوی ثقہ اور معتمد ہو تو یہ زیادت قبول ہوتی ہے۔

اسی طرح ایک حدیث دوسری حدیث کے لیے تفسیر بھی ہوتی ہے تو ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی دوسری حدیث اور سہل بن سعد ساعدی رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث، ابن عمر سے مروی

[1] صحيح البخاري، النكاح، باب مايتقى من شؤم المرأة، حديث:5093. [2] صحيح البخاري، النكاح، باب مايتقى من شؤم المرأة...... ، حديث:5094. [3] صحيح البخاري ، النكاح، باب مايتقى من شؤم المرأة...... ، حديث:5095.

پہلی حدیث کی تفسیر ہیں، یعنی نحوست کسی چیز میں معتبر ہو گی تو ان تین چیزوں میں معتبر ہوگی جبکہ شرعاً ان تین چیزوں میں معتبر نہیں تو معلوم ہوا کہ نحوست کسی چیز میں بھی نہیں، نیز نحوست کا معنی عربی میں ''تَطَیُّر'' ہے، یعنی بد فال لینا، دور جاہلیت میں ان تین چیزوں سے فالِ بد لی جاتی تھی۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے یہ احادیث درج ذیل آیت کی تفسیر میں بیان کی ہیں:

﴿ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ وَ اَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ فَاحْذَرُوْهُمْ ﴾

''اے ایمان والو! بلاشبہ تمھاری بیویوں میں سے اور تمھاری اولاد میں سے بعض تمھارے دشمن ہیں، پس ان سے محتاط رہو۔''[1]

یعنی انسان فطری طور پر اولاد اور بیوی سے محبت رکھتا ہے۔ کبھی یہ محبت حد سے بڑھ جاتی ہے یہاں تک کہ اس کو اللہ تعالیٰ، اس کے دین اور اس کے ذکر سے غافل کر دیتی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُلْهِكُمْ اَمْوَالُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ﴾

''اے ایمان والو! تمھارے مال اور تمھاری اولاد تمھیں اللہ کی یاد سے غافل نہ کرنے پائے۔''[2]

جب مال و اولاد اور ازواج کی محبت اس حد تک پہنچ جائے تو وہ شامت اور بدفالی کا سبب بن سکتی ہے۔ اسی طرح (حدیث میں مذکور) ان تین چیزوں کی محبت اور ان میں مشغولیت بھی انسان کے لیے نحوست کا سبب بن جاتی ہے۔

حدیث 23: بیل اور بھیڑیے کا باتیں کرنا

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''گزشتہ اقوام میں ایک شخص

[1] التغابن 14:64. [2] المنافقون 9:63.

بیل پر سوار تھا بیل نے اس سے مخاطب ہو کر کہا: ہم سواری کے لیے نہیں پیدا کیے گئے بلکہ ہم کھیتی باڑی کے لیے پیدا کیے گئے ہیں۔'' آپ ﷺ نے فرمایا:

''میں، ابوبکر اور عمر (رضی اللہ عنہما) اس بات پر یقین رکھتے ہیں۔'' اور ایک بھیڑیے نے بکری پکڑ لی۔ چرواہا اس کے پیچھے دوڑا اور بکری کو اس کے منہ سے چھڑا لیا تو بھیڑیے نے کہا: یوم السبع میں بکریوں کا محافظ کون ہوگا؟

آپ ﷺ نے فرمایا: میں، ابوبکر اور عمر (رضی اللہ عنہما) اس بات پر یقین رکھتے ہیں۔''[1]

اس حدیث میں طلوع اسلام والوں کے لیے باعث اعتراض بات یہ ہے کہ اس میں بیل اور بھیڑیے کا بات کرنا ثابت ہوتا ہے جو خلاف عقل ہے، لہٰذا وہ حدیث سے انکار کرتے ہیں۔

جواب قرآن کریم سے ثابت ہے کہ پرندے اور دیگر حیوانات باتیں کرتے ہیں، سلیمان علیہ السلام کے واقعے میں چیونٹی اور ہد ہد کا باتیں کرنا ثابت ہے۔ سلیمان علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے یہ معجزہ عطا کیا تھا کہ وہ ان کی باتیں سمجھتے تھے۔

یہ واقعہ جو حدیث میں مذکور ہے اس میں غالب احتمال یہ ہے کہ یہ سوار شخص اور چرواہا اللہ تعالیٰ کے نیک بندے ہوں اور یہ ان کی کرامت ہو جو ہمیشہ نہیں ہوتی اور کسی کے اختیار میں بھی نہیں ہوتی، صرف اللہ تعالیٰ ایسے خرق عادت امور کا اظہار اس لیے کرتا ہے کہ بندۂ مومن اس واقعے کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرے تاکہ اللہ تعالیٰ کی الوہیت کے لیے مستقل دلیل بن جائے۔

حدیث 24: شیطان کا اذان سن کر ہوا خارج کرتے ہوئے بھاگنا

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

[1] صحيح البخاري، الحرث والمزارعة، باب استعمال البقر للحراثة، حديث: 2324.

”جب نماز کے لیے اذان دی جاتی ہے تو شیطان پیٹھ پھیر کر ریح خارج کرتا ہوا بھاگ جاتا ہے اور اتنی دور چلا جاتا ہے جہاں سے اسے اذان کی آواز سنائی نہیں دیتی، پھر جب مؤذن خاموش ہو جاتا ہے تو وہ سامنے آجاتا ہے، پھر جب اقامت کہی جاتی ہے تو وہ پھر پیٹھ پھیر کر بھاگ جاتا ہے۔ جب اقامت ہو جاتی ہے تو پھر سامنے آجاتا ہے اور وہ نمازی اور اس کے دل کے درمیان حائل ہو جاتا ہے اور اسے کہتا ہے، فلاں بات یاد کر، فلاں بات یاد کر، اور اسے ایسی باتیں یاد کراتا ہے جو اسے یاد نہیں تھیں، یہاں تک کہ وہ نمازی بھول جاتا ہے کہ اس نے کس قدر نماز پڑھی۔“[1]

حدیث صحیح ہے اور حدیث کی تمام کتابوں میں مذکور ہے۔ طلوع اسلام والے منکرینِ حدیث اس حدیث پر اس لیے اعتراض کرتے اور اس کا استہزا کرتے ہیں کہ وہ شیطان کے ذاتی تشخص کے قائل نہیں۔ وہ اسے انسان کی اندرونی سرکش قوتیں قرار دیتے ہیں۔ جب کوئی شخص شیطان کے وجود ہی کا منکر ہو وہ بھلا یہ کیسے تصور کر سکتا ہے کہ شیطان ریح خارج کرتا اور آتا جاتا ہے۔

قرآن کریم سے ثابت ہے کہ شیطان کا ذاتی تشخص ہے، اس کی اولاد اور قبیلہ ہے اور اس کے دیگر اعمال اور اوصاف بھی ثابت ہیں۔ ارشاد ہوا:

﴿ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّ خَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ ۝ ﴾

”تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا اور اسے مٹی سے پیدا کیا۔“[2]

اس آیت میں شیطان اور انسان کے الگ الگ مادۂ تخلیق بیان کرنے سے شیطان کا ذاتی تشخص ثابت ہوتا ہے۔ مزید ارشاد ہوا:

[1] صحيح البخاري، الأذان، باب فضل التأذين، حديث: 608. [2] الأعراف 12:7.

﴿ كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ ؕ اَفَتَتَّخِذُوْنَهٗ وَذُرِّيَّتَهٗۤ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِيْ وَهُمْ لَكُمْ عَدُوٌّ ﴾

''وہ (ابلیس) جنوں میں سے تھا، پس اس نے اپنے رب کے حکم کی نافرمانی کی تو کیا تم میرے سوا اس کو اور اس کی اولاد کو دوست قرار دیتے ہو، حالانکہ وہ تمھارے دشمن ہیں۔''[1]

اس آیت میں شیطان کا سلسلۂ نسب بیان کیا گیا ہے کہ وہ جنوں میں سے تھا اور یہ بھی ثابت ہوا کہ اس کی اولاد بھی ہے۔ مزید فرمایا:

﴿ قَالَ فَاخْرُجْ مِنْهَا فَاِنَّكَ رَجِيْمٌ ۙ وَّاِنَّ عَلَيْكَ اللَّعْنَةَ اِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ ۝ ﴾

''فرمایا: تو یہاں سے نکل جا کیونکہ تو مردود ہے اور تجھ پر قیامت تک کے لیے لعنت ہے۔''[2]

ان آیات میں آدم علیہ السلام اور ابلیس کا قصہ بیان کیا گیا ہے کہ شیطان نے آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے سے انکار کیا تو اللہ تعالیٰ نے اسے مردود قرار دیا اور اس پر لعنت کی، اس سے ثابت ہوا کہ ابلیس کا ذاتی تشخص ہے۔ مزید ارشاد ہوا:

﴿ اِنَّهٗ يَرٰىكُمْ هُوَ وَقَبِيْلُهٗ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ ﴾

''بے شک وہ (ابلیس) اور اس کا قبیل تمھیں اس جانب سے دیکھ رہا ہے کہ تم ان کو نہیں دیکھتے ہو۔''[3]

اس آیت میں شیطان کی کیفیت، وجود اور اس کے قبیلے کا ذکر فرمایا۔ اس کے وجود ذاتی کی یہ کیفیت ہے کہ تم انھیں نہیں دیکھ سکتے جبکہ وہ تمھیں دیکھتے ہیں اور یہ ان کے جن ہونے کا ثبوت ہے اور جن کے وجود کے لیے بھی صریح دلیل ہے۔ منکرینِ حدیث جو کہتے

[1] الكهف 50:18. [2] الحجر 35,34:15. [3] الأعراف 27:7.

ہیں کہ جن سے کوہستانی انسان مراد ہے تو اس نظریے کی اس آیت کریمہ میں صریح تردید موجود ہے۔ جب قرآن کریم سے شیطان کا ذاتی تشخص صریح طور پر ثابت ہوتا ہے تو پھر اس کا کھانا پینا، دھوکا دینا، وسوسہ ڈالنا، دینی دعوت سے مرعوب ہونا اور ہیبت کی وجہ سے ریح خارج کرنا عقل سے بعید نہیں۔ منکرینِ حدیث کا سرسید احمد کی تقلید میں قصۂ آدم و ابلیس اور ابلیس کے متعلق صریح آیات کی غیر معقول تاویلیں کرنا کسی عقل مند کے نزدیک قابل تسلیم نہیں ہیں۔

حدیث 25: قبر پر سبز شاخ لگانے سے عذاب قبر میں تخفیف

ایک مرتبہ نبی ﷺ مدینہ کے کسی باغ میں تشریف لے گئے تو دو آدمیوں کی آواز سنی جو اپنی قبروں میں عذاب میں مبتلا تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''ان دونوں کو ان کی قبروں میں عذاب دیا جارہا ہے اور یہ عذاب کسی بڑے گناہ کی وجہ سے نہیں دیا جارہا۔ ان میں سے ایک پیشاب کرتے وقت احتیاط نہیں کرتا تھا جبکہ دوسرا چغل خور تھا، پھر آپ ﷺ نے ایک سبز شاخ منگوائی، اس کے دو ٹکڑے کیے اور دونوں قبروں پر ایک ایک ٹکڑا گاڑ دیا۔ آپ سے عرض کیا گیا: اے اللہ کے رسول! آپ نے ایسے کیوں کیا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''امید ہے کہ جب تک یہ خشک نہ ہوں ان کے عذاب میں تخفیف کردی جائے۔''[1]

اس حدیث کے بارے میں پرویز صاحب کے دو اعتراض ہیں: ایک تو عذاب قبر سے انکار، دوسرا اعتراض یہ ہے کہ سبز شاخ کی وجہ سے عذاب قبر میں تخفیف ہونا۔

عذاب قبر کے بارے میں تفصیلی بحث گزر چکی ہے۔ جہاں تک سبز شاخ کی وجہ سے تخفیفِ عذاب کے مسئلے کا تعلق ہے تو اس کا تفصیلی جواب قرآن کریم سے ثابت ہے، مثلاً

[1] صحيح البخاري، الوضوء، باب من الكبائر أن لا يستتر من بوله، حديث: 216، و مقام حدیث، ص: 231.

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِہٖ ﴾

''اور کوئی چیز ایسی نہیں جو تعریف کے ساتھ اس کی تسبیح نہ کرتی ہو۔''[1]

نیز فرمایا:

﴿ یُسَبِّحُ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ﴾

''جو چیز آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے سب اللہ کی تسبیح بیان کرتی ہے۔''[2]

نیز فرمایا:

﴿ سَبَّحَ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ﴾

''آسمان وزمین کی سب مخلوق نے اللہ کی تسبیح بیان کی۔''[3]

مذکورہ بالا آیات اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ ہر چیز اللہ تعالیٰ کی تسبیح بیان کر رہی ہے، خواہ جان دار ہو یا بے جان، حجر ہو یا شجر، ہر ایک کی تسبیح اس کی شان کے مطابق ہے۔ یہ تسبیح زبانِ حال سے بھی ہوتی ہے اور زبان قال سے بھی اور یہ قانون الٰہی ہے کہ جہاں اخلاص سے ذکر الٰہی اور تسبیح وتحمید کی جائے وہاں رحمت نازل ہوتی ہے، ماحول معصیت سے پاک ہو جاتا ہے اور جہاں اللہ تعالیٰ کی تسبیح وتحمید سے غفلت ہو تو وہاں عذاب الٰہی نازل ہوتا ہے۔ باغ والوں کے قصے میں ہے کہ جب ان پر عذاب نازل ہوا تو ان میں سے بہتر شخص نے کہا:

﴿ اَلَمْ اَقُلْ لَّکُمْ لَوْ لَا تُسَبِّحُوْنَ ○ قَالُوْا سُبْحٰنَ رَبِّنَآ اِنَّا کُنَّا ظٰلِمِیْنَ ○ ﴾

''کیا میں نے نہیں کہا تھا کہ تم اس کی تسبیح کیوں نہیں کرتے، تب کہنے لگے کہ ہمارا رب پاک ہے، بے شک ہم ہی ظالم تھے۔''[4]

[1] بنی إسرآءیل 44:17. [2] الجمعة 1:62. [3] الصف 1:61. [4] القلم 29,28:68.

چنانچہ جب نبی ﷺ نے محسوس کیا کہ ان دونوں قبر والوں کو عذاب ہو رہا ہے تو آپ نے سبز شاخ کو تخفیفِ عذاب کا ذریعہ بنایا اور یہ بھی معلوم ہے کہ نبی ﷺ ہر کام اللہ تعالیٰ کے اذن سے کرتے ہیں اور یہاں اذنِ الٰہی شاخ کے خشک ہونے تک معلق معلوم ہوتا ہے۔ لفظ لَعَلَّ ''شاید'' شک کے معنی میں نہیں بلکہ یقین کے معنی میں ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے کلام میں بھی لفظ لَعَلَّ یقین کے معنی میں آتا ہے اور نبی ﷺ نے حسن رضی اللہ عنہ کے متعلق یہ جملہ فرمایا تھا:

«لَعَلَّ اللهَ أَنْ يُّصْلِحَ بِهِ بَيْنَ فِئَتَيْنِ عَظِيمَتَيْنِ مِنَ الْمُسْلِمِينَ»

''امید ہے کہ اللہ تعالیٰ اس (حسن رضی اللہ عنہ) کے ذریعے سے مسلمانوں کی دو عظیم جماعتوں کے مابین صلح کرا دے۔''[1]

اور نبی ﷺ کا یہ عمل معجزہ اور آپ کی خصوصیت تھی۔ اگرچہ بعض علماء نے اسے عام ہی رکھا ہے۔

حدیث 26: گناہِ کبیرہ، مثلاً: زنا، چوری دخول جنت سے مانع نہیں

اس بارے میں بکثرت احادیث وارد ہیں لیکن طلوع اسلام والوں نے بطور اعتراض ابوذر رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''میرے پاس میرے رب کی طرف سے جبریل علیہ السلام آئے تو انھوں نے مجھے بشارت دی کہ میری امت میں سے جو شخص اس حال میں مرے گا کہ اس نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ بنایا ہو تو وہ جنت میں داخل ہوگا۔'' میں (ابوذر) نے عرض کیا، اگرچہ اس نے زنا کیا ہو یا چوری کی ہو تو آپ نے فرمایا: ''(ہاں!) اگرچہ اس نے زنا کیا ہو یا چوری کی ہو۔''[2]

[1] صحيح البخاري، الصلح، باب قول النبي ﷺ للحسن......، حديث: 2704. [2] صحيح البخاري، الجنائز، باب: ومن كان آخر كلامه......، حديث: 1237، ومقام حدیث، ص: 331.

پرویز صاحب کو جواب دینے سے پہلے دو باتیں بطور تمہید عرض کرتا ہوں:

1 زمانۂ قدیم سے یہ مسئلہ اختلافی رہا ہے۔ معتزلہ کہتے ہیں: جس شخص نے ایمان لانے کے بعد کبیرہ گناہ کا ارتکاب کیا (اور صحیح توبہ نہ کی) تو وہ دائمی جہنمی ہے اگرچہ دنیاوی احکام کے اعتبار سے اسے کافر نہیں کہتے۔

خوارج کہتے ہیں: گناہِ کبیرہ کا مرتکب کافر ہے، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔

اہل السنہ والجماعہ کہتے ہیں: ایسا شخص کافر ہے نہ دائمی جہنمی، دنیا میں اسے فاسق مومن کہا جائے گا اور آخرت میں اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو اس کے تمام گناہ معاف کر کے اسے جنت میں داخل فرما دے اور وہ جہنم سے بچ جائے اور اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو ان گناہوں کی وجہ سے اسے کچھ مدت کے لیے جہنم میں عذاب سے دوچار کرے اور پھر اسے ہمیشہ کے لیے جنت میں داخل فرمادے۔

2 جس حدیث میں ہے کہ جس شخص نے شرک نہ کیا یا جس نے ''لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰه'' کا اقرار کیا وہ جنت میں جائے گا تو اس سے تمام ایمانیات پر ایمان لانا اور ہر قسم کے کفرو شرک سے اجتناب کرنا مراد ہے۔ اس تمہید کے بعد مفصل جواب درج ذیل ہے: اہل سنت والجماعت اپنے عقیدے کے لیے درج ذیل آیات کریمہ سے استدلال کرتے ہیں:

إِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَ يَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ

''بے شک اللہ یہ نہیں بخشے گا کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا جائے اور اس کے سوا جو گناہ ہیں وہ جس کو چاہے بخش دے گا۔''[1]

نیز فرمایا:

قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ أَسْرَفُوْا عَلٰٓى أَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ؕ إِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ

[1] النسآء 4:48.

الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ﴾

”کہہ دیجیے: اے میرے بندو! جنھوں نے اپنے اوپر زیادتیاں کی ہیں، اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہونا، بے شک اللہ تمام گناہ معاف کر دیتا ہے۔“[1]

پہلی آیت میں صاف ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ شرک و کفر کے علاوہ تمام گناہ بخش دیتا ہے، یعنی آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی مشیت کے تحت بندۂ مومن کے تمام گناہ بخش دیتا ہے، اس میں کبیرہ اور صغیرہ دونوں قسم کے گناہ شامل ہیں، خواہ اس نے توبہ بھی نہ کی ہو کیونکہ توبہ کرنے سے تو کافر کا کفر اور مشرک کا شرک بھی قابل معافی جرم قرار پاتا ہے۔

دوسری آیت میں ﴿ يٰعِبَادِيَ ﴾ ”اے میرے بندو!“ کا خطاب ایمان والوں کے لیے ہے، اور انھیں یہ فرمایا: ”بے شک اللہ تمام گناہ بخش دیتا ہے۔“ یہاں بھی توبہ کا ذکر نہیں۔ ہاں! بعض مفسرین نے اس آیت کو عموم پر محمول کیا ہے، یعنی یہ آیت مشرکوں کو بھی محیط ہے اس صورت میں مفہومِ آیت یہ ہے کہ توبہ کرنے سے اللہ تعالیٰ تمام گناہ بخش دیتا ہے۔

نیز فرمایا:

﴿ سَابِقُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ جَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ۙ اُعِدَّتْ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ۭ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ۝ ﴾

”اپنے رب کی مغفرت کی طرف دوڑو اور اس جنت کی طرف جس کی وسعت آسمان اور زمین کی وسعت کے برابر ہے، یہ ان لوگوں کے لیے تیار کی گئی ہے جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائیں، یہ اللہ کا فضل ہے، وہ جسے چاہتا ہے اپنا فضل دیتا ہے اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔“[2]

[1] الزمر 53:39. [2] الحديد 21:57.

سوال اللہ تعالیٰ نے اکثر آیات بشارت میں ایمان کے بعد عمل صالح کا ذکر کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ جنت کے حصول کے لیے ایمان کے ساتھ عمل صالح شرط ہے تو جب عمل صالح نہ ہو بلکہ انسان کبیرہ وصغیرہ گناہ کا مرتکب ہوتو کیا اس کے لیے جنت نہیں؟

جواب ایمان کے دو مرتبے ہیں: ایمان کامل، یعنی عمل صالح کے ساتھ اور ایمان ناقص، یعنی عمل صالح کے بغیر اور حصول جنت کے بھی دو درجے ہیں: درجۂ کاملہ، وہ یہ کہ شروع ہی سے براہِ راست جنت مل جائے اور جہنم سے نجات مل جائے۔ دوسرا درجہ اس طرح ہے کہ شروع میں تو جنت نہ ملے لیکن کچھ زمانہ جہنم میں سزا بھگتنے کے بعد مل جائے تو جہاں ایمان کا پہلا کامل مرتبہ، یعنی عمل صالح کے ساتھ ہے، وہاں حصول جنت کا بھی اول درجہ ہے اور جہاں ایمان کا دوسرا درجہ، یعنی عمل صالح کے بغیر ناقص ایمان تو وہاں حصول جنت کا بھی دوسرا درجہ ہے۔ اس دوسرے درجے میں بھی دخول جنت کی بشارت تو ہے لیکن اول درجے کا ذکر نہیں۔ یہ حدیث بھی اپنی آیات کے مضمون کے ساتھ موافقت رکھتی ہے جس میں صرف ایمان پر وعدۂ جنت کا ذکر کیا گیا ہے، لہٰذا اس پر اعتراض نہیں کیا جا سکتا۔

حدیث 27: بنی اسرائیل چوہے ہیں

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''بنی اسرائیل کا ایک گروہ کھو گیا، معلوم نہیں کیا ہوا، میں خیال کرتا ہوں کہ وہ لوگ چوہے ہی ہیں۔ جب ان کے سامنے اونٹ کا دودھ رکھا جائے تو وہ نہیں پیتے اور جب ان کے سامنے بکریوں کا دودھ رکھا جائے تو پی لیتے ہیں۔''[1]

منکرینِ حدیث کہتے ہیں: یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ موجودہ چوہے بنی اسرائیل کا مسخ شدہ

[1] صحیح البخاري، بدء الخلق، باب خیر مال المسلم......، حدیث:3305، وصحیح مسلم، الزھد، باب في الفأر......، حدیث:2997.

گروہ ہوں اور چوہے کی صورت میں ان کی نسل باقی رہ گئی ہو، جب کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک روایت مروی ہے کہ مسخ شدہ قوم تین دن سے زیادہ زندہ نہیں رہتی۔

اس کے دو مدلل جواب ہیں۔ حدیث میں وارد لفظ لَا أُرَاهَا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ یہ نبی ﷺ کا خیال تھا اور اس وقت آپ کی طرف یہ وحی نہیں آئی تھی کہ مسخ شدہ قوم تین دن سے زیادہ باقی نہیں رہتی۔ اور جب وحی آئی کہ مسخ شدہ قوم تین دن سے زیادہ باقی نہیں رہتی جیسا کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی مرفوع حدیث میں ہے اور ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی مسند احمد اور صحیح مسلم میں روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«إِنَّ اللّٰهَ لَمْ يَمْسَخْ شَيْئًا فَيَدَعُ لَهُ نَسْلًا أَوْ عَاقِبَةً»

''یقیناً اللہ تعالیٰ جس چیز کو مسخ کر دیتا ہے اس کی نسل باقی نہیں رکھتا۔''[1]

تو معلوم ہوا کہ آپ کا یہ خیال درست نہیں تھا اور آپ ﷺ نے جو پہلی بات ارشاد فرمائی تھی وہ اپنے خیال کی بنیاد پر تھی، اس کی دلیل یہ ہے کہ آپ ﷺ نے خیال کے الفاظ بولے ہیں، مزید یہ کہ آپ نے استدلال کیا کہ چوہے اونٹ کا دودھ نہیں پیتے (اس لیے کہ بنی اسرائیل پر اونٹ کا دودھ بھی حرام تھا) اگر وحی ہوتی تو آپ یہ استدلال نہ کرتے، بعد میں جب وحی آ گئی تو آپ نے بیان فرما دیا۔

یہ حدیث تشبیہ پر محمول ہے، یعنی نبی ﷺ کا مطلب یہ تھا کہ بنی اسرائیل کی مثال چوہوں کی طرح ہے کہ وہ اونٹ کے دودھ سے نفرت کرتے ہیں اور بکریوں کا دودھ پیتے ہیں۔ چوہے کے ساتھ صرف انھی بنی اسرائیل کے لوگوں کی مثال دی تھی جو کسی گناہ کی پاداش میں مسخ کر دیے گئے تھے جیسا کہ صحیح مسلم[2] میں مذکور ہے کہ اس قسم کی قوم مسخ ہوئی تھی۔

[1] صحيح مسلم، القدر، باب بيان أن الآجال......، حديث: 2663، ومسند أحمد: 390/1 واللفظ له. [2] صحيح مسلم، الزهد والرقائق، باب في الفأر وأنه مسخ، حديث: 2997.

حدیث 28: بنی اسرائیل کا گوشت ذخیرہ کرنا

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اگر بنی اسرائیل نہ ہوتے تو گوشت کبھی خراب نہ ہوتا اور اگر حوا علیہا السلام نہ ہوتیں تو کوئی عورت اپنے شوہر سے خیانت نہ کرتی۔'' [1]

منکرین حدیث کی طرف سے اس حدیث پر اعتراض ہے کہ

1. اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل سے پہلے گوشت خراب ہونے کے سلسلے میں مادے کے خواص اور تھے، یعنی گوشت اگر سٹاک بھی کیا جاتا تو گلتا سڑتا نہیں تھا لیکن بنی اسرائیل کے بعد اس مادے کے خواص بدل گئے جو آج تک چلے آرہے ہیں۔

جواب جو مفہوم بیان کرکے اعتراض کیا گیا ہے، حدیث کا وہ مفہوم ہی نہیں ہے، حدیث کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ بنی اسرائیل سے پہلے بنی نوع انسان میں سے کسی نے بھی کبھی گوشت ذخیرہ نہیں کیا تھا نیتجتاً نہ کبھی گوشت سڑا تھا، نہ گلا تھا، یعنی اس دور سے پہلے گوشت سٹور کرنے کا رواج ہی نہیں تھا جو گوشت ملتا اسے سب اہل خاندان مل کر کھا لیتے، سب سے پہلے گوشت ذخیرہ کرنے کا سلسلہ بنی اسرائیل نے شروع کیا، ان پر جو من وسلویٰ آسمان سے اترتا اسے سٹاک کرنا شروع کیا تو گوشت بھی خراب ہونا شروع ہوگیا، بعد میں آنے والے لوگوں نے بنی اسرائیل کی پیروی کرکے گوشت کو ذخیرہ کرنا شروع کیا تو جو ذخیرہ کرنے کا طریقہ جانتے نہیں ان کا گوشت جلدی خراب ہوجاتا ہے اور جو ماہر ہوتے ہیں اور آلات استعمال کرتے ہیں کچھ وقت ان کا گوشت گلنے سڑنے سے محفوظ رہتا ہے، حدیث میں یہی بات بتائی گئی ہے کہ ذخیرہ کرنے کا ناقابل ستائش فعل بنی اسرائیل

[1] صحيح البخاري، احاديث الأنبياء، باب خلق آدم وذريته، حديث: 3330.

نے شروع کیا۔ اور اگر حدیث کا یہ مفہوم ہو کہ گوشت سڑنے اور خراب ہونے کا سلسلہ بنی اسرائیل سے شروع ہُوا ہے اور ان سے پہلے گوشت خراب نہیں ہوتا تھا۔

تو پھر ہم ان منکرینِ حدیث سے کہتے ہیں کہ اس حدیث کو رد کرنے کے لیے قرآن مجید کی وہ آیت پیش کریں جس میں یہ لکھا ہو کہ بنی اسرائیل کے وجود سے پہلے بھی دنیا میں گوشت ذخیرہ کیے جانے پر گل سڑ جاتا تھا۔ اگر قرآن سے دلیل نہ پیش کرسکیں تو پھر ایسی مشین ایجاد کریں جس کے ذریعے سے وہ لوگوں کو زمانۂ بنی اسرائیل سے پہلے والے دور میں لے جا کر دکھادیں کہ دیکھو یہ گوشت گل سڑ رہا ہے اور اگر ایسا نہ کرسکیں تو پھر سوچ لیں کہ نبی ﷺ کا فرمان رد کرنے والوں کا کیا انجام ہوگا؟

حدیث کے دوسرے جملے کا مطلب یہ ہے کہ عورتوں کی طبیعت ومزاج ایک ہے اور استعدادِ خلقت وقابلیت بھی ایک ہے، حوا علیہا السلام جو کہ عورتوں کی اصل ہے اس میں خطا و غلطی کی استعداد تھی تو اس کی بیٹیاں بھی اس استعداد میں اسی کے مثل ہیں۔ اور اگر ان میں یہ استعداد نہ ہوتی تو ان کی بیٹیوں میں بھی یہ استعداد نہ ہوتی۔ اس بات کو ہم اس انداز سے بھی بیان کرسکتے ہیں کہ حوا سے پہلے نہ کوئی عورت تھی نہ اس کا شوہر، حوا ہی پہلی عورت تھی جس سے شوہر کے ساتھ خیانت کا عمل سرزد ہوگیا تو اس کے بعد اس کی بیٹیوں نے بھی یہ سلسلہ شروع کیا۔

2 منکرینِ حدیث یہاں یہ اعتراض کرتے ہیں کہ درخت کے قریب جانے سے آدم اور حوا علیہما السلام دونوں کو منع کیا گیا تھا تو پھر اس حدیث میں صرف حوا علیہا السلام ہی کا جرم کیوں قرار دیا گیا ہے؟ حالانکہ قرآن مجید میں کہا گیا ہے: ﴿ فَأَزَلَّهُمَا الشَّيْطَٰنُ ﴾ یعنی دونوں کو شیطان نے ڈگمگایا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن کریم قصص کے بیان کرنے میں اکثر اختصار کرتا ہے

حقیقت میں ایسے ہوا کہ پہلے حوا علیہا السلام نے درخت سے کھایا تھا، پھر آدم علیہ السلام کو اس سے کھانے کی ترغیب دلائی۔ اس ترغیب کو حدیث میں خیانت کہا گیا ہے اور فرمایا: اگر حوا علیہا السلام آدم علیہ السلام کے ساتھ خیانت نہ کرتیں تو کوئی عورت شوہر کے ساتھ خیانت نہ کرتی، یعنی یہ عادت وہاں سے عورتوں (حوا علیہا السلام کی بیٹیوں) میں سرایت کرگئی۔ قرآن کریم نے نتیجے کے طور پر بیان کردیا:

﴿فَأَزَلَّهُمَا الشَّيْطَٰنُ﴾

''پس شیطان نے ان دونوں کو ڈگمگا دیا۔''[1]

نیز فرمایا:

﴿فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطَٰنُ﴾

''پھر شیطان نے ان دونوں کے دلوں میں وسوسہ ڈال دیا۔''[2]

نیز فرمایا:

﴿فَدَلَّىٰهُمَا بِغُرُورٍ﴾

''پس دونوں کو فریب کے ذریعے سے پھسلا لیا۔''[3]

اور کہیں صرف آدم علیہ السلام کی طرف نسبت کی تو فرمایا:

﴿وَعَصَىٰٓ ءَادَمُ رَبَّهُۥ فَغَوَىٰ ۝﴾

''اور آدم علیہ السلام نے اپنے رب کی نافرمانی کی تو وہ سیدھی راہ سے بھٹک گئے۔''[4]

کیونکہ شوہر مقتدا ہوتا ہے اس لیے یہاں صرف آدم علیہ السلام ہی کا نام لینے پر اکتفا کیا گیا ہے۔ اور ان آیات سے یہ کہیں بھی ثابت نہیں ہوتا کہ اس کی ابتدا حوا علیہا السلام سے نہیں ہوئی تھی۔

---

[1] البقرۃ 36:2. [2] الأعراف 20:7. [3] الأعراف 22:7. [4] طٰہٰ 121:20.

حدیث29: کھانے پینے کی چیز میں مکھی گر جانے پر اسے ڈبو کر باہر نکالنا

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اگر تم میں سے کسی کے کھانے پینے کی چیز میں مکھی گر جائے تو اسے چاہیے کہ وہ اسے غوطہ دے اور پھر اسے نکالے کیونکہ اس کے ایک پر میں بیماری اور دوسرے میں شفا ہے۔''[1]

منکرینِ حدیث کی طرف سے اس حدیث پر یہ اعتراض ہے کہ مکھی اکثر گندی جگہوں پر بیٹھتی ہے اور اس میں جراثیم ہوتے ہیں جس سے بیماریاں پھیلتی ہیں اور حدیث میں یہ کہا گیا ہے کہ اگر مشروب میں گر جائے تو اسے ڈبو دو اس عمل کو (بزعم خویش) مہذب لوگ بہت کراہت کی نظر سے دیکھتے ہیں اور اگر مکھی، پانی یا چائے میں گر جائے تو وہ اسے ضائع کر دیتے ہیں لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ اگر یہی مکھی دودھ کی بالٹی یا پگھلے ہوئے گھی یا شہد میں گر جائے تو اسے نہ گراتے ہیں، نہ ضائع کرتے ہیں، اس وقت ان نام نہاد مہذبین کو نہ جراثیم نظر آتے ہیں اور نہ ہی گندگی۔ ایمان والوں کا اللہ کے نبی ﷺ کی بات پر سو فیصد ایمان ہوتا ہے، اس کی حکمت سمجھ میں آئے یا نہ آئے لیکن اللہ تعالیٰ کے فضل سے سائنسی تحقیقات نے رسول اللہ ﷺ کی بات کی سو فیصد تصدیق کر کے حجیتِ حدیث کی ایک اور واضح دلیل فراہم کر دی ہے اس کی تفصیل یہ ہے کہ سائنس دان اپنی لیبارٹریوں میں بڑی جانفشانی سے مکھی کے ایک پر میں بیماری والے جراثیم اور دوسرے پر میں شفا والے جراثیم پر تحقیق کر کے جراثیم کش مواد کا وہ علم حاصل کرتے رہے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعے سے اپنے نبی ﷺ کو عطا فرمایا۔ یہ نبی ﷺ کی صدق رسالت اور اس حدیث کی صداقت پر صریح دلیل ہے لیکن منکرینِ حدیث نے اپنے متجاہلانہ طریقے پر ڈٹ کر

[1] صحيح البخاري، بدء الخلق، باب إذا وقع الذباب......، حديث:3320، و مقام حدیث، ص:333.

اس حدیث کو محل اعتراض میں بیان کیا ہے، جبکہ ڈاکٹروں اور ماہرین نے مکھی کے متعلق جو لکھا ہے اس کے بعض نمونے درج ذیل ہیں:

مکھی کے جس پر میں زہریلا مادہ پیدا ہوتا ہے اسے بکٹیریا کش کہتے ہیں۔ مکھی کے ایک پر کا خاصہ یہ ہے کہ وہ بکٹیریا کو اس کے پیٹ سے ایک پہلو کی طرف منتقل کرتا رہتا ہے، لہٰذا مکھی جب کسی کھانے پینے کی چیز پر بیٹھتی ہے تو وہ پہلو سے چمٹے ہوئے جراثیم اس میں ڈال دیتی ہے۔ ان جراثیم سے بچانے والی پہلی چیز وہ بکٹیریا کش ہے جسے مکھی اپنے پیٹ میں ایک پر کے پاس اٹھائے ہوئے ہوتی ہے، لہٰذا چمٹے ہوئے زہریلے جراثیم اوران کے عمل کو ہلاک کرنے کے لیے یہ چیز کافی ہے کہ پوری مکھی کو کھانے میں ڈبو کر باہر پھینک دیا جائے۔''[1]

حدیث 30: مرغ کا فرشتے کو دیکھنا اور گدھے کا شیطان کو دیکھنا

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''جب تم مرغ کی آواز سنو تو اللہ سے اس کا فضل طلب کرو کیونکہ وہ فرشتے کو دیکھتا ہے اور جب تم گدھے کی آواز سنو تو شیطان سے اللہ کی پناہ طلب کرو کیونکہ جب وہ شیطان کو دیکھتا ہے تب بولتا ہے۔''[2]

اس حدیث میں دو باتیں ہیں جنھیں منکرین حدیث بطور اعتراض اور انکار پیش کرتے ہیں:

1. مرغ نے فرشتے کو اور گدھے نے شیطان کو کیسے دیکھا؟
2. اس وقت اللہ تعالیٰ کا فضل طلب کرنے اور شیطان سے اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کرنے

---

① تفہیم اسلام، ص:455 شائع کردہ جمعیة الهداية الإسلامية بحوالہ آئینہ پرویزیت۔ ② صحيح البخاري، بدء الخلق، باب: خير مال المسلم...... حدیث:3303، وترجمہ از مقام حدیث، ص:233.

کی کیا وجہ ہے؟

جواب 1 فرشتوں اور شیاطین کا وجود آیات قرآنیہ سے ثابت کیا جا چکا ہے، لہٰذا اس میں تاویل کرنا نہایت کج فہمی کی دلیل ہے، پھر فرشتوں کا نیک بندوں کے پاس آنا اور شیاطین کا مجرموں اور کاہنوں کے پاس آنا قرآن کریم سے ثابت ہے، چنانچہ ارشاد ہوا:

﴿ إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلَٰٓئِكَةُ أَلَّا تَخَافُوا وَلَا تَحْزَنُوا ﴾

''بے شک جن لوگوں نے کہا: ہمارا رب اللہ ہے، پھر وہ اس پر جمے رہے۔ ان پر فرشتے اترتے ہیں (اور کہتے ہیں) کہ تم مت ڈرو اور مت غم کھاؤ۔''[1]

شیاطین کے متعلق فرمایا:

﴿ هَلْ أُنَبِّئُكُمْ عَلَىٰ مَن تَنَزَّلُ الشَّيَٰطِينُ ۝ تَنَزَّلُ عَلَىٰ كُلِّ أَفَّاكٍ أَثِيمٍ ۝ ﴾

''کیا میں تمھیں بتاؤں کہ شیاطین کس پر اترا کرتے ہیں، ہر جھوٹے گناہ گار پر اترتے ہیں۔''[2]

نیز فرمایا:

﴿ أَلَمْ تَرَ أَنَّآ أَرْسَلْنَا الشَّيَٰطِينَ عَلَى الْكَٰفِرِينَ تَؤُزُّهُمْ أَزًّا ۝ ﴾

''کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ ہم نے شیطانوں کو کافروں پر چھوڑ رکھا ہے کہ وہ انھیں ابھارتے رہتے ہیں۔''[3]

کاہنوں اور کافروں میں سے کوئی بھی یہ نہیں کہتا کہ میں نے اپنے پاس شیطان دیکھا ہے لیکن ہمارا ایمان ہے کہ شیاطین ان پر اترتے ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے تو پھر مرغ کے پاس فرشتے کا آنا اور مرغ کا اسے دیکھنا، اسی طرح گدھے کا شیطان کو دیکھنا

---

[1] حٰمٓ السجدة 30:41. [2] الشعرآء 222,221:26. [3] مریم 83:19.

اور اسے دیکھ کر آواز نکالنا کوئی تعجب کی بات نہیں اگرچہ ہم نہیں دیکھ سکتے کیونکہ ہم تو ایمان بالغیب رکھتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے بعض حیوانات کو خاص قوتیں عطا کی ہیں جو ہمارے تجربات میں داخل ہیں۔ چیونٹی کی قوت شامہ (سونگھنے کی قوت) انسان سے بدرجہا زیادہ ہے۔ چیل انتہائی بلندی سے سطح زمین پر گوشت کا ٹکڑا وغیرہ دیکھ لیتی ہے، بلی اندھیرے میں دیکھ لیتی ہے۔ ان کے علاوہ بھی عجائبات الٰہیہ ثابت ہیں جن سے انکار نہیں کیا جاسکتا تو پھر مرغ کے فرشتہ دیکھنے یا گدھے کے شیطان دیکھنے میں بھی کوئی وجۂ انکار نہیں۔

2 مرغ کی آواز (اذان) کے وقت اللہ تعالیٰ سے فضل طلب کرنے کی وجہ یہ ہے کہ مرغ اس وقت فرشتے کو دیکھ رہا ہوتا ہے تو فرشتے کی موجودگی میں دعا کی قبولیت کی زیادہ امید ہوتی ہے کیونکہ فرشتے مومن کی دعا پر آمین کہتے ہیں۔ اس بارے میں بھی بہت احادیث ثابت ہیں۔ شیاطین سے تو ہر وقت اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کرنی چاہیے۔ خصوصاً جب کہ وہ انسان کے پاس آئیں، چنانچہ قرآن کریم نے اس دعا کی تلقین فرمائی ہے:

﴿ وَقُلْ رَّبِّ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ هَمَزٰتِ الشَّيٰطِيْنِ ۝ وَاَعُوْذُ بِكَ رَبِّ اَنْ يَّحْضُرُوْنِ ۝ ﴾

”اور کہہ دیجیے کہ پروردگار! میں شیطانوں کے وسوسوں سے تیری پناہ چاہتا ہوں۔ اور اے میرے رب! میں اس بات سے بھی تیری پناہ چاہتا ہوں کہ وہ میرے پاس آئیں۔“[1]

حدیث 31: آفتاب شیطان کے دو سینگوں کے درمیان طلوع ہوتا ہے

ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

[1] المؤمنون 23:97,98.

''تم طلوع آفتاب اور غروب آفتاب کے وقت نماز نہ پڑھا کرو کیونکہ آفتاب شیطان کے دوسینگوں کے درمیان طلوع ہوتا ہے۔''[1]

اس میں شیطان کے وجود خارجی اور سورج کی حرکت پر اعتراض کرنے کے علاوہ بڑا اعتراض یہ ہے کہ سورج جسامت کے لحاظ سے ہماری زمین سے لاکھوں گنا بڑا ہے تو جب وہ شیطان کے دوسینگوں کے درمیان طلوع ہوتا ہے تو پھر شیطان کا سر کتنا بڑا ہوگا اور وہ کہاں ٹھہرتا ہوگا؟

سورج کے حرکت کرنے اور شیطان کے ذاتی تشخص اور وجود کے متعلق پہلے بحث گزر چکی ہے۔صرف یہ اعتراض کہ سورج شیطان کے سینگوں کے درمیان کیسے طلوع ہورہا ہے، دیدہ دانستہ جاہلانہ اعتراض ہے کیونکہ ذوالقرنین کے واقعے میں قرآن کریم میں ہے:

﴿ حَتَّىٰٓ إِذَا بَلَغَ مَغْرِبَ ٱلشَّمْسِ وَجَدَهَا تَغْرُبُ فِى عَيْنٍ حَمِئَةٍ ﴾

''حتی کہ جب وہ سورج کے غروب ہونے کی جگہ تک پہنچ گیا تو اسے ایک دلدل کے چشمے میں ڈوبتا ہوا پایا۔''[2]

اس آیت پر بھی پھر وہی اعتراض آتا ہے کہ سورج زمین سے اور پھر بحر اسود سے لاکھوں گنا بڑا ہے تو وہ اس چھوٹے سے چشمے کے اندر کیسے غروب ہوتا ہے۔طلوع اسلام والے ضرور یہاں اہل قرآن ہونے کی وجہ سے تاویل کریں گے تو پھر حدیث کے ساتھ کیوں دشمنی ہے یہاں بھی کوئی مناسب تاویل کرلیں۔

﴿1﴾ اس حدیث میں مشہور تاویل یہ ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ شیطان طلوع آفتاب اور غروب آفتاب کے وقت سورج کے پرستاروں کی نظر میں سورج کو ایسا مزین اور خوبصورت بناتا ہے کہ وہ اس کی پوجا میں مصروف ہوجاتے ہیں۔اس تزئین کی مثال ایسے

[1] صحيح البخاري، بدء الخلق، باب صفة إبليس وجنوده، حديث:3273. [2] الكهف 86:18.

ہے کہ جیسے اس نے اسے اپنے سر پر رکھا ہو اوراس تاویل کا باعث یہ ہے کہ اس حدیث میں ایمان والوں کو مشرکین کی مشابہت اختیار کرنے سے منع کرنا مقصود ہے کہ طلوع آفتاب اورغروب آفتاب کے وقت نماز مت پڑھو کیونکہ ان اوقات میں نماز پڑھنے سے ان کے ساتھ مشابہت لازم آتی ہے۔

2 سورج کے پجاریوں کے گمان میں سورج کا طلوع وغروب شیطان کے سر کے اوپر سینگوں کے درمیان ہوتا ہے جیسا کہ انسان ایک آنکھ سے پورے جسم کو دیکھ سکتا ہے یا دو انگلیوں کے درمیان سے سورج کو دیکھتا ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ سورج حقیقت میں اتنا چھوٹا ہے کہ وہ آنکھ کے اندر سما سکتا ہے یا وہ دو انگلیوں کے درمیان سما سکتا ہے۔

حدیث 32 : بخار جہنم کے جوش (پھونک) سے ہوتا ہے

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''بخار جہنم کے جوش سے پیدا ہوتا ہے، لہٰذا تم اسے پانی سے ٹھنڈا کرو۔''[1]

یہ حدیث دراصل ایمان بالغیب سے تعلق رکھتی ہے جیسا کہ موسم کی تبدیلی کے حوالے سے بحث میں یہ بات گزر چکی ہے۔ بعض علماء اس حدیث کو تشبیہ پر محمول کرتے ہیں، یعنی بخار کی گرمی درد وآلام میں جہنم کی گرمی کی طرح ہے۔ لیکن اس بارے میں درست رائے یہ ہے کہ بخار ایک ایسی حرارت ہے جو جسم میں موجود مراکز التدبیر کا جراثیم سے متاثر ہونے کی صورت میں پیدا ہوتی ہے، اور یہ حرارت جہنم سے ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے جہنم سے گرمی کا تھوڑا سا حصہ نکالا ہے اور اسے زمین میں بکھیر دیا ہے۔ جب کسی انسان میں اس حرارت کے لگنے کے اسباب پائے جائیں تو اللہ تعالیٰ اسے یہ حرارت لگا دیتا ہے۔ تو

[1] صحیح البخاري، بدء الخلق، باب صفة النار وأنها مخلوقة، حدیث:3263، ومقام حدیث، ص:334.

حدیث میں حرارت کے اصل منشا اور بنیاد کو بیان کیا گیا ہے۔ عصر حاضر کے اطباء بھی حدیث میں بیان کردہ طریقۂ علاج کو تجویز کرتے ہیں، یعنی ان کے نزدیک پانی سے اس کا علاج کرنا تو اب بھی مؤثر طریقۂ علاج ہے۔ ٹھنڈا پانی ڈالنے یا برف کی پٹیاں لگانے سے درجۂ حرارت میں کمی آتی ہے اور بخار جلد اتر جاتا ہے۔ یہاں اگر غور کیا جائے تو یہ علاج بذریعۂ وحی نبی ﷺ کو بتایا گیا جبکہ ڈاکٹر حضرات بہت سے تجربات سے گزر کر اسے مانتے ہیں۔ لہٰذا یہ صداقتِ نبوت اور حدیث کی حجیت پر بہت بڑی دلیل ہے۔

حدیث 33: اونٹ کا پیشاب پینے کا حکم

انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: عکل یا عرینہ قبیلے کے کچھ لوگ مدینہ آئے تو انھیں مدینہ کی آب و ہوا موافق نہ آئی تو وہ بیمار ہوگئے، اس لیے نبی ﷺ نے انھیں صدقات کے اونٹوں کے پاس بھیج دیا اور فرمایا: ''اونٹنیوں کا دودھ اور پیشاب پیا کرو۔'' انھوں نے ایسے کیا تو وہ تندرست ہوگئے، پھر انھوں نے نبی ﷺ کے چرواہوں کو قتل کر دیا اور اونٹ ہانک کر لے گئے۔ دن کے اول وقت ان کی خبر آپ کے پاس پہنچی تو آپ ﷺ نے ان کے تعاقب میں آدمی روانہ کیے، جو دن چڑھے انھیں گرفتار کر لائے۔ آپ ﷺ کے حکم پر ان کے دائیں ہاتھ اور بائیں پاؤں کاٹ ڈالے گئے، ان کی آنکھوں میں گرم سلائیاں پھیری گئیں اور انھیں گرم سنگلاخ زمین پر ڈالا گیا۔ وہ پانی مانگتے تھے لیکن انھیں پانی نہیں پلایا جاتا تھا اور وہ ایسی ہی حالت میں مر گئے۔[1]

منکرینِ حدیث کے اس حدیث پر چند اعتراضات ہیں:

1 آپ ﷺ نے پیشاب پینے کا حکم کیوں دیا؟

[1] صحيح البخاري، الوضوء، باب أبوال الإبل والدواب......، حديث: 233.

2 انھوں نے چرواہوں کو قتل کیا تھا، چاہیے تو یہ تھا کہ انھیں بھی صرف قتل کر دیا جاتا، رحمۃ للعالمین نے انھیں چار سزائیں کیوں دیں؟

3 چاہیے تھا کہ آپ ﷺ رحمۃ للعالمین کی صفت کی وجہ سے ان کے ساتھ کچھ تخفیف کرتے۔

❀ **اعتراض اول کا جواب:** منکرینِ حدیث قرآن کریم سے ثابت کریں کہ پیشاب پینا حرام ہے۔ تحقیقی جواب یہ ہے کہ جب جان کو خطرہ ہو تو مردار، خون اور خنزیر کھانا جائز ہے۔ اونٹوں کا پیشاب تو حرام بھی نہیں، لہٰذا طبی طور پر پیشاب ان کے لیے بطور علاج تجویز کیا گیا۔

❀ **اعتراض دوم کا جواب:** انھوں نے متعدد جرم کیے تھے۔ چرواہے کو قتل کیا تھا، مسلمانوں کا مال لوٹ کر لے گئے تھے، مرتد ہو گئے تھے، چرواہے کی آنکھوں میں گرم سلائیاں پھیریں، اسے گرم ریت پر پھینک دیا اور اسے پینے کو پانی نہیں دیا۔ قرآن کریم میں قصاص کا حکم ہے اور ایسا کرنا قصاص کا تقاضا تھا۔

❀ **اعتراض سوم کا جواب:** رحمۃ للعالمین کی صفت کے ساتھ ساتھ وہ قاضی بھی تھے اور جب کسی مجرم کا جرم قاضی کے سامنے ثابت ہو جائے تو پھر سزا دینا واجب ہو جاتا ہے، قاضی کو تخفیف کرنے کی اجازت نہیں ہوتی۔

حدیث 34: بندر کو زنا کے جرم میں سنگسار کیا جانا

''عمرو بن میمون بیان کرتے ہیں کہ میں نے زمانۂ جاہلیت میں ایک بندر دیکھا کہ بہت سے بندر اس کے گرد جمع ہو گئے تھے اس نے زنا کیا تھا سب نے اسے سنگسار کیا، تو میں نے بھی ان کے ساتھ اسے سنگسار کیا۔''[1]

[1] صحيح البخاري، مناقب الأنصار، باب القسامة في الجاهلية، حديث: 3849، و مقام حدیث، ص: 1025.

اس حدیث پر تین اعتراضات ہیں:

1. کیا بندر مکلّف مخلوق ہیں کہ وہ شرعی احکام کے پابند ہوں؟
2. جس بندر یا بندریا کو رجم کیا گیا تو کیا یہ ثابت ہوا تھا کہ وہ منکوحہ تھی؟
3. اس میں صرف ایک کا ذکر ہے یعنی بندریا کو رجم کیا تو بندر کو کیوں چھوڑا یا برعکس؟

جواب دینے سے قبل شارحین نے اس واقعے کی جو تفصیل لکھی ہے وہ پیش خدمت ہے۔ عمرو بن میمون کہتے ہیں کہ میں یمن میں اپنے لوگوں کی بکریوں میں تھا۔ ایک اونچی جگہ پر میں نے دیکھا کہ ایک بندر، بندریا کو لے کر آیا اور اس کا ہاتھ اپنے سر کے نیچے رکھ کر سو گیا اتنے میں ایک چھوٹا بندر آیا اور بندریا کو اشارہ کیا۔ اس نے آہستہ سے اپنا ہاتھ پہلے بندر کے سر کے نیچے سے کھینچ لیا اور چھوٹے بندر کے ساتھ چلی گئی۔ اس نے اس کے ساتھ صحبت کی جبکہ میں دیکھ رہا تھا۔ صحبت کے بعد بندریا لوٹ آئی اور آہستگی سے پھر اپنا ہاتھ پہلے بندر کے سر کے نیچے رکھنے لگی تو وہ بندر جاگ گیا اور وہ گھبرایا ہوا تھا۔ اس نے بندریا کو سونگھا اور ایک چیخ ماری تو سب بندر جمع ہو گئے۔ وہ اسی بندریا کی طرف اشارہ کرتا تھا اور چیختا جاتا تھا، یعنی وہ بتاتا تھا کہ اس نے زنا کیا ہے۔ آخر دوسرے بندر، دائیں اور بائیں طرف گئے اور وہ اس چھوٹے بندر کو لے کر آئے جسے میں پہچانتا تھا۔ انھوں نے اس بندر اور بندریا کے لیے گڑھا کھودا اور دونوں کو سنگسار کر ڈالا، چنانچہ میں نے بنی آدم کے سوا جانوروں میں بھی رجم دیکھا۔

جواب 1 یہ رسول اللہ ﷺ اور کسی صحابی کی حدیث نہیں کیونکہ عمرو بن میمون ایک تابعی ہیں اور انھوں نے اپنا ایک چشم دید واقعہ بیان کیا ہے۔ راوی اور دیگر راویان سند ثقہ لوگ ہیں تو اسے ایک واقعے کے طور پر ماننے میں کوئی حرج نہیں۔ اس کے ماننے سے کسی کے ایمان میں فرق نہیں آتا، ہاں زنا کی قباحت ظاہر کرنے کے لیے ایک تائید ہے۔ تو اس

واقعے کی وجہ سے تمام ذخیرۂ حدیث کو سلسلۂ حجیت سے نکالنا اور احادیث کے خلاف پروپیگنڈا کرنا عقل مندوں کے شایانِ شان نہیں۔

2 حیوانات میں سے بندر ایک ایسی مخلوق ہے جو حس و شعور اور نقالی میں انسان کے قریب تر ہے۔ مداری لوگ میلوں میں بندر سے عجیب عجیب کھیل تماشائیوں کو دکھاتے ہیں۔ میں نے خود طائف کے پہاڑ میں ان کے ایسے کرتب دیکھے کہ گویا وہ انسان نظر آتے ہیں اور انھی وجوہ سے ڈارون نے بندر کو انسان کا جداعلیٰ شمار کیا ہے اگرچہ اس کا یہ نظریہ سراسر باطل ہے۔

حدیث 35: جنات کو باندھنا

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''آج رات اچانک ایک بڑا جن میرے پاس آیا تاکہ میری نماز تہجد میں خلل ڈالے اللہ تعالیٰ نے مجھے اس پر قابو پانے کی قدرت دی اور میں نے ارادہ کیا کہ اسے مسجد کے کسی ستون کے ساتھ باندھ دوں تاکہ تم صبح کے وقت اسے دیکھ سکو، لیکن مجھے سلیمان علیہ السلام کی دعا یاد آ گئی۔''

﴿رَبِّ اغْفِرْ لِي وَهَبْ لِي مُلْكًا لَّا يَنبَغِي لِأَحَدٍ مِّنۢ بَعْدِي﴾

''میرے رب مجھے معاف کردے، اور مجھے ایسی حکومت عطا فرما جو میرے بعد کسی کو زیبا نہ ہو۔''[1]

تو میں نے اسے ذلیل وخوار چھوڑ دیا۔[2]

اس حدیث کے متعلق منکرین کے تین اعتراض ہیں:

[1] صٓ 35:38. [2] صحيح البخاري، الصلاة، باب الأسير أو الغريم يربط......، حديث:461، و مقام حدیث، ص: 235، اس نے دھوکا دینے کے لیے کچھ ٹکڑا چھوڑ دیا ہے۔

﴿1﴾ جن کے وجود کا انکار۔ ﴿2﴾ جن کو باندھنا۔ ﴿3﴾ نماز میں خلل ڈالنا۔

اعتراض اول کا جواب: 1 اس کا کچھ حصہ شیطان کے ذاتی تشخص ثابت کرنے کے باب میں گزر چکا ہے۔ جنات کا مستقل مادۂ تخلیق ہے، اللہ تعالیٰ نے انسان اول کا مادۂ تخلیق بیان کرنے کے بعد فرمایا:

﴿وَالْجَآنَّ خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَّارِ السَّمُوْمِ ○﴾

''اوراس سے قبل ہم جنوں کوجلانے والی آگ سے پیدا کر چکے ہیں۔''[1]

اس آیت میں جنات کی مستقل تخلیق کے دو دلائل ہیں:

- جنوں کو آدم علیہ السلام سے پہلے پیدا فرمایا، لہٰذا وہ بنی آدم میں شمار نہیں ہو سکتے۔
- ان کا مادۂ تخلیق انسان کے مادۂ تخلیق سے بالکل علیحدہ ہے۔

2 لفظ ''جن'' کا مادہ اخفا (پوشیدگی) پر دلالت کرتا ہے۔جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ الَّيْلُ﴾

''پس جب رات کی تاریکی نے اسے ڈھانپ لیا۔''[2]

نیز فرمایا:

﴿كَاَنَّهَا جَآنٌّ﴾

''گویا کہ وہ سانپ ہے۔''[3]

سانپ کو ﴿جَآنٌّ﴾ اس لیے کہتے ہیں کہ وہ تیز رفتاری کی وجہ سے پوری طرح نظر نہیں آتا۔

﴿مَا بِصَاحِبِهِمْ مِّنْ جِنَّةٍ﴾

''ان کے ساتھی کو کسی قسم کا جنون نہیں۔''[4]

دیوانگی کو بھی اس لیے جنون کہتے ہیں کہ اس میں عقل مخفی ہوتی ہے۔اس مادۂ لفظی سے

---

[1] الحجر 27:15. [2] الأنعام 76:6. [3] القصص 31:28. [4] الأعراف 184:7.

بھی معلوم ہوا کہ جنات ایک مخفی مخلوق ہے جبکہ لفظ انسان مادۂ اُنس سے ماخوذ ہے جس کا معنی ہے ایسی چیز جو بالکل دیکھی جاسکے۔ یوں دونوں الفاظ کے مادوں میں بھی تناقض ہے۔

3 قرآن کریم کی آیات میں جن وانس کو ایک ہی آیت میں الگ الگ بیان کیا گیا ہے اور یہ سولہ آیات کریمہ ہیں۔ بعض آیات میں لفظ جن کا ذکر پہلے ہے اور بعض میں لفظ انس کا جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَ الْاِنْسِ ﴾

''اے گروہ جن وانس۔''[1]

نیز فرمایا:

﴿ فَيَوْمَئِذٍ لَّا يُسْـَٔلُ عَنْ ذَنْۢبِهٖۤ اِنْسٌ وَّلَا جَآنٌّ ۝ ﴾

''پس اس روز کسی انسان اور جن سے اس کے گناہ کے متعلق سوال نہیں کیا جائے گا۔''[2]

4 گیارہ آیات میں جنوں کا مستقل طور پر الگ ذکر کیا، فرمایا:

﴿ وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ الْجِنَّ وَخَلَقَهُمْ ﴾

''اور انھوں نے جنوں کو اللہ کا شریک بنا رکھا ہے، حالانکہ اسی نے انھیں پیدا کیا ہے۔''[3]

نیز فرمایا:

﴿ يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ قَدِ اسْتَكْثَرْتُمْ مِّنَ الْاِنْسِ ﴾

''اے گروہ جن! تم نے انسانوں میں سے ایک بڑی تعداد اپنے ساتھ لے لی۔''[4]

ابلیس بھی جن تھا جیسا کہ فرمایا:

---

[1] الأنعام 130:6. [2] الرحمٰن 39:55. [3] الأنعام 100:6. [4] الأنعام 128:6.

﴿ كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ أَمْرِ رَبِّهٖ ﴾

''وہ (ابلیس) جنوں میں سے تھا، پس اس نے اپنے رب کے حکم کی نافرمانی کی۔''[1]

ایک خاص طاقت ور جن نے ملکہ سبا کا عرش لانے کے متعلق سلیمان علیہ السلام سے کہا:

﴿ قَالَ عِفْرِيتٌ مِّنَ الْجِنِّ أَنَا آتِيكَ بِهٖ ﴾

''ایک دیوہیکل جن نے کہا: میں اسے آپ کی خدمت میں پیش کروں گا۔''[2]

5 جنات سلیمان علیہ السلام کے محکوم تھے اور وہ ان کے لیے مختلف کام کرتے تھے۔ فرمایا:

﴿ وَمِنَ الْجِنِّ مَنْ يَّعْمَلُ بَيْنَ يَدَيْهِ بِإِذْنِ رَبِّهٖ ﴾

''اور جنوں میں سے بعض ایسے تھے جو اس کے رب کے حکم سے ان کے آگے کام کرتے تھے۔''[3]

6 جن غیب نہیں جانتے، چنانچہ فرمایا:

﴿ فَلَمَّا خَرَّ تَبَيَّنَتِ الْجِنُّ أَنْ لَّوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ الْغَيْبَ ﴾

''پس جب وہ (سلیمان علیہ السلام) گر پڑے تو جنوں کو معلوم ہوا کہ اگر وہ غیب جانتے ہوتے۔''[4]

7 کچھ لوگ اس خیال سے جنوں کی عبادت کرتے ہیں کہ وہ فرشتے ہیں، فرمایا:

﴿ قَالُوا سُبْحٰنَكَ أَنْتَ وَلِيُّنَا مِنْ دُوْنِهِمْ ۚ بَلْ كَانُوا يَعْبُدُوْنَ الْجِنَّ ﴾

''وہ (فرشتے) کہیں گے تو پاک ہے، تو ہمارا کارساز ہے وہ نہیں ہیں، بلکہ وہ تو جنوں کی عبادت کیا کرتے تھے۔''[5]

8 جنوں نے قرآن سنا اور ایمان لا کر داعی بن گئے، فرمایا:

﴿ وَإِذْ صَرَفْنَا إِلَيْكَ نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ يَسْتَمِعُوْنَ الْقُرْاٰنَ ﴾

[1] الکھف 50:18. [2] النمل 39:27. [3] سبا 12:34. [4] سبا 14:34. [5] سبا 41:34.

''اور جب کہ ہم نے چند جنوں کو آپ کی طرف بھیجا کہ وہ قرآن سنیں۔''[1]

10 جنات کے ایمان لانے اور قرآن سننے کے متعلق دیگر تفصیلات سورۂ جن کے ابتدائی حصے میں مذکور ہیں۔ جنوں کے مستقل احوال کا ذکر بھی انھی آیات میں موجود ہے کہ وہ ایک مستقل مخلوق ہیں اور قرآن کریم نے ابلیس کے متعلق فرمایا:

﴿ إِنَّهُ يَرَىٰكُمْ هُوَ وَقَبِيلُهُ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ ﴾

''بے شک وہ (ابلیس) اور اس کا لشکر تمھیں اس طرح دیکھ رہا ہے کہ تم انھیں نہیں دیکھ سکتے۔''[2]

یہ صریح دلیل ہے کہ جن غیر مرئی مستقل مخلوق ہیں۔ اتنی تفصیل کے بعد کوئی عقل مند شخص ان کے وجود شخصی سے کیسے انکار کر سکتا ہے۔

❀ اعتراض دوم کا جواب: جنات کو باندھنا عقل کے خلاف نہیں۔ قرآن پاک میں ہے کہ سلیمان علیہ السلام اپنی بادشاہت میں فساد کرنے والے جنوں کو ہتھکڑیوں میں جکڑتے تھے، چنانچہ ارشاد ہوا:

﴿ وَءَاخَرِينَ مُقَرَّنِينَ فِى الْأَصْفَادِ ۝ ﴾

''اور دوسرے جنات جو بیڑیوں میں جکڑے رہتے ہیں۔''[3]

جب سلیمان علیہ السلام کے متعلق قرآن سے ثابت ہے کہ وہ جنوں کو باندھ دیتے تھے تو نبی ﷺ افضل الرسل ہیں، کیا ان کے لیے ممکن نہیں کہ وہ کسی جن کو پکڑ کر ستون کے ساتھ باندھ دیں۔

❀ اعتراض سوم کا جواب: انسان جو مادی اور مرئی مخلوق ہے وہ اپنے کلام کے ذریعے سے دوسرے انسانوں کے دلوں میں وسوسہ ڈالتے ہیں تو جن جو غیر مرئی مخلوق ہے، اس

---

[1] الأحقاف 29:46. [2] الأعراف 27:7. [3] صٓ 38:38.

کے لیے تو وسوسہ ڈالنے کے بہت سے ذرائع ہیں۔ جن وانس کے وسوسہ ڈالنے کے متعلق قرآن نے اکٹھا ذکر کیا:

﴿ الَّذِیْ یُوَسْوِسُ فِیْ صُدُوْرِ النَّاسِ ۙ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ ۝ ﴾

’’(ہر اس متنفس سے) جو لوگوں کے دلوں میں وسوسے ڈالتا ہے، خواہ وہ جنوں میں سے ہو اور خواہ انسانوں میں سے ہو۔‘‘[1]

البتہ رسول اللہ ﷺ پر ان کا وسوسہ اثر انداز نہیں ہوتا۔ نصوص سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ اور باقی تمام انبیاء علیہم السلام کو شیاطین کے اثر سے محفوظ رکھا ہے۔

حدیث 36: تمھارے گناہ نہ کرنے سے اللہ کا دوسرے لوگ پیدا کرنا

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

’’اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! اگر تم ایسے ہو جاؤ کہ گناہ تم سے سرزد ہی نہ ہو تو اللہ تعالیٰ تمھیں زمین سے ہٹادے گا اور تمھاری جگہ ایک دوسرا گروہ پیدا کرے گا جس کا شیوہ یہ ہو کہ گناہ کرے اور پھر اللہ تعالیٰ سے بخشش اور مغفرت کی طلب گاری کرے۔‘‘[2]

طلوع اسلام والوں نے اس حدیث سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ انسان کو زیادہ گناہ کرنے چاہئیں اور پھر بخشش طلب کرنی چاہیے تاکہ اللہ تعالیٰ خوش ہو۔

جواب حدیث صحیح ہے لیکن اس کا مطلب اور مفہوم یہ ہے کہ انسان کی خلقت میں اللہ تعالیٰ کی بہت سی حکمتیں ہیں۔ ان میں سے ایک حکمت یہ ہے کہ انسان کثرت سے توبہ و استغفار کرے اور یہ تب ہوتا ہے کہ انسان گناہ کرے۔ مقصد دراصل یہ ہے کہ توبہ و

[1] الناس 114:5،6. [2] صحیح مسلم، التوبة، باب سقوط الذنوب......، حدیث:2749، ومقام حدیث، ص:331.

استغفار کثرت سے ہو جبکہ گناہ کرنا بالواسطہ مقصد ہے۔ ایسی بہت سی مثالیں ہیں، مثلاً: اللہ تعالیٰ نے سانپ اور بچھو وغیرہ پیدا کیے جو فطری طور پر انسان کے دشمن ہیں اور وہ انسان کو ڈستے ہیں لیکن یہ غایت حقیقی نہیں بلکہ اس میں دوسری غایتیں اور حکمتیں بالذات مقصود ہیں۔

انسان کی خلقت کا مقصد کثرت استغفار اس بنا پر ہے کہ انسان کے علاوہ ایسی بہت سی مخلوقات ہیں جو گناہ نہیں کرتیں، مثلاً: فرشتے، شجر، حجر اور حیوانات وغیرہ۔ وہ اللہ تعالیٰ کی تسبیح وتحمید کرتی ہیں لیکن استغفار نہیں کرتیں، البتہ فرشتوں کا استغفار قرآن کریم میں مذکور ہے لیکن وہ مومنوں کے لیے ہے۔ ارشاد ہوا:

﴿ اَلَّذِيْنَ يَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهٗ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَيُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَيَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ﴾

''وہ فرشتے جنھوں نے عرش کو اٹھا رکھا ہے اور جو اس کے اردگرد ہیں، وہ اللہ کی حمد وثنا بیان کرتے ہیں، اور اس پر ایمان لاتے ہیں اور وہ مومنوں کے لیے بخشش طلب کرتے ہیں۔''[1]

لہٰذا صرف انسان ہی ایسی مخلوق ہے جس کی خلقت کا مقصود بالذات استغفار کرنا ہے۔

نوٹ: یہاں تک وہ احادیث بیان کی گئی ہیں جنھیں طلوع اسلام والوں نے امام بخاری کے حوالے سے نقل کیا ہے اور ان پر اعتراض کیا ہے، البتہ حدیث نمبر 36 صحیح بخاری کی نہیں، وہ صحیح مسلم کی ہے۔ انھوں نے غلطی سے اسے امام بخاری کی طرف منسوب کیا ہے۔ ان کے علاوہ اور بھی تقریباً چار احادیث ہیں جن پر انھوں نے اعتراض کیا ہے لیکن ہم نے ان کا ذکر اس لیے نہیں کیا کہ ہمیں ان پر اعتراض کا پہلو نظر نہیں آیا، البتہ ان کے علاوہ

[1] المؤمن 7:40.

بعض ایسی صحیح احادیث ہیں جن پر منکرینِ حدیث اعتراض کرتے ہیں۔ ان میں سے بعض قابلِ ذکر سمجھ کر یہاں زیرِ بحث لائی جا رہی ہیں۔

حدیث 37: عائشہ رضی اللہ عنہا کا دو مردوں کے سامنے غسل کرنا

ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن بیان کرتے ہیں:

«دَخَلْتُ عَلٰى عَائِشَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهَا، أَنَا وَأَخُوهَا مِنَ الرَّضَاعَةِ فَسَأَلَهَا عَنْ غُسْلِ النَّبِيِّ ﷺ مِنَ الْجَنَابَةِ؟ فَدَعَتْ بِإِنَاءٍ قَدْرَ الصَّاعِ فَاغْتَسَلَتْ، وَبَيْنَنَا وَبَيْنَهَا سِتْرٌ فَأَفْرَغَتْ عَلٰى رَأْسِهَا ثَلَاثًا قَالَ: وَكَانَ أَزْوَاجُ النَّبِيِّ ﷺ يَأْخُذْنَ مِنْ رُؤُوسِهِنَّ حَتّٰى تَكُونَ كَالْوَفْرَةِ»

''میں اور عائشہ رضی اللہ عنہا کا رضاعی بھائی عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس گئے تو آپ کے رضاعی بھائی نے رسول اللہ ﷺ کے غسل جنابت کے متعلق دریافت کیا تو انھوں نے تقریباً ایک صاع پانی منگوایا اور غسل کیا، جبکہ ہمارے اوران کے درمیان پردہ حائل تھا۔ آپ نے تین مرتبہ اپنے سر پر پانی ڈالا۔ راوی بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ کی ازواج مطہرات اپنے سر کے بال کترتی تھیں حتی کہ وہ وَفْرہ کی طرح ہوجاتے۔''[1]

[1] صحيح البخاري، الغسل، باب الغسل بالصاع ونحوه، حديث:251، وصحيح مسلم، الحيض، باب القدر المستحب من الماء......، حديث:320 واللفظ له. وَفْرة بال جو کانوں کو ڈھانپے اسے وَفْرَۃ کہتے ہیں. امہات المؤمنین کے بارے میں فرمایا گیا کہ کاٹنے کے بعد ان کے بال وفرہ کی طرح ہو جاتے جس کا مطلب صاف ظاہر ہے کہ بال کانوں کی لو تک نہیں بلکہ اس سے لمبے ہوتے تھے۔

اس حدیث پر منکرین کا پہلا اعتراض یہ ہے کہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے ان مردوں کے سامنے غسل کیوں کیا۔ دوسرا اعتراض یہ ہے کہ اگر ان کے درمیان پردہ حائل تھا تو پھر طریقۂ غسل کیسے بتایا، اور تیسرا اعتراض یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات اپنے سر کے بال وفرہ رکھتی تھیں۔

جواب پہلے اعتراض کا جواب تو واضح ہے کہ درمیان میں پردہ حائل تھا جیسا کہ حدیث سے واضح ہے، نیز مسئلہ دریافت کرنے والے دونوں مردوں میں سے ایک ان کا بھتیجا تھا اور دوسرا رضاعی بھائی جن کے سامنے زینت ظاہر کرنا جائز ہے لیکن برہنہ ہونا حرام ہے۔

دوسرے اعتراض کا جواب یہ ہے کہ انھوں نے طریقۂ غسل نہیں پوچھا تھا کہ آپ نے انھیں غسل کرکے دکھایا اور پردے کی اوٹ سے طریقہ کیسے معلوم ہوا بلکہ پانی کی مقدار بتانا مقصود تھا کہ عورت ایک صاع پانی سے غسل کرسکتی ہے تو مرد لامحالہ اتنی مقدار سے غسل کرسکتا ہے۔ امام مسلم نے ''قدر المستحب من الماء'' اورامام بخاری نے ''الغسل بالصاع'' کے عنوان کے تحت یہ حدیث ذکر کی ہے جو پانی کی مقدار پر دلالت کرتا ہے، طریقۂ غسل پر نہیں۔ اگر سر پر پانی ان کے سامنے ڈالا ہے تو وہ اس وجہ سے جائز ہے کہ یہ دونوں آدمی ایسے تھے کہ ان کے سامنے زینت ظاہر کرنا جائز ہے اور سر کے بال زینت میں شامل ہیں۔

تیسرے اعتراض کا جواب یہ ہے کہ عورت کا مذکورہ مقدار تک سر کے بال کاٹنے کے متعلق اہلِ علم کا اختلاف ہے۔ بعض علماء کے نزدیک یہ مسلم کی روایت کے مطابق جائز ہے جبکہ بعض اسے جائز نہیں کہتے اور اسے امہات المؤمنین کا اپنا فعل قرار دیتے ہیں۔ یہ بات واضح رہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ازواج مطہرات بال نہیں کاٹتی تھیں، اس کی دلیل ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے۔ وہ بیان کرتی ہیں کہ میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا:

«إِنِّي امْرَأَةٌ أَشُدُّ ضَفْرَ رَأْسِي أَفَأَنْقُضُهُ لِغُسْلِ الْجَنَابَةِ»

''میں اپنے سر کی مینڈھیاں خوب باندھا کرتی ہوں، کیا میں غسل کے وقت انھیں کھول دیا کروں؟''[1]

دوسری حدیث عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ انھیں احرام کے وقت حیض آ گیا جب کہ حج قریب تھا تو نبی ﷺ نے انھیں فرمایا:

«اُنْقُضِي رَأْسَكِ وَامْتَشِطِي»

''اپنے سر کے بال کھول دو اور کنگھی کرو۔''[2]

ان احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ازواج مطہرات کے سر کے بال پورے تھے، تاہم نبی ﷺ کی وفات کے بعد امہات المؤمنین کے بارے میں تذکرہ ملتا ہے، بعض علماء اسے ترکِ زینت پر محمل کرتے ہیں کہ امہات المؤمنین نے آپ ﷺ کی وفات کے بعد ترکِ زینت کے لیے یہ کام کیا، جبکہ بعض دوسرے عدم مشابہت بالرجال والفاسقات والکافرات اور شوہر کی اجازت کے ساتھ اتنی مقدار میں بال کاٹنے کو درست سمجھتے ہیں۔ دیکھیے فتاوی اسلامیہ للشیخ العثیمین رحمہ اللہ۔

حدیث 38: جنت میں اکثر فقیر لوگ جائیں گے

نبی ﷺ نے فرمایا:

«اِطَّلَعْتُ فِي الْجَنَّةِ فَرَأَيْتُ أَكْثَرَ أَهْلِهَا الْفُقَرَاءَ»

[1] جامع الترمذي، الطهارة، باب هل تنقض المرأة شعرها عند الغسل، حديث:105، وسنن النسائي، الطهارة، باب ذكر ترك المرأة نقض ضفر......، حديث: 242. [2] صحيح البخاري، الحيض، باب امتشاط المرأة عند غسلها من المحيض، حديث: 316.

"میں نے جنت میں جھانکا تو میں نے دیکھا کہ اس میں اکثریت فقراء کی تھی۔"[1]

ایک دوسری حدیث میں نبی ﷺ نے فرمایا:

«أَلَا أُخْبِرُكُمْ بِأَهْلِ الْجَنَّةِ؟ قَالُوا: بَلٰى، قَالَ ﷺ كُلُّ ضَعِيفٍ مُّتَضَعَّفٍ لَّوْ أَقْسَمَ عَلَى اللهِ لَأَبَرَّهُ»

"کیا میں تمھیں اہل جنت کے بارے میں نہ بتاؤں؟ صحابہ نے عرض کیا، کیوں نہیں، ضرور بتائیں، آپ نے فرمایا: "ہر کمزور شخص اور جسے کمزور سمجھا جائے، اگر وہ (بھروسا کرتے ہوئے) اللہ پر قسم ڈال دے تو وہ ضرور اسے پورا کردے۔"[2]

اس مضمون کے متعلق اور بھی احادیث ہیں، پرویز صاحب اعتراض کرتے ہوئے کہتے ہیں: اسلام غلبہ اور قوت کا دین ہے۔

﴿فَإِنَّ حِزْبَ اللهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ ۝﴾

"بے شک اللہ کی جماعت ہی غالب رہے گی۔"[3]

قرآن بار بار مسلمانوں کو حکم دیتا ہے کہ اتنی قوت جمع رکھو کہ مخالفین پر تمھارا رعب چھا جائے اور مخالفین یہ جانتے تھے کہ جب تک مسلمانوں کے دل سے یہ خیال نہ نکال دیا جائے کہ قوت وسطوت خدا کے ہاں برگزیدگی کا موجب ہے ان پر غالب آنا ناممکن ہے، لہٰذا انھوں نے اس قسم کی احادیث وضع کرنا شروع کردیں کہ خدا کے مقرب بندے وہ ہیں جو ضعیف و ناتواں ہیں، جن پر محتاجی و مفلسی چھائی رہتی ہے، جو کمزور اور بے چارگی کے مجسمے ہیں اور جو دنیا میں ذلیل و خوار ہوں۔ چنانچہ بخاری و مسلم میں ہے کہ حضور نے فرمایا: "میں نے جنت میں دیکھا کہ اس میں اکثریت سے وہ لوگ ہیں جو

---

[1] صحیح البخاري، الرقاق، باب صفة الجنة والنار، حدیث: 6546. [2] صحیح مسلم، الجنة ونعیمها، باب النار یدخلها الجبارون...... ، حدیث: 2853. [3] المآئدة 5:56.

دنیا میں فقیر تھے۔[1]

اس تحریر میں پرویز صاحب نے کوشش کی کہ ان احادیث کو قرآن کے مقابل لا کھڑا کرے اوران احادیث پر وضع کا حکم لگائے۔

جواب ① پہلی بات تو یہ ہے کہ پرویز صاحب کی یہ بات غلط ہے کہ اسلام غلبے اور قوت کا دین ہے بلکہ اسلام اس لیے ہے کہ اسے غالب کیا جائے اور اسے تقویت پہنچائی جائے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿هُوَ الَّذِيٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ﴾

''وہی ذات ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق دے کر بھیجا ہے تاکہ وہ اسے تمام ادیان پر غالب کریں۔''[2]

② دوسری بات یہ ہے کہ یہ احادیث قرآن کریم کے مطابق ہیں کیونکہ ہر دور کے سرداروں اور وڈیروں نے اپنے اپنے نبی کی مخالفت کی۔ نوح علیہ السلام کی قوم کے متعلق فرمایا:

﴿قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِهٖٓ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝﴾

''ان کی قوم کے سرداروں نے کہا: بے شک ہم تمھیں کھلی گمراہی میں دیکھتے ہیں۔''[3]

ہود علیہ السلام کی قوم کے سرداروں کے متعلق فرمایا:

﴿قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖٓ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْ سَفَاهَةٍ﴾

''ان کی قوم کے کافر سرداروں نے کہا: بے شک ہم تمھیں حماقت میں دیکھتے ہیں۔''[4]

صالح علیہ السلام کی قوم کے سرداروں کے متعلق فرمایا:

﴿قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ﴾

① مقام حدیث، ص: 224. ② التوبة 9:33. ③ الأعراف 7:60. ④ الأعراف 7:66.

''ان کی قوم کے متکبر سرداروں نے کہا۔''[1]

ان اقوام میں جو ایمان والے تھے جنھوں نے اپنے نبی کی حمایت کی وہ سب ضعیف لوگ تھے۔ فرمایا:

﴿ لِلَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِمَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ ﴾

''(متکبر سرداروں نے کہا) ان کمزور لوگوں سے جو ان میں سے ایمان لے آئے تھے۔''[2]

بنی اسرائیل کے بارے میں فرمایا:

﴿ وَاَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِيْنَ كَانُوْا يُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَ مَغَارِبَهَا الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا ﴾

''اور ہم نے ان لوگوں کو جو کمزور سمجھے جاتے تھے اس زمین کے مشرق ومغرب کا وارث بنایا جس میں ہم نے برکت رکھی ہے۔''[3]

نوح علیہ السلام کی قوم کے جو افراد ایمان لائے تھے ان کے متعلق متکبرین نے کہا:

﴿ وَمَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّاْيِ ۚ وَمَا نَرٰى لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ ﴾

''ہم دیکھتے ہیں کہ ہم میں سے تیری پیروی ان لوگوں نے کی ہے جو رذیل ہیں اور سرسری نظر رکھتے ہیں، اور ہم تو تم لوگوں میں اپنے سے کوئی برتری نہیں پاتے۔''[4]

اسی طرح خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم پر مکہ میں ابتدائی طور پر وہی لوگ ایمان لائے تھے جو معاشرے کے کمزور افراد تھے۔

[1] الأعراف 75:7. [2] الأعراف 75:7. [3] الأعراف 137:7. [4] هود 27:11.

3 تیسری بات یہ ہے کہ مال دار اور خوش حال لوگ اسلام کی مصیبتوں کو برداشت نہیں کر سکتے اور فرار کے لیے بہانے بناتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَسْتَاْذِنُوْنَكَ وَ هُمْ اَغْنِيَآءُ ﴾

"گناہ صرف انھی لوگوں پر ہے جو آپ سے باوجود غنی ہونے کے (پیچھے رہنے کی) اجازت چاہتے ہیں۔"[1]

جب کہ فقراء اور مساکین جہاد میں اکثر اخلاص کے ساتھ اور شجاعت کے ساتھ شریک ہوتے ہیں۔

4 چوتھی بات یہ ہے کہ قیامت کے دن مال داروں سے مال کے متعلق دو سوال کیے جائیں گے کہ مال کہاں سے کمایا، اور کہاں خرچ کیا؟ جو مال دار اس سوال میں کامیاب ہوں گے وہ جنت میں جائیں گے جب کہ فقراء و مساکین پانچ سو سال پہلے جنت میں جائیں گے کیونکہ وہ اکثر سوالات سے بری الذمہ ہوں گے۔

باقی فقراء اور مساکین پر یہ کوئی پابندی نہیں کہ وہ مال نہ کمائیں بلکہ وہ فقیری میں جو کماتے ہیں اس میں سے خرچ بھی کرتے ہیں اور اسلام کے غلبہ کے لیے کوشاں رہتے ہیں، پس خلاصۂ کلام یہ ہے کہ فقراء فقر کی حالت میں ایسے اعمال میں مشغول رہتے ہیں کہ ان اعمال صالحہ کی وجہ سے ان کی تعداد جنت میں زیادہ ہوگی۔

حدیث 39: حالت نماز میں مسلمانوں کا حسین عورت کو دیکھنا

امام ترمذی رحمہ اللہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ ایک حسین عورت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے نماز پڑھنے آیا کرتی تھی۔ کچھ لوگ تو اگلی صف میں بڑھ جاتے

[1] التوبة 93:9.

تاکہ اسے نہ دیکھیں اور کچھ لوگ پچھلی صف میں شریک ہوتے تھے اور رکوع کی حالت میں بغل کے نیچے سے اسے جھانکتے تھے۔اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی:[1]

﴿ وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَقْدِمِيْنَ مِنْكُمْ وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَاْخِرِيْنَ ۝ ﴾

''اور جو لوگ تم سے پہلے ہو گزرے ہم انھیں بھی جانتے ہیں اور جو تم سے بعد میں آنے والے ہیں ہم انھیں بھی جانتے ہیں۔''[2]

پرویز صاحب نے اس روایت پر بہت سخت تبصرہ کیا ہے، لکھتے ہیں:

1 آخر میں ہم جامع ترمذی کی ایک روایت نقل کر کے یہ سلسلہ ختم کرتے ہیں۔ آپ سوچیے کہ اس روایت کو دیکھ کر آپ کی نگاہیں اوپر اٹھ سکتی ہیں؟

2 اس قسم کی روایات پکار پکار کر کہہ رہی ہیں کہ یہ کبھی صحیح نہیں ہوسکتیں، انھیں اسلام کے دشمنوں نے وضع کیا ہے اور ان کی نسبت صحابۂ کرام اور نبیٔ اکرم ﷺ کی ذات گرامی کی طرف کردی۔

3 لیکن ہمارے مذہب پرست طبقہ کا یہ اصرار ہے کہ انھیں نہ صرف صحیح ماننا ہوگا بلکہ یہ بھی ماننا ہوگا کہ انھیں جبریل امین حضور ﷺ کی طرف لے کر نازل ہوئے تھے۔[3]

جواب 1 اس بارے میں علماء کی تحقیقات درج ذیل ہیں، بعض علماء نے کہا ہے کہ یہ حدیث نہیں ہے بلکہ ابوالجوزاء تابعی کا قول ہے یا یہ حدیث مرسل ہے۔امام ترمذی نے اسی بات کو ترجیح دی ہے اور مرسل حدیث ضعیف ہوتی ہے جس سے حجت نہیں پکڑی جاسکتی، لہٰذا اس حدیث کو مذہب پرستوں نے اس مقام تک نہیں پہنچایا کہ پرویز صاحب اس حدیث پر تین اعتراض کردیں۔

---

[1] جامع الترمذي، تفسير القرآن، باب ومن سورة الحجر، حديث:3122. [2] الحجر 15:24.
[3] مقام حدیث، ص: 192.

پس ایسی روایات جو محدثین کے نزدیک صحیح یا حسن مرفوع نہیں ہوتیں، ان پر اعتراض کر کے یہ بہانا بنانا کہ ساری احادیث قابل حجت نہیں، یہ صریح تلبیس ابلیس ہے۔ اور اگر حدیث صحیح ہو جیسا کہ بعض نے اسے صحیح کہا ہے تو پھر اس کا جواب یہ ہے کہ نبی ﷺ کے پیچھے باجماعت نماز پڑھنے والوں میں صرف صحابۂ کرام نہیں ہوتے تھے بلکہ منافقین بھی آیا کرتے تھے اور یہ کوئی بعید نہیں کہ منافقین ایسا کرتے ہوں۔

حدیث 40: فرعون کا ایمان لانا

پرویز صاحب نے ترمذی کی ایک حدیث کا معنی بیان کر کے اعتراضات کیے ہیں۔ روایت یہ ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جبریل کہتے ہیں کہ فرعون غرق ہونے لگا تو وہ اس وقت ایمان لانا چاہتا تھا۔ اے محمد! کاش، اس وقت تم مجھے دیکھتے کہ میں سمندر کی مٹی لیے ہوئے اس کے منہ میں ٹھونس رہا تھا کہ کلمہ نہ پڑھے اور اس پر اللہ تعالیٰ کی رحمت نہ آجائے۔''[1]

اعتراضات: 1 جبریل کا یہ کام نہیں کہ جو ایمان لانا چاہے اس کے منہ میں مٹی ٹھونسنے لگے اور خدا کی رحمت کو بند کر دے۔

2 فرشتے چونکہ خدا کے حکم کے پابند ہوتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ جبریل نے یہ کام خدا کے حکم کے مطابق کیا تھا۔

3 خدا کے حکم اور جبریل کی کارروائی کے باوجود فرعون نے کلمہ پڑھ لیا اور کہا:

﴿اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِيْٓ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْٓا اِسْرَآءِيْلَ وَ اَنَا مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ۝﴾

[1] جامع الترمذي، تفسير القرآن، باب ومن سورة يونس، حديث: 3107، و (ترجمہ پرویز) مقام حدیث، ص: 170.

”میں ایمان لاتا ہوں کہ اس معبود حقیقی کے سوا کوئی معبود نہیں جس پر بنو اسرائیل ایمان لائے۔ اور میں اطاعت گزاروں میں سے ہوں۔“[1]

اور یوں معاذ اللہ خدا کی تدبیر ناکام ہوگئی آپ تصور بھی کر سکتے ہیں کہ یہ تفسیر رسول اللہ ﷺ کی بیان فرمودہ ہوگی۔[2]

جواب پرویز صاحب کا طریقۂ تلبیس ہی یہ ہے کہ وہ اپنی طرف سے کچھ معنی اور کچھ تفسیر بنا کر اس پر غلط نتائج مرتب کرتے ہیں اور حدیث سے انکار کرنے کے لیے راستہ ہموار کرتے ہیں۔ وہ اس شعر کا مصداق ہے ۔

خشت اول چوں نہد معمار کج
تا ثریا می رود دیوار کج

یہاں پرویز صاحب نے حدیث کا جو معنی بیان کیا ہے اس میں تحریف کی ہے۔ اصل حدیث درج ذیل ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

«لَمَّا أَغْرَقَ اللهُ فِرْعَوْنَ قَالَ: آمَنْتُ أَنَّهُ لَا إِلٰهَ إِلَّا الَّذِي آمَنَتْ بِهِ بَنُو إِسْرَائِيلَ فَقَالَ جِبْرِيلُ: يَامُحَمَّدُ! لَوْ رَأَيْتَنِي وَأَنَا آخُذُ مِنْ حَالِ الْبَحْرِ وَأَدُسُّهُ فِي فِيهِ مَخَافَةَ أَنْ تُدْرِكَهُ الرَّحْمَةُ»

”جب اللہ نے فرعون کو غرق کیا تو اس نے کہا: میں ایمان لاتا ہوں کہ اس معبود حقیقی کے سوا کوئی معبود نہیں جس پر بنو اسرائیل ایمان لائے تو جبریل نے کہا: اے محمد ﷺ! کاش کہ آپ مجھے دیکھتے کہ میں سمندر سے کیچڑ پکڑ کر اس کے منہ میں ٹھونس رہا تھا کہ کہیں رحمت الٰہی اسے ڈھانپ نہ لے۔“[3]

---

[1] یونس 10:90. [2] مقام حدیث بالاختصار، ص: 171,170. [3] جامع الترمذي، تفسير القرآن، باب ومن سورة يونس، حديث: 3107.

پرویزی معنی کے مطابق جبریل علیہ السلام کا فرعون کے منہ میں مٹی ٹھونسنے کا عمل کلمہ پڑھنے سے پہلے کا ہے جب کہ حدیث میں واضح ہے کہ فرعون نے کلمہ کا اقرار کرلیا تھا، بعد میں جبریل علیہ السلام نے اس کے منہ میں مٹی ٹھونسی تھی۔ فرعون کا یہ ایمان لانا قانون الٰہی کے مطابق قابل اعتبار نہیں تھا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ يَوْمَ يَأْتِي بَعْضُ اٰيٰتِ رَبِّكَ لَا يَنْفَعُ نَفْسًا اِيْمَانُهَا لَمْ تَكُنْ اٰمَنَتْ مِنْ قَبْلُ ﴾

''جس روز تیرے رب کی بعض نشانیاں آجائیں گی تو کسی ایسے شخص کو اس کا ایمان لانا مفید نہیں ہوگا جو پہلے سے ایمان نہیں رکھتا۔''[1]

نیز فرمایا:

﴿ فَلَمْ يَكُ يَنْفَعُهُمْ اِيْمَانُهُمْ لَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا ﴾

''پس ان کے ایمان نے انھیں نفع نہ دیا جب انھوں نے ہمارے عذاب کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔''[2]

ان دونوں آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان پر نزع کا عالم طاری ہوجائے تو اس وقت ایمان لانا قبول نہیں، لہٰذا جبریل علیہ السلام نے یہ کام اللہ تعالیٰ کے اذن سے کیا۔ جب فرعون نے کلمہ پڑھا تو اسے یوں جواب دیا گیا:

﴿ آٰلْـٰٔنَ وَقَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ وَكُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ ○ ﴾

''اب (ایمان لاتا ہے)؟ اور اس سے قبل تو نافرمانی کرتا رہا اور تو فسادیوں میں سے تھا۔''[3]

یعنی اللہ تعالیٰ نے جبریل علیہ السلام کے کام کی تائید کردی، لہٰذا اس سے ثابت ہُوا کہ یہ

[1] الأنعام 158:6. [2] المؤمن 85:40. [3] يونس 91:10.

الفاظ اللہ تعالیٰ کی وحی سے کہے گئے۔

یہاں تک ان چالیس احادیث کے جواب بیان کیے گئے ہیں جنھیں طلوع اسلام والوں نے اور دیگر منکرینِ حدیث نے اپنی ناسمجھی کی وجہ سے محل اعتراض ٹھہرایا، حالانکہ ان کے علاوہ دوسری ایسی احادیث ہیں جن کو ماننے کے لیے یہ لوگ تیار نہیں۔ خصوصاً وہ احادیث جو علامات قیامت کے متعلق ہیں، مثلاً: دجال، امام مہدی، دابۃ الارض، سورج کا مغرب سے طلوع ہونا اور نزول عیسیٰ علیہ السلام وغیرہ لیکن اس وقت منکرینِ حدیث نزول عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق بحث وتلبیس سے کام لے کر مسلمانوں کا عقیدہ خراب کررہے ہیں۔ اس لیے یہ مسئلہ ایک مستقل عنوان کے تحت تفصیل سے بیان کرنا چاہتا ہوں۔

تیئیسواں شبہ: حیات ونزول مسیح عیسیٰ علیہ السلام

تمام اہل سنت والجماعت اور سلف صالحین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام زندہ حالت میں آسمان پر اٹھائے گئے اور وہ وہاں زندہ ہیں۔ قیامت کے قریب اتریں گے، دین محمدی پر فیصلے کریں گے اور پھر کچھ وقت بعد وفات پا جائیں گے۔

مرزا غلام احمد قادیانی کا عقیدہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام وفات پا چکے ہیں اور انھوں نے اپنے الہام سے ثابت کیا ہے کہ ان کی قبر کشمیر میں ہے۔ ان کے نزدیک احادیث میں جس عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کا ذکر ہے وہ عیسیٰ علیہ السلام خود نہیں بلکہ ان کی مثیل اور شبیہ پیدا ہوگا جو جہاد کو منسوخ کرے گا اور وہ نبی غیر تشریعی ظلی بروزی ہوگا۔

ان دونوں فریقوں کے درمیان عیسیٰ علیہ السلام کی موت اور حیات میں اختلاف ہے۔ اور عیسیٰ علیہ السلام کے آسمانوں پر اٹھائے جانے میں بھی اختلاف ہے۔ دوسرے فریق کے لوگ ظاہری طور پر اس کی شبیہ کو نبی غیر تشریعی مانتے ہیں۔ لیکن جب کہتے ہیں کہ وہ جہاد منسوخ

کرے گا تو معلوم ہوا کہ وہ نبی تشریعی ہوگا اور مرزائیوں کے نزدیک اس مثیل عیسیٰ کا مصداق خود مرزا غلام احمد قادیانی ہے۔

منکرینِ حدیث کا عقیدہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام آسمان پر اٹھائے گئے نہ وہ زندہ ہیں بلکہ وہ اپنی موت مر گئے اوران کے دوبارہ آسمان سے اتر آنے کی باتیں سب خرافات ہیں۔

جب میں یہ کتاب لکھ رہا تھا تو ایک شخص میرے پاس ایک کتاب لایا جس کا نام تھا ''عقیدۂ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم مؤلف کا نام محمد ہادی اور اپنے آپ کو فاضل علوم دینیہ تعلیم القرآن رستم ضلع مردان قرار دیا ہے۔ میں نے مؤلف رسالہ کی مدرسہ تعلیم القرآن کی طرف جھوٹی نسبت سے اندازہ لگایا کہ کتاب کا نام ''خاتم النبیین'' بھی کسی جھوٹ کو ثابت کرنے کے لیے استعمال کیا ہے۔میں نے کہا: اس مؤلف سے پوچھیں کہ اس نے حصول علم کے لیے اس دار العلوم میں کتنی مدت صرف کی؟ پھر اس سے پوچھیں کہ کیا اس کے پاس دارالعلوم کی سند فراغت ہے کیونکہ فاضل علوم دینیہ وہی ہوتا ہے جس کے پاس سند فراغت ہو، پھراس سے پوچھیں کہ دارالعلوم میں کسی استاد نے اسے رسالے میں مذکور مسئلے کا درس دیا تھا اور حیات، رفع عیسیٰ اور نزول عیسیٰ کا انکار آپ کسی بھی استاد کے حوالے سے ثابت کر سکتے ہیں۔ ہرگز نہیں کر سکتے۔ اس ظالم مؤلف نے رسالے کے آغاز پر سراسر جھوٹ سے کام لیا اور ہمارے دارالعلوم تعلیم القرآن کو بدنام کرنے کی کوشش کی۔ رسالے کے عنوان سے معلوم ہوا کہ رسالے کے اندر ضرور غلط باتیں لکھی ہوں گی جن کا خلاصہ یہ ہے کہ اس نے نزول عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق احادیث کا برملا انکار کیا ہے اور سلف صالحین کے عقیدے کو چھوڑ کر چند غیر معتبر متاخرین کی تقلید کی ہے، لہٰذا میں اس بحث میں اس کذاب کو خاص طور پر مخاطب کروں گا۔

ساتھیوں کے مشورے سے اس بحث میں قدرے تطویل سے کام لیا جائے گا تاکہ

مسلمان اس شخص کی تلبیس اور تدلیس سے بچ جائیں۔

اس بحث میں دو فصلیں ہوں گی:

فصل: ①

رفع اور نزول عیسیٰ علیہ السلام از روئے قرآن

❁ دلیل اول: اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ ؕ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ ○ اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسٰى ﴾

''اور انھوں (یہودیوں) نے (عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق) تدبیر کی اور اللہ نے بھی تدبیر کی جبکہ اللہ بہترین تدبیر کرنے والا ہے۔ جب اللہ نے کہا تھا: اے عیسیٰ۔''[1]

طریقۂ استدلال یہ ہے کہ یہودیوں نے عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کرنے کے لیے مختلف منصوبے بنائے جن میں پھانسی پر چڑھانا بھی تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے خفیہ تدبیر کے ذریعے سے انھیں قتل ہونے سے بچایا اور وہ تدبیر یہ تھی کہ فرمایا: اے عیسیٰ! میں تجھے پورا پورا قبض کرنے والا ہوں۔ اور پورا قبض کرنے کی تفسیر اگلے جملے میں مذکور ہے کہ میں تجھے اپنی طرف اٹھانے والا ہوں۔

❁ دلیل دوم: اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ ﴾

''بلکہ اللہ نے اس (عیسیٰ علیہ السلام) کو اپنی طرف اٹھالیا۔''[2]

اس آیت میں قتل اور صلیب سے بچانے کا طریقہ اور پورا پورا قبض کرنے کی تفسیر رَفع کے ساتھ مذکور ہے۔ اگر مُتَوَفِّيكَ سے ''موت دینا'' اور رَفَع سے درجات بلند کرنا، مراد

① آل عمرٰن 3:54,55. ② النسآء 4:158.

لیا جائے جیسا کہ منکرین مراد لیتے ہیں تو پھر اللہ تعالیٰ کی تدبیر کیسے کامیاب قرار پائے گی؟ اس صورت میں تو یہودی اپنے مقصد میں کامیاب ہوتے نظر آتے ہیں کہ انھوں نے عیسیٰ علیہ السلام سے جان چھڑالی اور ان کی کوششوں کے نتیجے میں عیسیٰ کی وفات ہوگئی، حالانکہ ایسے نہیں ہوا۔

یہاں رفع سے اس کا حقیقی معنی مراد ہے، یعنی اوپر لے جانا۔ قرآن کریم میں رفع کا مادہ 29 مرتبہ بیان ہوا ہے، ان میں سے 12 مواقع پر اس سے درجات بلند کرنا مراد ہے، اور اکثر مواقع پر درجات کا اشارہ بھی مذکور ہے۔ 17 مواقع پر رفع سے حقیقی معنی اوپر اٹھا لینا مراد ہے۔ ان میں سے بعض آیات یہ ہیں۔

﴿ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ﴾

''اور ہم نے تم پر طور کو بلند کیا۔''[1]

نیز فرمایا:

﴿ وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ ﴾

''اور جب ابراہیم (اور اسماعیل علیہما السلام بیت اللہ کی) بنیادیں اٹھا رہے تھے۔''[2]

نیز فرمایا:

﴿ وَرَفَعَ اَبَوَيْهِ عَلَى الْعَرْشِ ﴾

''اور اس (یوسف علیہ السلام) نے اپنے والدین کو تخت شاہی پر بٹھایا۔''[3]

نیز فرمایا:

﴿ اَللّٰهُ الَّذِیْ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا ﴾

''اللہ وہ ذات ہے جس نے آسمانوں کو جنھیں تم دیکھتے ہو بغیر ستونوں کے

(1) البقرة 63:2. (2) البقرة 127:2. (3) يوسف 100:12.

بلند کیا۔"[1]

مؤلف محمد ہادی کو قرآن کریم میں یہ آیات نظر نہیں آتیں اور انھیں یہ قاعدہ بھی یاد نہیں کہ جب تک حقیقی معنی کا امکان ہو تو مجازی معنی نہیں لیا جاتا جبکہ قرآن کریم میں مجاز کے وجود سے بھی کئی علماء انکار کرتے ہیں، لہٰذا اس آیت ﴿ بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ ﴾ "بلکہ اللہ نے انھیں اپنی طرف اٹھا لیا۔" میں صرف حقیقی معنی مراد ہے۔

یہ بات بھی ذہن نشین رہے کہ جہاں رفع درجات کا معنی مراد ہوتا ہے وہاں حرف ﴿ اِلٰى ﴾ استعمال نہیں ہوتا لیکن یہاں الفاظ ﴿ اِلٰى ﴾ اور ﴿ اِلَيْهِ ﴾ صاف دلیل ہیں کہ یہاں رفع درجات مراد نہیں، لہٰذا اس رسالے کے مؤلف کو چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو علامہ نہ سمجھے بلکہ کسی عالم حق پرست کے سامنے صحیح طور پر زانوئے تلمذ طے کرے۔

﴿ دلیل سوم: ﴿ بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ ﴾ میں حرف ﴿ بَلْ ﴾ سے بھی رفع مسیح ثابت ہوتا ہے کیونکہ حرف بل کے ماقبل اور مابعد میں مغایرت اور منافات ہوتی ہے۔ یہاں بھی وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ "اسے قتل کیا نہ اسے سولی چڑھایا" پہلے فرمایا، پھر جب ﴿ بَلْ ﴾ کے ذریعے سے عطف کیا گیا۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ قتل ہوئے نہ انھیں سولی چڑھایا گیا (اور یہود و نصاریٰ میں سے کوئی بھی ان کی طبعی موت مرنے کا قائل نہیں) تو کہا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں اپنی طرف اٹھا لیا۔

﴿ دلیل چہارم: فرمانِ الٰہی ہے:

﴿ وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا ۝ ﴾

"اور اہل کتاب میں سے سب کے سب اس (مسیح علیہ السلام) پر ان کی موت سے پہلے ضرور ایمان لائیں گے اور قیامت کے دن وہ ان پر گواہی دیں گے۔"[2]

[1] الرعد 2:13. [2] النسآء 159:4.

اس میں ابن عباس، ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم اور حسن اور ابو مالک رحمہ اللہ کا قول ہے کہ اس آیت میں ﴿ مَوْتِهٖ ﴾ اور ﴿ بِهٖ ﴾ میں جو ضمیر ہے وہ عیسیٰ علیہ السلام کی طرف لوٹتی ہے اور اس قول کی دلیل درج ذیل حدیث ہے۔

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! قریب ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام تم میں اتر آئیں گے، وہ عدل وانصاف سے فیصلے کریں گے، صلیب کو توڑیں گے، خنزیر کو قتل کریں گے، جزیہ ختم کردیں گے اور مال و دولت کی فراوانی ہوگی یہاں تک کہ مال و دولت کو قبول کرنے والا کوئی نہیں ہوگا۔ یہاں تک کہ ایک سجدہ دنیا اور اس میں جو کچھ ہے اس سے بہتر ہوگا۔''

پھر ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ اگر تم چاہتے ہو تو اس (مندرجہ بالا) آیت کی تلاوت کرو۔''[1]

اس سے واضح ہوا کہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے اس آیت کی اس حدیث سے تفسیر کی اور اس سے یہ استدلال کیا کہ عیسیٰ علیہ السلام کا نزول ہوگا۔

اگرچہ اس آیت کی تفسیر میں دو دوسرے اقوال بھی ہیں جو عکرمہ، مجاہد اور ضحاک رحمہم اللہ (تابعین) سے منقول ہیں لیکن مرفوع روایت اور صحابی کی روایت جو سند کے لحاظ سے صحیح بھی ہو تو اس کے مقابلے میں تابعی کا قول نہیں قبول کیا جائے گا۔ قول اول کی آیت کے آخری جملے سے بھی تائید ہوتی ہے۔ فرمایا:

﴿ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا ۝ ﴾

''اور وہ قیامت کے دن ان پر گواہی دیں گے۔''[2]

[1] صحيح البخاري، أحاديث الأنبياء، باب نزول عيسى ابن مريم عليهما السلام، حديث: 3448. [2] النسآء 4:159.

عیسیٰ علیہ السلام کی اس شہادت کا تذکرہ سورۃ المآئدہ کے آخر میں مذکور ہے۔ رسالے کے مؤلف محمد ہادی نے تمام مفسرین اور صحیحین کی مذکورہ حدیث کے مقابلے میں صرف امام نووی رحمہ اللہ کا قول بیان کر کے فتویٰ لگایا ہے کہ لوگ بغیر سوچے سمجھے کتاب اللہ پر ظلم کرتے ہیں، پھر انھوں نے تلبیس کر کے اس تفسیر کے بعض لوازمات پر رد کر کے خوشی کا اظہار کیا ہے۔

وہ لکھتے ہیں: جب نزول عیسیٰ کے بعد لوگ اس پر ایمان لائیں گے تو پھر یہ لوگ عیسیٰ علیہ السلام کے امتی ہو گئے نہ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے۔

کسی پر ایمان لانے سے اس کا امتی بننا کہاں سے لازم آتا ہے؟ ایمان، تصدیق کرنے اور بات ماننے کو کہا جاتا ہے۔ جو غافل لوگ محمد ہادی کے اس رسالے کو مان لیں، کیا وہ اس کے امتی بن جائیں گے؟

دوسری بات یہ کہی ہے کہ گواہی مجرموں پر دی جاتی ہے نہ کہ ایمان والوں پر۔

یہ تو بالکل نادانوں کی سی بات ہے۔ کیا ہادی صاحب کی نظر سے یہ آیت نہیں گزری؟

﴿لِّتَكُونُوا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا﴾

”تاکہ تم لوگوں پر شہادت دینے والے بنو، اور اللہ کا رسول تمھارا گواہ ہو۔“[1]

یہاں ﴿عَلَيْكُمْ﴾ ”تم“ پر کا خطاب صحابۂ کرام اور اہل ایمان سے ہے، کیا آپ کے نزدیک وہ مجرم تھے؟

دلیل پنجم: فرمان الٰہی ہے:

﴿وَإِنَّهُ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ فَلَا تَمْتَرُنَّ بِهَا﴾

”اور البتہ وہ قیامت کی ایک نشانی ہے، پس اس نشانی میں شک نہ کرو۔“[2]

امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے ابوہریرہ، ابن عباس رضی اللہ عنہم، ابوالعالیہ، ابو مالک، عکرمہ، حسن،

[1] البقرۃ 2:143. [2] الزخرف 43:61.

قتادہ، سدی اور ضحاک رحمہ اللہ سے اور ابن جریر رحمہ اللہ نے حسن، مجاہد، قتادہ، ضحاک اور ابن زید رحمہ اللہ اور ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایات نقل کی ہیں کہ ﴿اِنَّهٗ﴾ میں ضمیر عیسی علیہ السلام کی طرف راجع ہے اور اس سے مراد ان کا قیامت سے پہلے زمین پر نازل ہونا ہے۔ یہاں علم ''دلیل'' کے معنی میں ہے اور یہ معنی قرآن پاک میں بہت جگہ استعمال ہوا ہے، چنانچہ اس آیت سے مراد یہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کا قیامت سے پہلے آسمان سے نزول قیامت کے لیے دلیل ہے اور یہ ان مفسرین کی رائے ہے جو کہتے ہیں کہ یہاں علم علامت کے معنی میں ہے کیونکہ ہر دلیل مدعی کے لیے علامت ہوتی ہے۔ یہاں کسی مفسر نے تحریف نہیں کی، لہٰذا اس بات پر جناب ہادی کو سخت غصہ آگیا۔ وہ کہتے ہیں: ''اب قرآن کے الفاظ میں تبدیلی کرنا کون سا اسلام ہے۔ یہاں علم کا معنی علامت اور نشانی کیا گیا ہے، البتہ بعض مفسرین نے ﴿اِنَّهٗ﴾ کی ضمیر کا مرجع قرآن کریم کو بنایا ہے، لیکن ابن کثیر نے فرمایا کہ یہ قول حقیقت سے بہت دور ہے۔

اس آیت میں واتبعون کا جملہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام نزول کے بعد ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے تابع فرمان ہوں گے جسے امتی بھی کہا جاسکتا ہے۔ نزول کے بعد وہ صفت نبوت کے ساتھ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متبع اور امتی ہوں گے۔ دونوں صفات میں کوئی تضاد نہیں۔ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نبی اور رسول تھے لیکن آپ نے اگر کبھی اپنے کسی صحابی کے پیچھے مقتدی بن کر نماز پڑھی تو اس وقت آپ کا وصف نبوت زائل نہیں ہوا۔

نوٹ: کسی آیت کی تفسیر میں دو تین یا زیادہ اقوال ثابت ہوں تو ان میں سے کسی ایک کو اپنی پسند کے مطابق لے لینا اور باقی اقوال چھوڑ دینا یہ مفسر اور عالم کے شایان شان نہیں۔ بلکہ دلیل اور ثبوت کی بنیاد پر راجح معنی لینا چاہیے۔

دلیل ششم: فرمانِ الٰہی ہے:

﴿ وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا ﴾

”وہ (عیسیٰ علیہ السلام) بچپن اور بڑھاپے میں لوگوں سے باتیں کرے گا۔“[1]

ابن جریر نے ابن زید سے اور صاحب اللباب نے حسین بن الفضیل سے روایت نقل کی ہے کہ بڑھاپے کا زمانہ عیسیٰ علیہ السلام پر آسمان کی طرف اٹھائے جانے سے پہلے نہیں گزرا بلکہ نزول کے بعد بڑھاپے کی عمر میں لوگوں کے ساتھ باتیں کریں گے۔ ویسے تو بڑھاپے میں ہر شخص باتیں کرسکتا ہے لیکن عیسیٰ علیہ السلام کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ نزول کے بعد بڑھاپے کی عمر میں ہوں گے۔ آسمان میں ان کی جو عمر گزر گئی وہ چونکہ خرق عادت عمر ہے اسی لیے وہ دنیوی زندگی کے ساتھ شمار نہیں کی جاتی۔ یہ قرآنی دلائل ہیں جو عیسیٰ علیہ السلام کے رفع حقیقی اور پھر نزول پر دلالت کرتے ہیں۔

فصل : ②

عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کے متعلق متواتر احادیث

اس باب میں ہم نے بہت سی احادیث نقل کرنے کا اہتمام کیا ہے تاکہ ہر راست فکر شخص یہ یقین کرلے کہ اتنے ائمۂ محدثین اور اتنی روایات جھوٹ نہیں ہوسکتیں بلکہ وہ شخص جھوٹا ہوگا جو حدیث کی ان ساری روایات کو غلط تصور کرتا ہو۔

ابن کثیر رحمہ اللہ نے عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کے متعلق احادیث کی دس سندیں بیان کی ہیں۔ امام ترمذی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کے نزول اور قتل دجال کے متعلق احادیث درج ذیل صحابۂ کرام سے مروی ہیں: عمران بن حصین، نافع بن عیینہ، ابوبرزہ اسلمی، حذیفہ بن اسید، ابوہریرہ، کیسان، عثمان بن ابی العاص، جابر، ابوامامہ، ابن مسعود، ابن عمرو،

[1] آل عمرٰن 3:46.

سمرہ بن جندب، نواس بن سمعان، عمرو بن عوف، اور حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہم۔

ابن کثیر، ابن جریر، ابن عطیہ اور ابو حیان رحمہم اللہ اور دیگر مفسرین نے فرمایا کہ یہ احادیث متواتر ہیں۔ احادیث مندرجہ ذیل ہیں:

1 ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ! لَيُوشِكَنَّ أَنْ يَنْزِلَ فِيكُمُ ابْنُ مَرْيَمَ حَكَمًا عَدْلًا فَيَكْسِرَ الصَّلِيبَ وَيَقْتُلَ الْخِنْزِيرَ وَيَضَعَ الْجِزْيَةَ وَيَفِيضَ الْمَالُ حَتّٰى لَا يَقْبَلَهُ أَحَدٌ حَتّٰى تَكُونَ السَّجْدَةُ الْوَاحِدَةُ خَيْرٌ مِّنَ الدُّنْيَا وَمَا فِيهَا، ثُمَّ يَقُولُ أَبُوهُرَيْرَةَ وَاقْرَؤُوا إِنْ شِئْتُمْ: ﴿وَإِن مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ إِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهِ قَبْلَ مَوْتِهِ ۖ وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ يَكُونُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا﴾»

”اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! البتہ قریب ہے کہ ابن مریم تم میں تشریف لائیں۔ وہ حاکم اور عادل کی حیثیت سے آئیں گے، صلیب کو توڑیں گے، خنزیر کو قتل کریں گے، جزیہ ختم کر دیں گے مال و دولت کی فراوانی ہوگی حتی کہ اسے کوئی قبول کرنے والا نہیں ہوگا۔ حتی کہ ایک سجدہ دنیا اور اس میں جو کچھ ہے اس سے بہتر ہوگا۔“

پھر ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے: اگر تم چاہو تو اس آیت کی تلاوت کرو“ اور اہل کتاب میں سے سب کے سب اس (مسیح علیہ السلام) پر اس کی موت سے پہلے ضرور ایمان لائیں گے اور وہ قیامت کے دن ان پر گواہی دیں گے۔“[1]

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

[1] صحیح البخاري، أحادیث الأنبیاء، باب نزول عیسی ابن مریم علیهما السلام، حدیث:3448.

«كَيْفَ أَنْتُمْ إِذَا نَزَلَ ابْنُ مَرْيَمَ فِيكُمْ وَإِمَامُكُمْ مِّنْكُمْ؟»

''تمھاری اس وقت کیسی حالت ہوگی جب ابن مریم تم میں نازل ہوں گے، اور تمھارا امام تم ہی میں سے ہوگا۔''[1]

اور امام مسلم رحمہ اللہ نے یہ الفاظ زائد نقل کیے ہیں، ابن ابوذئب نے فرمایا: ''تمھارا امام تم ہی میں سے ہوگا۔'' کا معنی یہ ہے کہ وہ عیسیٰ علیہ السلام تمھارے رب کی کتاب اور تمھارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے مطابق فیصلے کریں گے۔[2]

2 ابوہریرہ رضی اللہ عنہ، نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا:

«يَمْكُثُ عِيسَى فِي الْأَرْضِ بَعْدَ مَا يَنْزِلُ أَرْبَعِينَ سَنَةً ثُمَّ يَمُوتُ وَيُصَلِّي عَلَيْهِ الْمُسْلِمُونَ وَيَدْفِنُونَهُ»

''عیسیٰ علیہ السلام نزول کے بعد چالیس سال زمین پر رہیں گے، پھر آپ فوت ہوجائیں گے، مسلمان آپ کی نماز جنازہ پڑھیں گے اور آپ کو دفن کریں گے۔''[3]

3 ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«لَمْ يُسَلَّطْ عَلَى قَتْلِ الدَّجَّالِ إِلَّا عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ»

''دجال کے قتل کرنے پر صرف عیسیٰ ابن مریم ہی مسلط ومقرر کیے گئے ہیں۔''[4]

4 ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«يَقْتُلُ ابْنُ مَرْيَمَ الدَّجَّالَ بِبَابِ لُدٍّ»

''ابن مریم دجال کو باب لد پر قتل کریں گے۔''[5]

---

1 صحيح البخاري، أحاديث الأنبياء، باب نزول عيسى ابن مريم عليهما السلام، حديث: 3449. 2 صحيح مسلم، الإيمان، باب نزول عيسى ابن مريم عليهما السلام، حديث: 155. 3 مسند أبي داود الطيالسي: 4/274,273، حديث: 2664. 4 مسند أبي داود الطيالسي: 4/241، حديث: 2626. 5 جامع الترمذي، الفتن، باب ماجاء في قتل عيسىٰ بن مريم ◄◄

5 ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ! لَيُهِلَّنَّ ابْنُ مَرْيَمَ مِنْ فَجِّ الرَّوْحَاءِ بِالْحَجِّ أَوْ بِالْعُمْرَةِ أَوْ لَيَثْنِيَنَّهُمَا»

''اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! ابن مریم مقام فج الروحاء سے حج یا عمرہ یا دونوں کے لیے ضرور تلبیہ پڑھیں گے۔''[1]

6 ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«لَا يَنْزِلُ الدَّجَّالُ الْمَدِينَةَ وَلٰكِنَّهُ يَنْزِلُ بَيْنَ الْخَنْدَقِ وَعَلٰى كُلِّ نَقْبٍ مِّنْهَا مَلَائِكَةٌ يَّحْرِسُونَهَا فَأَوَّلُ مَنْ يَّتَّبِعُهُ النِّسَاءُ وَالْإِمَاءُ فَيَذْهَبُ فَيَتَّبِعُهُ النَّاسُ فَيُؤْذُونَهُ فَيَرْجِعُ غَضْبَانَ حَتّٰى يَنْزِلَ الْخَنْدَقَ فَيَنْزِلُ عِنْدَ ذٰلِكَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ»

''دجال مدینہ میں داخل نہیں ہوگا، لیکن وہ خندق کے درمیان تک پہنچ جائے گا۔ مدینہ کے تمام راستوں کی فرشتے حفاظت کررہے ہوں گے۔ سب سے پہلے عورتیں اور لونڈیاں اس کی اتباع کریں گی، پھر لوگ اس کی اتباع کریں گے اور وہ اسے اذیت پہنچائیں گے تو وہ غصے کی حالت میں واپس آئے گا حتی کہ وہ خندق تک پہنچ جائے گا، تب عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام کا نزول ہوگا۔''[2]

7 ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«اَلْأَنْبِيَاءُ إِخْوَةٌ لِّعَلَّاتٍ أُمَّهَاتُهُمْ شَتّٰى وَدِينُهُمْ وَاحِدٌ، وَأَنَا أَوْلَى النَّاسِ بِعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ لِأَنَّهُ لَمْ يَكُنْ بَيْنِي وَبَيْنَهُ نَبِيٌّ

◄◄ عليهما السلام الدجال، حديث: 2244. [1] صحيح مسلم، الحج، باب إهلال النبي ﷺ......، حديث: 1252، وشعب الإيمان للبيهقي: 441/3، حديث: 4005 واللفظ له. [2] المعجم الأوسط للطبراني: 219/6، ومجمع الزوائد: 349/7.

فَإِذَا رَأَيْتُمُوهُ فَاعْرِفُوهُ فَإِنَّهُ رَجُلٌ مَّرْبُوعُ الْخَلْقِ إِلَى الْحُمْرَةِ وَالْبَيَاضِ سَبْطُ الرَّأْسِ كَأَنَّ رَأْسَهُ يَقْطُرُ وَإِنْ لَّمْ يُصِبْهُ بَلَلٌ بَيْنَ مُمَصَّرَتَيْنِ فَيَدُقُّ الصَّلِيبَ وَيَقْتُلُ الْخِنْزِيرَ وَيَضَعُ الْجِزْيَةَ وَيُقَاتِلُ النَّاسَ عَلَى الْإِسْلَامِ حَتّٰى يُهْلِكَ اللهُ فِي زَمَانِهِ الْمِلَلَ كُلَّهَا غَيْرَ الْإِسْلَامِ وَيُهْلِكَ اللهُ فِي زَمَانِهِ مَسِيحَ الضَّلَالَةِ الْكَذَّابَ الدَّجَّالَ وَتَقَعُ الْأَمَانَةُ فِي زَمَانِهِ فِي الْأَرْضِ حَتّٰى تَرْتَعَ الْأُسُودُ مَعَ الْإِبِلِ وَالنُّمُورُ مَعَ الْبَقَرِ وَالذِّئَابُ مَعَ الْغَنَمِ وَيَلْعَبَ الصِّبْيَانُ مَعَ الْحَيَّاتِ لَا يَضُرُّ بَعْضُهُمْ بَعْضًا فَيَلْبَثُ فِي الْأَرْضِ مَاشَاءَ اللهُ ثُمَّ يُتَوَفّٰى فَيُصَلِّي عَلَيْهِ الْمُسْلِمُونَ»

''انبیاء علیہم السلام علاتی بھائی ہیں۔ان کا باپ ایک اور مائیں الگ الگ ہیں اوران کا دین ایک ہی ہے۔عیسیٰ ابن مریم کا میں زیادہ حق دار اور تعلق دار ہوں کیونکہ میرے اوران کے درمیان کوئی نبی نہیں، لہٰذا جب تم انھیں دیکھو تو انھیں پہچان لینا کہ وہ درمیانے قد والے، سرخ وسفید رنگ والے اورسیدھے بالوں والے ہیں، گویا کہ ان کے بالوں سے پانی ٹپکتا محسوس ہوگا اگرچہ وہ گیلے نہیں ہوں گے۔وہ زردی مائل کپڑوں میں ملبوس ہوں گے، وہ صلیب توڑیں گے، خنزیر کو قتل کریں گے، جزیہ ختم کردیں گے،اسلام مخالف لوگوں سے قتال کریں گے حتی کہ اللہ تعالیٰ ان کے زمانے میں تمام غیر اسلامی ادیان کو ختم کردے گا اوراللہ تعالیٰ ان کے زمانے میں مسیحِ گمراہی دروغ گو دجال کو ہلاک کرے گا۔ان کے زمانے میں روئے زمین پر امن قائم ہوجائے گا حتی کہ کالا ناگ اونٹوں کے ساتھ، چیتے گائے کے ساتھ اور بھیڑیے بکریوں کے ساتھ چریں گے اور بچے

سانپوں کے ساتھ کھیلیں گے۔ کوئی کسی کو نقصان نہیں پہنچائے گا اور جس قدر اللہ تعالیٰ چاہے گا وہ زمین پر رہیں گے، پھر وفات پا جائیں گے اور مسلمان ان کی نماز جنازہ پڑھیں گے۔''[1]

8 ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«لَا تَقُومُ السَّاعَةُ حَتّٰى تَنْزِلَ الرُّومُ بِالْأَعْمَاقِ، أَوْ بِدَابِقَ، فَيَخْرُجُ إِلَيْهِمْ جَيْشٌ مِّنَ الْمَدِينَةِ مِنْ خِيَارِ أَهْلِ الْأَرْضِ يَوْمَئِذٍ، فَإِذَا تَصَافُّوا قَالَتِ الرُّومُ: خَلُّوا بَيْنَنَا وَبَيْنَ الَّذِينَ سَبَوْا مِنَّا نُقَاتِلْهُمْ، فَيَقُولُ الْمُسْلِمُونَ: لَا وَاللهِ! لَا نُخَلِّي بَيْنَكُمْ وَبَيْنَ إِخْوَانِنَا فَيُقَاتِلُونَهُمْ، فَيَنْهَزِمُ ثُلُثٌ لَّا يَتُوبُ اللهُ عَلَيْهِمْ أَبَدًا، وَّيُقْتَلُ ثُلُثُهُمْ أَفْضَلُ الشُّهَدَاءِ عِنْدَ اللهِ، وَيَفْتَحُ الثُّلُثُ لَا يُفْتَنُونَ أَبَدًا، فَيَفْتَتِحُونَ قُسْطُنْطِينَةَ فَبَيْنَمَا هُمْ يَقْتَسِمُونَ الْغَنَائِمَ قَدْ عَلَّقُوا سُيُوفَهُمْ بِالزَّيْتُونِ إِذْ صَاحَ فِيهِمُ الشَّيْطَانُ إِنَّ الْمَسِيحَ قَدْ خَلَفَكُمْ فِي أَهْلِيكُمْ فَيَخْرُجُونَ وَذٰلِكَ بَاطِلٌ فَإِذَا جَاءُوا الشَّامَ خَرَجَ فَبَيْنَاهُمْ يُعِدُّونَ لِلْقِتَالِ يُسَوُّونَ الصُّفُوفَ إِذْ أُقِيمَتِ الصَّلَاةُ فَيَنْزِلُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ فَأَمَّهُمْ فَإِذَا رَآهُ عَدُوُّ اللهِ تَعَالٰى ذَابَ كَمَا يَذُوبُ الْمِلْحُ فِي الْمَاءِ فَلَوْ تَرَكَهُ لَانْذَابَ حَتّٰى يَهْلِكَ وَلٰكِنْ يَّقْتُلُهُ اللهُ بِيَدِهِ فَيُرِيهِمْ دَمَهُ فِي حَرْبَتِهِ»

''قیامت قائم نہیں ہوگی حتی کہ رومی لشکر (شام کے علاقے حلب کے قریب)

---

[1] سنن أبي داود، الملاحم، باب خروج الدجال، حديث:4324، والمصنف لابن أبي شيبة: 499/7، حديث:37515 واللفظ له.

اعماق یا دابق پر پڑاؤ ڈالے گا تو ان سے مقابلے کے لیے روئے زمین میں اس دور کے بہترین افراد پر مشتمل ایک لشکر مدینے سے روانہ ہوگا۔ جب دونوں لشکر صف بندی کرلیں گے تو رومی کہیں گے: ہمارے اور ان لوگوں کے درمیان سے ہٹ جاؤ جنھوں نے ہمارے ساتھیوں کو قیدی بنالیا تھا۔ ہم ان سے قتال کریں گے تو مسلمان کہیں گے، اللہ کی قسم! ایسے نہیں ہوگا، ہم اپنے بھائیوں سے کبھی الگ نہیں ہوں گے، چنانچہ وہ ان سے لڑیں گے تو ان میں سے ایک تہائی بھاگ جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ کبھی بھی ان کی توبہ قبول نہیں فرمائے گا۔ ان میں سے ایک تہائی شہید ہوجائیں گے، وہ اللہ کے ہاں بہترین شہداء ہوں گے، اور تہائی کامیاب ہوں گے، وہ کبھی فتنے سے دوچار نہیں ہوں گے، پس وہ قسطنطنیہ فتح کریں گے۔ وہ آپس میں مال غنیمت تقسیم کررہے ہوں گے جبکہ انھوں نے اپنی تلواریں زیتون کے درخت سے لٹکائی ہوں گی کہ شیطان انھیں بلند آواز میں کہے گا: بے شک مسیح (دجال) تمھارے پیچھے تمھارے اہل وعیال میں آپہنچا، پس وہ وہاں سے روانہ ہوں گے، حالانکہ یہ خبر باطل ہوگی، پس جب وہ ملک شام پہنچیں گے تو پھر وہ نکلے گا، اسی اثنا میں کہ وہ قتال کے لیے تیاری کررہے ہوں گے اور صفیں درست کررہے ہوں گے تو ناگہاں نماز کے لیے اقامت کہی جائے گی تو عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام کا نزول ہوگا۔ وہ ان کی امامت کرائیں گے، پس جب اللہ کا دشمن ان کو دیکھے گا تو وہ اس طرح پگھل جائے گا جس طرح نمک پانی میں پگھل کر حل ہوجاتا ہے، پس اگر وہ (عیسیٰ علیہ السلام) اس کو ویسے بھی چھوڑ دیں تو وہ خود بخود گل کر ہلاک ہوجائے گا لیکن اللہ تعالیٰ ان کے ہاتھوں اسے ہلاک کرے گا، پس وہ اس کا خون انھیں

اپنے نیزے میں دکھائیں گے۔''[1]

9 ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے ابو القاسم الصادق المصدوق صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا:

«يَخْرُجُ أَعْوَرُ الدَّجَّالِ مَسِيحُ الضَّلَالَةِ قِبَلَ الْمَشْرِقِ فِي زَمَنِ اخْتِلَافٍ مِنَ النَّاسِ وَفِرْقَةٍ فَيَبْلُغُ مَاشَاءَ اللهُ أَنْ يَبْلُغَ مِنَ الْأَرْضِ فِي أَرْبَعِينَ يَوْمًا، اللهُ أَعْلَمُ مَا مِقْدَارُهَا فَيَلْقَى الْمُؤْمِنُونَ شِدَّةً شَدِيدَةً، ثُمَّ يَنْزِلُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ مِنَ السَّمَاءِ فَيَؤُمُّ النَّاسَ فَإِذَا رَفَعَ رَأْسَهُ مِنْ رَكْعَتِهِ قَالَ: سَمِعَ اللهُ لِمَنْ حَمِدَهُ، قَتَلَ اللهُ الْمَسِيحَ الدَّجَّالَ وَظَهَرَ الْمُسْلِمُونَ» فَأَحْلِفُ أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ أَبَا الْقَاسِمِ الصَّادِقَ الْمَصْدُوقَ قَالَ: «إِنَّهُ لَحَقٌّ وَأَمَّا أَنَّهُ قَرِيبٌ فَكُلُّ مَا هُوَ آتٍ فَهُوَ قَرِيبٌ»

''کانا دجال مسیحِ گمراہی لوگوں کے اختلاف وافتراق کے دور میں مشرق کی طرف سے نکلے گا اور وہ چالیس روز میں، جس قدر اللہ چاہے گا، زمین کے حصے کو فتح کرے گا اور اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ اس کی مقدار کتنی ہوگی۔ مومنوں کو بہت تکلیف کا سامنا کرنا پڑے گا، پھر عیسیٰ ابن مریم آسمان سے نازل ہوں گے، جبکہ لوگ (نماز کے لیے) کھڑے ہوں گے (اور لوگوں کو نماز پڑھائیں گے) جب وہ رکوع سے سر اٹھائیں گے''تو ''سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهُ'' کہنے کے ساتھ یہ الفاظ ''اللہ تعالیٰ مسیح دجال کو ہلاک کرے، اور مومن غالب آجائیں۔'' کہیں گے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے قسم اٹھائی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے، جو صادق ومصدوق ہیں،

[1] صحيح مسلم، الفتن، باب في فتح قسطنطنية......، حديث:2897.

فرمایا: ”بے شک یہ حق ہے۔ بے شک وہ قریب ہے، پس ہر وہ چیز جو آنے والی ہے وہ قریب ہے۔“ [1]

10 ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«يُوشِكُ أَنْ يَنْزِلَ فِيكُمُ ابْنُ مَرْيَمَ إِمَامًا مُّقْسِطًا فَيُصَلِّي الصَّلَوَاتِ الْخَمْسَ وَيُجَمِّعُ الْجُمُعَ وَيَزِيدُ فِي الْحَلَالِ»

”قریب ہے کہ ابن مریم (علیہ السلام) انصاف پسند امام حکمران کی حیثیت سے تشریف لائیں گے، پانچوں نمازیں پڑھیں گے، جمعہ پڑھیں گے اور حلال چیزوں میں اضافہ کریں گے۔“

حدیث کے راوی ابو اشعث نے کہا: ابو ہریرہ! اللہ کی قسم! میرا خیال ہے وہ صرف عورتوں کے معاملے میں حلال چیزوں میں اضافہ کریں گے، تو انھوں (ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ) نے میری (اشعث کی) طرف دیکھا اور مسکرا دیے پھر فرمایا: تم نے یقیناً درست کہا۔ [2]

❁ کیسان رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سُنا:

«يَنْزِلُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ عِنْدَ الْمَنَارَةِ الْبَيْضَاءِ شَرْقِيَّ دِمَشْقَ»

”عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام دمشق کے مشرقی سفید منارے پر اتریں گے۔“ [3]

❁ عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ایک آدمی ان کے پاس آیا اور اس نے کہا: یہ حدیث کیا ہے جو آپ بیان کرتے ہیں؟ آپ کہتے ہیں: فلاں فلاں وقت قیامت قائم ہوگی تو انھوں نے کہا: اللہ پاک ہے، یا کہا: اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، یا اسی طرح کا کوئی

[1] صحیح ابن حبان: 286/8، حدیث: 6773، ومجمع الزوائد: 349/7، حدیث: 12543 واللفظ له. [2] مسند الشاميين: 317/1، حديث: 558. [3] المعجم الكبير للطبراني: 196/19، وتاريخ دمشق: 169,168/1.

کلمہ کہا۔ میں نے ارادہ کیا کہ میں کبھی کسی کو کوئی چیز بیان نہیں کروں گا۔ میں نے تو بس یہی کہا تھا: تم تھوڑی مدت بعد ایک امر عظیم دیکھو گے۔ بیت اللہ کو جلا دیا جائے گا، اور ایسے ہوگا، ایسے ہوگا، پھر کہا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«يَخْرُجُ الدَّجَّالُ فِي أُمَّتِي ، فَيَمْكُثُ أَرْبَعِينَ لَا أَدْرِي : أَرْبَعِينَ يَوْمًا أَوْ أَرْبَعِينَ شَهْرًا ، أَوْ أَرْبَعِينَ عَامًا ، فَيَبْعَثُ اللهُ عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ كَأَنَّهُ عُرْوَةُ ابْنُ مَسْعُودٍ ، فَيَطْلُبُهُ فَيُهْلِكُهُ ، ثُمَّ يَمْكُثُ النَّاسُ سَبْعَ سِنِينَ لَيْسَ بَيْنَ اثْنَيْنِ عَدَاوَةٌ ، ثُمَّ يُرْسِلُ اللهُ رِيحًا بَارِدَةً مِّنْ قِبَلِ الشَّامِ ، فَلَا يَبْقَى عَلَى وَجْهِ الْأَرْضِ أَحَدٌ فِي قَلْبِهِ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ مِّنْ خَيْرٍ أَوْ إِيمَانٍ إِلَّا قَبَضَتْهُ»

''دجال میری امت میں نکلے گا اور وہ چالیس تک قیام کرے گا۔ میں نہیں جانتا، چالیس دن، یا چالیس ماہ یا چالیس سال، پھر اللہ تعالیٰ عیسیٰ ابن مریم کو بھیجے گا گویا کہ وہ عروہ بن مسعود کی طرح ہوں گے۔ وہ اسے تلاش کریں گے اور اسے ہلاک کریں گے، پھر لوگ سات سال اس حال میں رہیں گے کہ کسی دو کے درمیان کوئی عداوت نہیں ہوگی، پھر اللہ شام کی طرف سے ٹھنڈی ہوا چلائے گا تو روئے زمین پر کوئی ایسا شخص باقی نہیں رہے گا جس کے دل میں ذرہ برابر خیر یا ذرہ برابر ایمان ہوگا اور (جس کے دل میں خیر یا ایمان ہوگا) یہ ہوا اس کی روح قبض کر لے گی۔''[1]

❁ مجمع بن جاریہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سُنا:

«يَقْتُلُ ابْنُ مَرْيَمَ الدَّجَّالَ بِبَابِ لُدٍّ»

[1] صحيح مسلم، الفتن، باب في خروج الدجال......، حديث: 2940.

''ابن مریم (علیہ السلام) دجال کو باب لُد پر قتل کریں گے۔''[1]

❁ عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے پاس تشریف لائے تو میں رو رہی تھی، آپ نے فرمایا:

«مَا يُبْكِيكِ؟ فَقُلْتُ: يَارَسُولَ اللهِ! ذَكَرْتُ الدَّجَّالَ قَالَ: فَلَا تَبْكِي فَإِنْ يَخْرُجْ وَأَنَا حَيٌّ أَكْفِيكُمُوهُ، وَإِنْ أَمُتْ فَإِنَّ رَبَّكُمْ لَيْسَ بِأَعْوَرَ وَإِنَّهُ يَخْرُجُ مَعَهُ يَهُودُ أَصْبَهَانَ فَيَسِيرُ حَتّٰى يَنْزِلَ بِضَاحِيَةِ الْمَدِينَةِ وَلَهَا يَوْمَئِذٍ سَبْعَةُ أَبْوَابٍ عَلٰى كُلِّ بَابٍ مَلَكَانِ، فَيَخْرُجُ إِلَيْهِ شِرَارُ أَهْلِهَا فَيَنْطَلِقُ حَتّٰى يَأْتِيَ لُدًّا، فَيَنْزِلُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ فَيَقْتُلُهُ، ثُمَّ يَمْكُثُ عِيسٰى فِي الْأَرْضِ أَرْبَعِينَ سَنَةً أَوْ قَرِيبًا مِنْ أَرْبَعِينَ سَنَةً إِمَامًا عَادِلًا، وَحَكَمًا مُقْسِطًا»

''آپ کس وجہ سے رو رہی ہیں؟''میں نے کہا:اللہ کے رسول! مجھے (فتنۂ) دجال یاد آ گیا تھا۔ آپ نے فرمایا:''آپ نہ روئیں، اگر وہ میری زندگی میں نکل آیا تو میں تم سب کی طرف سے اس سے کافی ہو جاؤں گا، اور اگر میں فوت ہو گیا تو تمھارا رب کانا نہیں، اور یقیناً وہ دجال نکلے گا تو اصبہان کے یہودی اس کے ساتھ ہوں گے۔ وہ (پوری دنیا کا) چکر لگائے گا حتی کہ مدینہ کے ایک طرف پڑاؤ ڈالے گا۔ اس وقت مدینہ کے سات دروازے ہوں گے، ہر دروازے پر دو فرشتے ہوں گے۔ وہاں کے شریر لوگ نکل کر اس کی طرف چلے جائیں گے، پھر وہ وہاں سے روانہ ہو گا حتی کہ لُد پہنچ جائے گا، تو عیسیٰ ابن مریم (علیہما السلام) کا نزول ہوگا اور وہ اسے قتل کریں گے، پھر عیسیٰ علیہ السلام چالیس سال یا تقریباً چالیس سال

[1] جامع الترمذي، الفتن، باب ماجاء في قتل...... ، حديث: 2244.

عادل امام اور منصف حاکم کی حیثیت سے زمین پر رہیں گے۔''[1]

❁ نواس بن سمعان رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں ایک روز صبح کے وقت رسول اللہ ﷺ نے دجال کا ذکر کیا تو آپ نے اس دوران میں آواز کو پست کیا اور بلند کیا، حتی کہ ہم نے سمجھا کہ شاید وہ (دجال) کھجور کے درختوں میں آ گیا ہے۔ جب شام کے وقت ہم آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے اس کے اثرات ہم پر محسوس کیے تو آپ نے فرمایا: ''تمھیں کیا ہوا؟ ہم نے عرض کیا: اللہ کے رسول! آپ نے صبح دجال کا ذکر کیا تو آپ نے اس دوران میں آواز کو پست کیا اور بلند کیا حتی کہ ہم نے سمجھا کہ وہ کھجوروں کے جھنڈ میں آ گیا ہے، آپ نے فرمایا:

«غَيْرُ الدَّجَّالِ أَخْوَفُنِي عَلَيْكُمْ إِنْ يَّخْرُجْ وَأَنَا فِيكُمْ فَأَنَا حَجِيجُهُ دُونَكُمْ وَإِنْ يَّخْرُجْ وَلَسْتُ فِيكُمْ فَامْرُؤٌ حَجِيجُ نَفْسِهِ وَاللّٰهُ خَلِيفَتِي عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ إِنَّهُ شَابٌّ قَطَطٌ عَيْنُهُ طَافِئَةٌ كَأَنِّي أُشَبِّهُهُ بِعَبْدِ الْعُزّٰى بْنِ قَطَنٍ فَمَنْ أَدْرَكَهُ مِنْكُمْ فَلْيَقْرَأْ عَلَيْهِ فَوَاتِحَ سُورَةِ الْكَهْفِ إِنَّهُ خَارِجٌ خَلَّةً بَيْنَ الشَّامِ وَالْعِرَاقِ فَعَاثٍ يَّمِينًا وَّعَاثٍ شِمَالًا، يَاعِبَادَ اللّٰهِ! فَاثْبُتُوا، قُلْنَا: يَارَسُولَ اللّٰهِ! وَمَا لَبْثُهُ فِي الْأَرْضِ؟ قَالَ: أَرْبَعُونَ يَوْمًا، يَوْمٌ كَسَنَةٍ، وَيَوْمٌ كَشَهْرٍ، وَيَوْمٌ كَجُمُعَةٍ، وَسَائِرُ أَيَّامِهِ كَأَيَّامِكُمْ قُلْنَا: يَا رَسُولَ اللّٰهِ! فَذٰلِكَ الْيَوْمُ الَّذِي كَسَنَةٍ أَتَكْفِينَا فِيهِ صَلَاةُ يَوْمٍ؟ قَالَ: لَا، اُقْدُرُوا لَهُ قَدْرَهُ، قُلْنَا: يَارَسُولَ اللّٰهِ! وَمَا إِسْرَاعُهُ فِي الْأَرْضِ؟ قَالَ: كَالْغَيْثِ

[1] المصنف لابن أبي شيبة:490/7، حديث:37463، ومسند أحمد:75/6.

اسْتَدْبَرَتْهُ الرِّيحُ فَيَأْتِي عَلَى الْقَوْمِ فَيَدْعُوهُمْ فَيُؤْمِنُونَ بِهِ وَيَسْتَجِيبُونَ لَهُ فَيَأْمُرُ السَّمَاءَ فَتُمْطِرُ وَالْأَرْضَ فَتُنْبِتُ فَتَرُوحُ عَلَيْهِمْ سَارِحَتُهُمْ أَطْوَلَ مَا كَانَتْ ذُرًى، وَأَسْبَغَهُ ضُرُوعًا، وَأَمَدَّهُ خَوَاصِرَ، ثُمَّ يَأْتِي الْقَوْمَ فَيَدْعُوهُمْ فَيَرُدُّونَ عَلَيْهِ قَوْلَهُ فَيَنْصَرِفُ عَنْهُمْ فَيُصْبِحُونَ مُمْحِلِينَ لَيْسَ بِأَيْدِيهِمْ شَيْءٌ مِّنْ أَمْوَالِهِمْ وَيَمُرُّ بِالْخَرِبَةِ فَيَقُولُ لَهَا: أَخْرِجِي كُنُوزَكِ فَتَتْبَعُهُ كُنُوزُهَا كَيَعَاسِيبِ النَّحْلِ، ثُمَّ يَدْعُو رَجُلًا مُّمْتَلِئًا شَبَابًا فَيَضْرِبُهُ بِالسَّيْفِ فَيَقْطَعُهُ جَزِلَتَيْنِ رَمْيَةَ الْغَرَضِ ثُمَّ يَدْعُوهُ فَيُقْبِلُ وَيَتَهَلَّلُ وَجْهُهُ وَيَضْحَكُ فَبَيْنَمَا هُوَ كَذٰلِكَ إِذَا بَعَثَ اللّٰهُ الْمَسِيحَ ابْنَ مَرْيَمَ فَيَنْزِلُ عِنْدَ الْمَنَارَةِ الْبَيْضَاءِ شَرْقِيَّ دِمَشْقَ بَيْنَ مَهْرُوذَتَيْنِ وَاضِعًا كَفَّيْهِ عَلٰى أَجْنِحَةِ مَلَكَيْنِ إِذَا طَأْطَأَ رَأْسَهُ قَطَرَ وَإِذَا رَفَعَهُ تَحَدَّرَ مِنْهُ جُمَانٌ كَاللُّؤْلُؤِ فَلَا يَحِلُّ لِكَافِرٍ يَجِدُ رِيحَ نَفَسِهِ إِلَّا مَاتَ وَنَفَسُهُ يَنْتَهِي حَيْثُ يَنْتَهِي طَرْفُهُ فَيَطْلُبُهُ حَتّٰى يُدْرِكَهُ بِبَابِ لُدٍّ فَيَقْتُلُهُ، ثُمَّ يَأْتِي عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ قَوْمٌ قَدْ عَصَمَهُمُ اللّٰهُ مِنْهُ فَيَمْسَحُ عَنْ وُّجُوهِهِمْ وَيُحَدِّثُهُمْ بِدَرَجَاتِهِمْ فِي الْجَنَّةِ فَبَيْنَمَا هُوَ كَذٰلِكَ إِذْ أَوْحَى اللّٰهُ إِلَى عِيْسٰى إِنِّي قَدْ أَخْرَجْتُ عِبَادًا لِّي لَا يَدَانِ لِأَحَدٍ بِقِتَالِهِمْ فَحَرِّزْ عِبَادِي إِلَى الطُّورِ وَيَبْعَثُ اللّٰهُ يَأْجُوجَ وَمَأْجُوجَ وَهُمْ مِنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُونَ فَيَمُرُّ أَوَائِلُهُمْ عَلٰى بُحَيْرَةِ طَبَرِيَّةَ فَيَشْرَبُونَ مَا فِيهَا وَيَمُرُّ آخِرُهُمْ فَيَقُولُونَ: لَقَدْ

كَانَ بِهٰذِهِ مَرَّةً مَّاءٌ، وَيُحْصَرُ نَبِيُّ اللهِ عِيسٰى وَأَصْحَابُهُ حَتّٰى يَكُونَ رَأْسُ الثَّوْرِ لِأَحَدِهِمْ خَيْرًا مِّنْ مِّائَةِ دِينَارٍ لِأَحَدِكُمُ الْيَوْمَ فَيَرْغَبُ نَبِيُّ اللهِ عِيسٰى وَأَصْحَابُهُ فَيُرْسِلُ اللهُ عَلَيْهِمُ النَّغَفَ فِي رِقَابِهِمْ فَيُصْبِحُونَ فَرْسٰى كَمَوْتِ نَفْسٍ وَّاحِدَةٍ، ثُمَّ يَهْبِطُ نَبِيُّ اللهِ عِيسٰى وَأَصْحَابُهُ إِلَى الْأَرْضِ فَلَا يَجِدُونَ فِي الْأَرْضِ مَوْضِعَ شِبْرٍ إِلَّا مَلَأَهُ زَهَمُهُمْ وَنَتْنُهُمْ فَيَرْغَبُ نَبِيُّ اللهِ عِيسٰى وَأَصْحَابُهُ إِلَى اللهِ فَيُرْسِلُ اللهُ طَيْرًا كَأَعْنَاقِ الْبُخْتِ فَتَحْمِلُهُمْ فَتَطْرَحُهُمْ حَيْثُ شَاءَ اللهُ، ثُمَّ يُرْسِلُ اللهُ مَطَرًا لَّا يَكُنُّ مِنْهُ بَيْتُ مَدَرٍ وَّلَا وَبَرٍ فَيَغْسِلُ الْأَرْضَ حَتّٰى يَتْرُكَهَا كَالزَّلَفَةِ، ثُمَّ يُقَالُ لِلْأَرْضِ: أَنْبِتِي ثَمَرَتَكِ وَرُدِّي بَرَكَتَكِ فَيَوْمَئِذٍ تَأْكُلُ الْعِصَابَةُ مِنَ الرُّمَّانَةِ وَيَسْتَظِلُّونَ بِقِحْفِهَا وَيُبَارَكُ فِي الرِّسْلِ حَتّٰى أَنَّ اللِّقْحَةَ مِنَ الْإِبِلِ لَتَكْفِي الْفِئَامَ مِنَ النَّاسِ وَاللِّقْحَةَ مِنَ الْبَقَرِ لَتَكْفِي الْقَبِيلَةَ مِنَ النَّاسِ وَاللِّقْحَةَ مِنَ الْغَنَمِ لَتَكْفِي الْفَخِذَ مِنَ النَّاسِ فَبَيْنَمَا هُمْ كَذٰلِكَ إِذْ بَعَثَ اللهُ رِيحًا طَيِّبَةً فَتَأْخُذُهُمْ تَحْتَ آبَاطِهِمْ فَتَقْبِضُ رُوحَ كُلِّ مُؤْمِنٍ وَّكُلِّ مُسْلِمٍ، وَيَبْقٰى شِرَارُ النَّاسِ يَتَهَارَجُونَ فِيهَا تَهَارُجَ الْحُمُرِ فَعَلَيْهِمْ تَقُومُ السَّاعَةُ»

’’مجھے تمھارے بارے میں دجال کے علاوہ اور چیزوں کا زیادہ اندیشہ ہے۔ اگر وہ میری موجودگی میں نکل آیا تو میں تمھیں اس سے بچاؤں گا اور اگر وہ اس حال میں نکلا کہ میں تم میں موجود نہ ہوا تو پھر ہر شخص اپنا بچاؤ کرے گا۔ ہر مسلمان کے

بارے میں اللہ میرا جانشین اورنگہبان ہے۔ وہ (دجال) ایسا نوجوان ہو گا کہ اس کے بال گھونگریالے ہوں گے۔ اس کی آنکھ ابھری ہوئی ہو گی، گویا کہ میں اسے عبدالعزیٰ بن قطن سے تشبیہ دیتا ہوں، پس تم میں سے جو شخص اسے پائے تو وہ سورۃ الکھف کا ابتدائی حصہ اس پر پڑھے۔ وہ شام اور عراق کے درمیان والی راہ سے نکلے گا اور دائیں بائیں خرابی پیدا کرے گا۔ اللہ کے بندو! ثابت قدم رہنا۔'' ہم نے عرض کیا: اللہ کے رسول! وہ زمین پر کتنی مدت رہے گا؟ آپ نے فرمایا: ''چالیس روز جن میں سے ایک دن ایک سال کے برابر، ایک دن مہینے کے برابر، ایک دن ہفتے کے برابر اور اس کے باقی ایام تمھارے ایام کی طرح ہوں گے۔'' ہم نے عرض کیا: اللہ کے رسول! وہ دن جو سال کی طرح ہو گا تو کیا اس میں ایک دن کی نمازیں ہمارے لیے کافی ہوں گی؟ آپ نے فرمایا: ''نہیں! تم اندازے کے مطابق اس کا اندازہ کر لینا۔'' ہم نے عرض کیا: اللہ کے رسول! اس کی زمین میں رفتار کیا ہو گی؟ آپ نے فرمایا: ''بارش کی طرح جسے ہوا پیچھے سے اُڑاتی ہو۔ وہ کسی قوم کے پاس آئے گا اور انھیں دعوت دے گا تو وہ اس پر ایمان لے آئیں گے، اس کی بات قبول کریں گے۔ وہ آسمان کو حکم دے گا تو وہ بارش برسائے گا، زمین کو حکم دے گا تو وہ نباتات اُگائے گی۔ ان کے مویشی چر کر ان کے پاس آئیں گے تو ان کے کوہان پہلے سے لمبے، تھن کشادہ (بھرے ہوئے) اور کوکھ نکلے ہوئے ہوں گے، پھر وہ ایک اور قوم کے پاس آئے گا اور انھیں دعوت دے گا لیکن وہ اس کی دعوت قبول نہیں کریں گے۔ وہ ان کے پاس سے جائے گا تو ان پر خشک سالی اور قحط سالی آ جائے گی، ان کے ہاتھ مال سے خالی ہو جائیں گے۔ وہ ویران جگہ سے گزرے گا تو اسے کہے گا: اپنا خزانہ نکال دو

تو اس کے خزانے اس کے پیچھے چل پڑیں گے جیسے شہد کی مکھیاں چلتی ہیں، پھر وہ ایک بھرپور نوجوان شخص کو بلائے گا اور اسے تلوار مار کر دو ٹکڑے کر دے گا جس طرح کسی کو باندھ کر نشانہ بازی کی جاتی ہے، پھر اس کو بلائے گا تو وہ اس کے سامنے اس حالت میں آئے گا کہ اس کا چہرہ دمکتا ہوگا اور وہ مسکرا رہا ہوگا۔ اسی اثنا میں اللہ تعالیٰ مسیح ابن مریم علیہ السلام کو بھیجے گا، آپ دمشق کے مشرقی سفید منارے پر اتریں گے، آپ نے زرد رنگ کا جوڑا زیب تن کیا ہوگا اور دو فرشتوں کے پروں پر اپنے دونوں ہاتھ رکھے ہوں گے۔ جب سر جھکائیں گے تو پسینہ ٹپکے گا اور جب سر اٹھائیں گے تو موتیوں کی طرح بوندیں ٹپکیں گی۔ جو کافر آپ کے سانس کی بھاپ پائے گا تو وہ اسے پاتے ہی ہلاک ہو جائے گا اور حد نظر تک وہ بھاپ جائے گی۔ آپ اس (دجال) کو تلاش کریں گے حتیٰ کہ باب لُد پر اسے پائیں گے تو اسے قتل کر دیں گے، پھر عیسیٰ علیہ السلام ایسی قوم کے پاس آئیں گے جسے اللہ نے دجال سے بچا لیا ہوگا۔ آپ ان کے چہروں پر شفقت سے ہاتھ پھیریں گے اور جنت میں ان کے درجات کے متعلق بتائیں گے۔ اسی اثنا میں اللہ عیسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی بھیجے گا کہ میں نے اپنے کچھ ایسے بندے نکالے ہیں کہ ان سے لڑنے کی کوئی طاقت نہیں رکھتا، لہٰذا آپ میرے بندوں کو طور کی طرف لے جائیں۔ اللہ یاجوج و ماجوج کو بھیجے گا اور وہ ہر اونچی جگہ سے نکل پڑیں گے۔ ان میں سے پہلے لوگ بحیرۂ طبریہ سے گزریں گے، وہاں کا سارا پانی پی لیں گے۔ جب ان کے پچھلے لوگ گزریں گے تو وہ کہیں گے کہ کبھی اس میں پانی بھی تھا۔ اللہ کے نبی عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کا محاصرہ کر لیا جائے گا حتیٰ کہ ان کے ہاں بیل کا سر سو دینار سے افضل ہوگا، پھر اللہ کے نبی عیسیٰ اور ان کے ساتھی

دعا کریں گے تو اللہ ان (یاجوج ماجوج) کی گردنوں میں کیڑے چھوڑ دے گا تو وہ صبح تک سارے اس طرح مر جائیں گے جس طرح ایک آدمی مرتا ہے۔ پھر اللہ کے نبی عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے ساتھی زمین پر اتریں گے تو وہ زمین کی بالشت برابر ایسی جگہ نہیں پائیں جہاں ان کی گلی سڑی بدبودار لاشیں نہ ہوں، پھر اللہ کے نبی عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے ساتھی اللہ کے حضور دعا کریں گے تو اللہ بختی اونٹوں[1] کی گردنوں کی طرح کے پرندے بھیجے گا جو انھیں اٹھا کر وہاں پھینک آئیں گے جہاں اللہ چاہے گا، پھر اللہ تعالیٰ ایسی بارش نازل فرمائے گا کہ کوئی گھر اور کوئی خیمہ دھلے بغیر باقی نہیں رہے گا اور زمین حوض یا باغ کی طرح صاف ہو جائے گی، پھر زمین سے کہا جائے گا: اپنے پھل اگا اور اپنی برکات لوٹا دے۔ اس روز ایک جماعت ایک انار کھائے گی تو وہ اس کے چھلکے کے سائے تلے بیٹھے گی۔ دودھ میں برکت ڈال دی جائے گی حتی کہ ایک دودھ دینے والی اونٹنی آدمیوں کے بڑے گروہ کے لیے کافی ہوگی۔ ایک دودھ دینے والی گائے ایک قبیلے کے لیے کافی ہوگی اور ایک دودھ دینے والی بکری لوگوں کے ایک خاندان کے لیے کافی ہوگی۔ وہ اس حالت میں ہوں گے کہ اللہ ایک پاکیزہ ہوا چلائے گا جو ان کی بغلوں کے نیچے لگے گی اور ہر مومن مسلمان کی روح قبض کر لے گی۔ صرف شریر لوگ باقی رہ جائیں گے اور وہ آپس میں گدھوں کی طرح بھڑیں گے، ایسے ہی لوگوں پر قیامت قائم ہوگی۔"[2]

---

[1] بختی نسل کے اونٹ خراسان سے آتے تھے۔ بخت نصر شاہ بابل نے عربی اونٹنی اور عجمی اونٹ کے ملاپ سے بچہ لے کر نسل چلائی جو اس کے نام سے منسوب ہوئی۔ [2] صحیح مسلم، الفتن، باب ذکر الدجال، حدیث: 2937.

❁ نواس بن سمعان رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سُنا: ''عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام دمشق کے مشرقی سفید منارے پر نازل ہوں گے اور دجال کو باب لُد پر پاکر اسے قتل کرڈالیں گے۔''[1]

❁ حذیفہ بن اسید غفاری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس تشریف لائے تو ہم باہم بحث کر رہے تھے۔ آپ نے فرمایا: ''تم کیا بحث کر رہے ہو؟'' انھوں نے عرض کیا: ہم قیامت کا تذکرہ کر رہے تھے۔ آپ نے فرمایا:

«إِنَّهَا لَنْ تَقُومَ حَتّٰى تَرَوْنَ قَبْلَهَا عَشْرَ آيَاتٍ فَذَكَرَ الدُّخَانَ وَالدَّجَّالَ وَالدَّابَّةَ وَطُلُوعَ الشَّمْسِ مِنْ مَّغْرِبِهَا وَنُزُولَ عِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ وَيَأْجُوجَ وَمَأْجُوجَ وَثَلَاثَةَ خُسُوفٍ خَسْفٌ بِالْمَشْرِقِ وَخَسْفٌ بِالْمَغْرِبِ وَخَسْفٌ بِجَزِيرَةِ الْعَرَبِ وَآخِرُ ذٰلِكَ نَارٌ تَخْرُجُ مِنَ الْيَمَنِ تَطْرُدُ النَّاسَ إِلٰى مَحْشَرِهِمْ»

''قیامت قائم نہیں ہو گی حتی کہ اس سے پہلے دس نشانیاں واقع نہ ہو جائیں۔ دھواں، دجال، چوپایہ، سورج کا مغرب سے طلوع ہونا، عیسیٰ ابن مریم علیہما السلام کا نزول، یاجوج ماجوج کا نکلنا، زمین کا تین مرتبہ دھنسنا، مشرق میں دھنسنا، مغرب میں دھنسنا، جزیرۂ عرب میں دھنسنا۔ آخر میں یمن سے آگ نکلے گی جو لوگوں کو ہانک کر ان کے اکٹھا ہونے کی جگہ (محشر) کی طرف لے جائے گی۔''[2]

❁ حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«أَنَا أَعْلَمُ بِمَا مَعَ الدَّجَّالِ مِنْهُ نَهْرَانِ أَحَدُهُمَا نَارٌ تَأَجَّجُ فِي

[1] صحيح مسلم، الفتن، باب ذكر الدجال، حديث: 2937، و سنن أبي داود، الملاحم، باب خروج الدجال، حديث: 4321، وصحيح ابن حبان: 288،278/8. [2] صحيح مسلم، الفتن، باب في الآيات التي تكون قبل الساعة، حديث: 2901.

عَيْنِ مَّنْ رَآهُ والْآخَرُ مَاءٌ أَبْيَضُ فَإِنْ أَدْرَكَهُ مِنْكُمْ أَحَدٌ فَلْيَغْمِضْ وَلْيَشْرَبْ مِنَ الَّذِي يَرَاهُ نَارًا فَإِنَّهُ مَاءٌ بَارِدٌ وَإِيَّاكُمْ وَالْآخَرَ فَإِنَّهُ الْفِتْنَةُ، وَاعْلَمُوا أَنَّهُ مَكْتُوبٌ بَيْنَ عَيْنَيْهِ كَافِرٌ، يَقْرَأُهُ مَنْ يَّكْتُبُ وَمَنْ لَّا يَكْتُبُ وَأَنَّ إِحْدٰى عَيْنَيْهِ مَمْسُوحَةٌ عَلَيْهَا ظُفْرَةٌ أَنَّهُ يَطْلُعُ مِنْ آخِرِ أَمْرِهِ عَلٰى بَطْنِ الْأُرْدَنِ عَلٰى بَيْتِهِ أَفِيقٍ، وَكُلُّ وَاحِدٍ يُّؤْمِنُ بِاللهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ بِبَطْنِ الْأُرْدَنِ وَأَنَّهُ يَقْتُلُ مِنَ الْمُسْلِمِينَ ثَلَاثًا وَّيَهْزِمُ ثَلَاثًا وَّيَبْقٰى ثَلَاثًا وَّيَجِنُّ عَلَيْهِمُ اللَّيْلُ فَيَقُولُ بَعْضُ الْمُؤْمِنِينَ لِبَعْضٍ: مَا تَنْتَظِرُونَ أَنْ تَلْحَقُوا بِإِخْوَانِكُمْ فِي مَرْضَاةِ رَبِّكُمْ مَنْ كَانَ عِنْدَهُ فَضْلُ طَعَامٍ فَلْيَغْدِ بِهِ عَلٰى أَخِيهِ وَصَلُّوا حِينَ يَنْفَجِرُ الْفَجْرُ وَعَجِّلُوا الصَّلَاةَ ثُمَّ أَقْبِلُوا عَلٰى عَدُوِّكُمْ فَلَمَّا قَامُوا يُصَلُّونَ، نَزَلَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ صَلَوَاتُ اللهِ عَلَيْهِ إِمَامَهُمْ فَصَلّٰى بِهِمْ فَلَمَّا انْصَرَفَ قَالَ هٰكَذَا أَفْرِجُوا بَيْنِي وَبَيْنَ عَدُوِّ اللهِ . . . وَسَلَّطَ اللهُ عَلَيْهِمُ الْمُسْلِمِينَ فَيَقْتُلُونَهُمْ حَتّٰى أَنَّ الشَّجَرَ وَالْحَجَرَ لَيُنَادِي يَاعَبْدَاللهِ! يَاعَبْدَالرَّحْمٰنِ! يَامُسْلِمُ! هٰذَا يَهُودِيٌّ فَاقْتُلْهُ فَيَنْفِيهِمُ اللهُ وَيَظْهَرُ الْمُسْلِمُونَ فَيَكْسِرُونَ الصَّلِيبَ وَيَقْتُلُونَ الْخِنْزِيرَ وَيَضَعُونَ الْجِزْيَةَ فَبَيْنَمَا هُمْ كَذٰلِكَ أَخْرَجَ اللهُ أَهْلَ يَأْجُوجَ وَمَأْجُوجَ فَيَشْرَبُ أَوَّلُهُمُ الْبُحَيْرَةَ وَيَجِيءُ آخِرُهُمْ وَقَدِ اسْتَقَوْهُ فَمَا يَدَعُونَ فِيهِ قَطْرَةً فَيَقُولُونَ ظَهَرْنَا عَلٰى أَعْدَائِنَا قَدْ كَانَ هٰهُنَا أَثَرُ مَاءٍ فَيَجِيءُ نَبِيُّ اللهِ

وَأَصْحَابُهُ وَرَاءَهُ حَتّٰى يَدْخُلُوا مَدِينَةً مِّنْ مَدَائِنِ فِلَسْطِينَ يُقَالُ لَهَا: لُدٌّ، فَيَقُولُونَ: ظَهَرْنَا عَلٰى مَنْ فِي الْأَرْضِ فَتَعَالَوْا نُقَاتِلْ مَنْ فِي السَّمَاءِ فَيَدْعُو اللهَ نَبِيُّهُ عِنْدَ ذٰلِكَ فَيَبْعَثُ اللهُ عَلَيْهِمْ قَرْحَةً فِي حُلُوقِهِمْ فَلَا يَبْقٰى مِنْهُمْ بَشَرٌ فَتُؤْذِي رِيحُهُمُ الْمُسْلِمِينَ فَيَدْعُو عِيسٰى عَلَيْهِمْ فَيُرْسِلُ اللهُ عَلَيْهِمْ رِيحًا فَتَقْذِفُهُمْ فِي الْبَحْرِ أَجْمَعِينَ»

''میں جانتا ہوں کہ دجال کے ہمراہ کیا ہوگا۔اس کے ساتھ دو نہریں ہوں گی۔ان میں سے ایک دیکھنے والے کو شعلوں والی آگ کی طرح گرم دکھائی دے گی جبکہ دوسری سفید پانی والی ہوگی۔اگر تم میں سے کوئی اس (دجال) کو پالے تو وہ اس نہر سے آنکھیں بند کر کے پانی پی لے جس کو وہ آگ سمجھتا ہو کیونکہ وہ ٹھنڈا پانی ہے جبکہ دوسری (نہر) فتنہ ہے۔جان لو کہ اس کی دونوں آنکھوں کے درمیان کافر لکھا ہوا ہوگا اور ہر پڑھا لکھا اور ان پڑھ اسے پڑھ لے گا اور اس کی ایک آنکھ نہیں ہوگی۔ اس پر ناخنہ ہوگا (ایک بیماری جس میں آنکھ پر ناک کی طرح جھلی آجاتی ہے)وہ آخری مرتبہ اردن کے درمیانی حصے میں پہنچے گا جس کا نام افیق ہے۔اردن کے درمیانی حصے کا ہر شخص جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہوگا (وہ جہاد کرے گا اور وہ ایک تہائی حصے کو شہید کر دے گا، تہائی حصہ بھاگ جائے گا اور تہائی حصہ ثابت قدم رہے گا۔ان پر رات چھا جائے گی تو بعض مومن آپس میں کہیں گے: تم اپنے رب کی رضا میں اپنے بھائیوں سے ملنے میں کس چیز کا انتظار کر رہے ہو، لہٰذا جس شخص کے پاس زائد کھانا ہو تو وہ اپنے بھائی کو دے دے اور صبح ہوتے ہی جلد نماز پڑھو، پھر اپنے دشمن پر توجہ کرو۔ جب وہ نماز کے لیے کھڑے ہوں گے تو عیسیٰ

ابن مریم ان کے سامنے اتریں گے تو وہ انھیں نماز پڑھائیں گے۔ جب نماز سے فارغ ہوں گے تو فرمائیں گے: اسی طرح میرے اور اللہ کے دشمن کے درمیان کشادگی لاؤ۔...... اور اللہ مسلمانوں کو ان پر مسلط کر دے گا، پس وہ انھیں قتل کریں گے حتی کہ شجر و حجر آواز دیں گے: اللہ کے بندے! رحمٰن کے بندے! اے مسلمان! یہ یہودی ہے اسے قتل کرو، چنانچہ اللہ انھیں ختم کر دے گا۔ مسلمان غالب آجائیں گے۔ وہ صلیب توڑیں گے، خنزیر کو قتل کریں گے اور جزیہ ختم کریں گے۔ وہ اسی حال میں ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ یاجوج ماجوج کو نکالے گا۔ ان کا پہلا گروہ پورا بحیرہ (طبریہ) پی جائے گا۔ جب پچھلا گروہ آئے گا تو وہ پانی طلب کریں گے لیکن انھوں نے قطرہ تک نہ چھوڑا ہو گا تو وہ کہیں گے: ہم اپنے دشمنوں پر غالب آگئے۔ یہاں پانی کا نشان تھا۔ اللہ کے نبی عیسیٰ علیہ السلام آئیں گے اور آپ کے ساتھی آپ کے پیچھے ہوں گے حتی کہ وہ (یاجوج ماجوج) فلسطین کے کسی شہر میں داخل ہو جائیں گے، جسے لد کہا جاتا ہے، تو وہ کہیں گے: ہم اہل زمین پر غالب آگئے، آؤ ہم آسمان والوں سے لڑیں اللہ کے نبی اس وقت اللہ سے دعا کریں گے تو اللہ تعالیٰ ان کی گردنوں پر پھوڑا نکالے گا تو ان میں سے کوئی بشر باقی نہیں رہے گا۔ ان کی بدبو دار ہوا مسلمانوں کو اذیت پہنچائے گی۔ عیسیٰ علیہ السلام ان کے لیے بددعا کریں گے تو اللہ تعالیٰ ان پر ہوا چلائے گا جو ان سب کو سمندر میں پھینک دے گی۔''[1]

❁ حذیفہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«يَخْرُجُ الدَّجَّالُ عَدُوُّ اللهِ مَعَهُ جُنُودٌ مِّنَ الْيَهُودِ وَأَصْنَافُ النَّاسِ مَعَهُ جَنَّةٌ وَّنَارٌ، وَّرِجَالٌ يَّقْتُلُهُمْ ثُمَّ يُحْيِيهِمْ مَعَهُ جَبَلٌ

① المستدرك للحاكم: 491/4، حديث: 8507.

مِنْ ثَرِيدٍ وَّنَهْرٌ مِنْ مَاءٍ، وَإِنِّي سَأَنْعَتُ لَكُمْ نَعْتًا أَنَّهُ يَخْرُجُ مَمْسُوحُ الْعَيْنِ فِي جَبْهَتِهِ مَكْتُوبٌ كَافِرٌ يَّقْرَأُ كُلُّ مَنْ يُحْسِنُ الْكِتَابَ وَمَنْ لَّا يُحْسِنُ فَجَنَّتُهُ نَارٌ وَّنَارُهُ جَنَّةٌ، وَهُوَ الْمَسِيحُ الْكَذَّابُ يَتَّبِعُهُ مِنْ نِّسَاءِ الْيَهُودِ ثَلَاثَ عَشَرَ أَلْفَ امْرَأَةٍ فَرَحِمَهُ اللّٰهُ رَجُلًا مَّنَعَ سَفِيهَتَهُ أَنْ تَتَّبِعَهُ وَالْقُوَّةُ عَلَيْهِ يَوْمَئِذٍ بِالْقُرْآنِ فَإِنَّ شَأْنَهُ بَلَاءٌ شَدِيدٌ يَّبْعَثُ اللّٰهُ شَيَاطِينَ مَشَارِقَ الْأَرْضِ وَمَغَارِبِهَا فَيَقُولُونَ لَهُ: اسْتَعِنْ بِنَا عَلٰى مَا شِئْتَ فَيَقُولُ لَهُمْ: انْطَلِقُوا فَأَخْبِرُوا النَّاسَ أَنِّي رَبُّهُمْ وَأَنِّي قَدْ جِئْتُهُمْ بِجَنَّتِي وَنَارِي فَتَنْطَلِقُ الشَّيَاطِينُ فَيَدْخُلُ عَلَى الرَّجُلِ أَكْثَرُ مِنْ مِّائَةِ شَيَاطِينَ فَيَتَمَثَّلُونَ لَهُ بِصُورَةِ وَالِدِهِ وَوَلَدِهِ وَإِخْوَتِهِ وَمَوَالِيهِ وَرَفِيقِهِ فَيَقُولُونَ: يَافُلَانُ! أَتَعْرِفُنَا؟ فَيَقُولُ لَهُمُ الرَّجُلُ: نَعَمْ، هٰذَا أَبِي وَهٰذِهِ أُمِّي وَهٰذِهِ أُخْتِي وَهٰذَا أَخِي وَيَقُولُ الرَّجُلُ: مَا نَبَّئُكُمْ؟ فَيَقُولُونَ: بَلْ أَنْتَ بَلْ أَنْتَ فَأَخْبِرْنَا مَا نَبَأُكَ يَقُولُ الرَّجُلُ: إِنَّا قَدْ أُخْبِرْنَا أَنَّ عَدُوَّ اللّٰهِ الدَّجَّالَ قَدْ خَرَجَ فَيَقُولُ لَهُ الشَّيَاطِينُ: مَهْلًا! لَا تَقُلْ هٰذَا، فَإِنَّهُ رَبُّكُمْ يُرِيدُ الْقَضَاءَ فِيكُمْ هٰذِهِ جَنَّتُهُ قَدْ جَاءَ بِهَا وَنَارُهُ وَمَعَهُ الْأَنْهَارُ وَالطَّعَامُ فَلَا طَعَامٌ إِلَّا مَا كَانَ فِيهِ قَبْلَهُ إِلَّا مَاشَاءَ اللّٰهُ فَيَقُولُ الرَّجُلُ: كَذَبْتُمْ مَا أَنْتُمْ إِلَّا شَيَاطِينُ وَهُوَ الْكَذَّابُ قَدْ بَلَغَنَا أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ قَدْ حَدَّثَ حَدِيثَكُمْ وَحَذَّرَنَا وَأَنْبَأَنَا بِهِ فَلَا مَرْحَبًا بِكُمْ أَنْتُمُ الشَّيَاطِينُ وَهُوَ عَدُوٌّ

اللهِ وَلَيَسُوقَنَّ اللهُ عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ حَتّٰى يَقْتُلَهُ فَيُخْسَؤُا فَيَنْقَلِبُوا خَائِبِينَ، ثُمَّ قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: إِنَّمَا أُحَدِّثُكُمْ هٰذَا لِتَعْقِلُوهُ وَتَفَقَّهُوهُ وَتَعُوهُ وَاعْمَلُوا عَلَيْهِ وَحَدِّثُوا بِهِ مَنْ خَلْفَكُمْ فَلْيُحَدِّثَنَّ الْآخَرُ الْآخَرَ فَإِنَّ فِتْنَتَهُ أَشَدُّ الْفِتَنِ»

''اللہ کا دشمن دجال یہودیوں کے لشکر اور مختلف لوگوں کے ساتھ نکلے گا۔ اس کے ساتھ جنت اور آگ ہوگی۔ وہ آدمیوں کو قتل کرے گا، پھر انھیں زندہ کرے گا۔ اس کے ساتھ ثرید (شوربے میں روٹیاں بھگو کر تیار کیے ہوئے کھانے) کا پہاڑ ہوگا اور پانی کی نہر ہوگی۔ میں ابھی تمھیں اس کا تعارف کراتا ہوں کہ وہ نکلے گا تو اس کی ایک آنکھ نہیں ہوگی۔ اس کی پیشانی پر کافر لکھا ہوگا۔ ہر پڑھا لکھا اور ان پڑھ اسے پڑھ لے گا۔ اس کی جنت آگ ہوگی اور اس کی آگ جنت ہوگی۔ وہ مسیح کذاب ہوگا۔ تیرہ ہزار یہودی عورتیں اس کی پیروی کریں گی۔ اللہ اس شخص پر رحم فرمائے جس نے اپنی اہلیہ کو اس کی اتباع سے روکا۔ اس روز قرآن کی قوت سے اس پر قابو پایا جاسکتا ہے۔ اس کی حالت یہ ہے کہ وہ ایک بہت سخت آزمائش ہے۔ اللہ زمین کے مشارق و مغارب کے شیاطین بھیجے گا تو وہ اسے کہیں گے: جس کے خلاف چاہو ہم سے مدد طلب کرو تو وہ انھیں کہے گا: پس تم جاؤ اور لوگوں سے کہو کہ میں ان کا رب ہوں اور میں ان کے پاس اپنی جنت اور جہنم لے کر آیا ہوں، پس شیاطین روانہ ہو جائیں گے تو ایک آدمی کے پاس سو سے زیادہ شیاطین جائیں گے۔ وہ اس کے سامنے اس کے والد، اس کے بیٹے، اس کے بھائیوں، اس کے غلاموں اور اس کے ساتھیوں کی صورت میں پیش ہوں گے۔ وہ کہیں گے: اے فلاں! کیا تم ہمیں پہچانتے ہو؟ وہ انھیں کہے گا: ہاں یہ میرے والد ہیں،

یہ میری والدہ ہیں، یہ میری بہن اور یہ میرے بھائی ہیں، وہ آدمی پوچھے گا: تمھاری کیا خبر ہے؟ تو وہ کہیں گے، بلکہ تیری کیا خبر ہے، بلکہ تیری کیا خبر ہے؟ پس تم ہمیں بتاؤ تمھاری کیا خبر ہے؟ وہ آدمی کہے گا: ہمیں بتایا گیا ہے کہ اللہ کا دشمن دجال نکل چکا ہے، تو شیاطین اسے کہیں گے: ٹھہرو، یہ نہ کہو کیونکہ وہ تو تمھارا رب ہے۔ وہ تمھارے درمیان فیصلہ کرنا چاہتا ہے۔ یہ اس کی جنت ہے جسے وہ ساتھ لے کر آیا ہے اور یہ اس کی جہنم ہے۔ اور اس کے ساتھ نہریں ہیں، خوراک ہے، پس کھانا وہی ہے جو کسی نے پہلے سے جمع کیا ہوا ہے مگر یہ کہ جو اللہ چاہے تو وہ آدمی کہے گا: تم جھوٹ کہہ رہے ہو، تم تو محض شیاطین ہو اور وہ کذاب ہے۔ ہمیں یہ بات پہنچ چکی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے تمھارے حالات بتائے اور ہمیں اس سے ڈرایا اور انھوں نے اس کے متعلق بھی ہمیں بتایا۔ پس تمھارے لیے کوئی خوش آمدید نہیں۔ تم شیاطین ہو اور وہ اللہ کا دشمن ہے۔ اللہ تعالیٰ عیسیٰ علیہ السلام کو ضرور بھیجے گا حتی کہ وہ اسے قتل کریں گے، پس وہ ناکام ہوجائیں گے اور ناکام و نامراد واپس لوٹیں گے، پھر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میں یہ تمھیں اس لیے بیان کر رہا ہوں کہ تم اسے یاد کرو، اسے سمجھو، اسے محفوظ رکھو، اس پر عمل کرو اور اپنے بعد میں آنے والوں کو اسے بیان کرو، پس ہر ایک دوسرے کو یہ حدیث ضرور بیان کرے کیونکہ اس کا فتنہ سب سے شدید فتنہ ہے۔''[1]

❁ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نبی ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا:

«يَكُونُ بَيْنَ الْمُسْلِمِينَ وَبَيْنَ الرُّومِ هُدْنَةٌ- فِي حَدِيثٍ طَوِيلٍ وَفِي آخِرِهِ- وَيَفْتَحُ اللهُ الْقُسْطَنْطُنْيَةَ عَلَى يَدِ أَقْوَامٍ هُمْ أَوْلِيَاءُ

[1] الفتن للمروزي، ص: 369,368.

اللهِ يَرْفَعُ اللهُ عَنْهُمُ الْمَوْتَ وَالْمَرَضَ وَالسُّقْمَ حَتّٰى يَنْزِلَ عَلَيْهِمْ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ فَيُقَاتِلُونَ مَعَهُ الدَّجَّالَ»

''مسلمانوں اور رومیوں کے مابین مصالحت کا معاہدہ ہوگا یہ ایک طویل حدیث ہے۔ اس کے آخر میں ہے۔ اللہ ایسے لوگوں کے ہاتھوں قسطنطنیہ کو فتح کرے گا جو اللہ کے دوست ہوں گے۔ اللہ ان سے موت، مرض اور تکلیف کو اٹھالے گا حتی کہ عیسیٰ ابن مریم نازل ہوں گے تو وہ ان (عیسیٰ علیہ السلام) کے ساتھ مل کر دجال سے قتال کریں گے۔''[1]

❁ ثعلبہ بن عباد سے روایت ہے کہ وہ ایک روز سمرہ رضی اللہ عنہ کے خطبہ میں حاضر تھے تو انھوں نے خطبہ کے آخر پر کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«لَا تَقُومُ السَّاعَةُ حَتّٰى يَخْرُجَ ثَلَاثُونَ كَذَّابًا اٰخِرُهُمُ الْأَعْوَرُ الدَّجَّالُ مَمْسُوحُ الْعَيْنِ الْيُسْرٰى كَأَنَّهَا عَيْنُ أَبِي يَحْيٰى لِشَيْخٍ مِّنَ الْأَنْصَارِ وَأَنَّهُ مَتٰى خَرَجَ فَإِنَّهُ يَزْعُمُ أَنَّهُ اللهُ فَمَنْ اٰمَنَ بِهِ وَصَدَّقَهُ وَاتَّبَعَهُ فَلَيْسَ يَنْفَعُهُ صَالِحٌ مِّنْ عَمَلٍ سَلَفَ وَّمَنْ كَفَرَ بِهِ وَكَذَّبَهُ فَلَيْسَ يُعَاقَبُ بِشَيْءٍ مِنْ عَمَلِهِ سَلَفَ وَأَنَّهُ سَيَظْهَرُ عَلَى الْأَرْضِ كُلِّهَا إِلَّا الْحَرَمَ وَبَيْتَ الْمَقْدِسِ وَأَنَّهُ يَحْصُرُ الْمُؤْمِنِينَ فِي بَيْتِ الْمَقْدِسِ فَيَتَزَلْزَلُونَ زِلْزَالًا شَدِيدًا فَيُصْبِحُ فِيهِمْ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ فَيَهْزِمُهُ اللهُ وَجُنُودَهُ حَتّٰى إِنَّ أَجْرَمَ الْحَائِطِ وَأَصْلَ الشَّجَرِ لَيُنَادِي يَا بِالْمُؤْمِنِ هٰذَا كَافِرٌ يَّسْتَتِرُ بِي فَتَعَالَ أُقْتُلْهُ»

[1] الفتن للمروزي، ص: 296-299.

''قیامت قائم نہیں ہوگی حتی کہ تیس کذاب نکلیں گے۔ سب سے آخر میں کانا دجال آئے گا۔ اس کی بائیں آنکھ مسخ شدہ ہوگی گویا کہ وہ انصار کے بزرگ آدمی ابو یحییٰ کی آنکھ کی طرح ہوگی اور جب وہ نکلے گا تو وہ زعم رکھے گا کہ وہ اللہ ہے۔ جو شخص اس پر ایمان لائے، اس کی تصدیق کرے اوراس کی اتباع کرے تو اس کے سابقہ صالح اعمال اس کے کچھ بھی کام نہیں آئیں گے اور جس نے اس کا انکار کیا اوراس کی تکذیب کی تو اس کے سابقہ اعمال پر اسے سزا نہیں دی جائے گی۔ دجال حرم اور بیت المقدس کے علاوہ پوری سر زمین پر غالب آجائے گا اور وہ مومنوں کو بیت المقدس میں محصور کرے گا تو وہ سخت مصیبت سے دوچار ہوں گے اور ہلائے جائیں گے تو ایک روز صبح کے وقت عیسیٰ ابن مریم ان میں تشریف لائیں گے تو اللہ اس دجال اوراس کے لشکر کو شکست سے دوچار کردے گا حتی کہ ہر دیوار کی بنیاد اور درخت کا تنا آواز دے گا: اے مومن! یہ کافر میرے پیچھے چھپا ہوا ہے، لہٰذا آؤ اور اسے قتل کرو۔''[1]

❁ جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا:

«لَا تَزَالُ طَائِفَةٌ مِّنْ أُمَّتِي يُقَاتِلُونَ عَلَى الْحَقِّ ظَاهِرِينَ إِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ قَالَ: فَيَنْزِلُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ فَيَقُولُ أَمِيرُهُمْ: تَعَالَ صَلِّ لَنَا، فَيَقُولُ: لَا إِنَّ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ أُمَرَاءُ تَكْرِمَةَ اللهِ هٰذِهِ الْأُمَّةَ»

''میری امت کا ایک گروہ حق کی خاطر لڑتا رہے گا، وہ قیامت تک غالب رہیں گے۔ فرمایا: ''عیسیٰ علیہ السلام نازل ہوں گے تو ان کا امیر انھیں کہے گا: تشریف لائیں

[1] المستدرك للحاكم: 331,330/1، حديث: 1230.

اور ہمیں نماز پڑھائیں تو وہ فرمائیں گے: نہیں، بے شک تم میں سے بعض، بعض پر امیر ہیں، اللہ نے اس امت کو عزت بخشی ہے۔''[1]

مدینہ منورہ میں ابن صائد نامی ایک یہودی بچہ تھا جس میں دجال کی بعض علامتیں پائی جاتی تھیں۔ نبی اکرم ﷺ کو خدشہ تھا کہ کہیں یہی دجال نہ ہو تو آپ اپنے خدشے کی تصدیق کے لیے متعدد دفعہ اس کے گھر تشریف لے گئے اور آپ کے ساتھ دیگر صحابہ بھی تھے۔ اس موقع پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آپ سے اجازت طلب کی کہ میں اسے قتل کر دوں تو حضرت جابر رضی اللہ عنہ ایک لمبی حدیث میں ان تمام واقعات کی تفصیل بیان فرماتے ہوئے کہتے ہیں کہ جواب میں نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

«إِنْ يَّكُنْ هُوَ فَلَسْتَ صَاحِبَهُ، إِنَّمَا صَاحِبُهُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ عَلَيْهِ الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ، وَإِنْ لَّا يَكُنْ هُوَ فَلَيْسَ لَكَ أَنْ تَقْتُلَ رَجُلًا مِّنْ أَهْلِ الْعَهْدِ»

''اگر یہ وہی دجال ہے تو پھر آپ اسے قتل کرنے والے نہیں، اس کام کے لیے عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام مامور ہیں اور اگر یہ وہ نہیں تو پھر آپ کو کسی ذمی شخص کو قتل کرنے کا حق حاصل نہیں۔''[2]

❁ جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«يَخْرُجُ الدَّجَّالُ فِي خَفْقَةٍ مِّنَ الدِّينِ وَإِدْبَارٍ مِّنَ الْعِلْمِ فَلَهُ أَرْبَعُونَ لَيْلَةً يَّسِيحُهَا فِي الْأَرْضِ، اَلْيَوْمُ مِنْهَا كَالسَّنَةِ وَالْيَوْمُ مِنْهَا كَالشَّهْرِ وَالْيَوْمُ مِنْهَا كَالْجُمُعَةِ ثُمَّ سَائِرُ أَيَّامِهِ كَأَيَّامِكُمْ

[1] صحيح مسلم، الإيمان، باب نزول عيسى ابن مريم عليهما السلام......، حديث: 156. [2] مسند أحمد: 368/3.

هٰذِهِ وَلَهُ حِمَارٌ يَرْكَبُهُ عَرْضَ مَا بَيْنَ أُذُنَيْهِ أَرْبَعُونَ ذِرَاعًا فَيَقُولُ لِلنَّاسِ: أَنَا رَبُّكُمْ وَهُوَ أَعْوَرُ وَإِنَّ رَبَّكُمْ لَيْسَ بِأَعْوَرَ مَكْتُوبٌ بَيْنَ عَيْنَيْهِ كَافِرٌ، ك، ف، ر مُهَجَّاةٌ، يَقْرَؤُهُ كُلُّ مُؤْمِنٍ كَاتِبٌ وَّغَيْرُ كَاتِبٍ يَرِدُ كُلَّ مَاءٍ وَّمَنْهَلٍ إِلَّا الْمَدِينَةَ وَمَكَّةَ حَرَّمَهُمَا اللهُ عَلَيْهِ وَقَامَتِ الْمَلَائِكَةُ بِأَبْوَابِهَا وَمَعَهُ جِبَالٌ مِّنْ خُبْزٍ وَّالنَّاسُ فِي جَهْدٍ إِلَّا مَنْ تَبِعَهُ وَمَعَهُ نَهْرَانِ أَنَا أَعْلَمُ بِهِمَا مِنْهُ، نَهْرٌ يَّقُولُ: الْجَنَّةُ وَنَهْرٌ يَّقُولُ: النَّارُ، فَمَنْ أُدْخِلَ الَّذِي يُسَمِّيهِ الْجَنَّةَ فَهُوَ النَّارُ وَمَنْ أُدْخِلَ الَّذِي يُسَمِّيهِ النَّارَ فَهُوَ الْجَنَّةُ. قَالَ: وَيَبْعَثُ اللهُ مَعَهُ شَيَاطِينَ تُكَلِّمُ النَّاسَ وَمَعَهُ فِتْنَةٌ عَظِيمَةٌ يَّأْمُرُ السَّمَاءَ فَتُمْطِرُ فِيمَا يَرَى النَّاسُ وَيَقْتُلُ نَفْسًا ثُمَّ يُحْيِيهَا فِيمَا يَرَى النَّاسُ "لَا يُسَلَّطُ عَلٰى غَيْرِهَا مِنَ النَّاسِ" وَيَقُولُ: أَيُّهَا النَّاسُ! هَلْ يَفْعَلُ مِثْلَ هٰذَا إِلَّا الرَّبُّ عَزَّوَجَلَّ؟ قَالَ: فَيَفِرُّ الْمُسْلِمُونَ إِلَى جَبَلِ الدُّخَانِ بِالشَّامِ فَيَأْتِيهِمْ فَيُحَاصِرُهُمْ فَيَشْتَدُّ حِصَارُهُمْ وَيُجْهِدُهُمْ جَهْدًا شَدِيدًا ثُمَّ يَنْزِلُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ فَيُنَادِي مِنَ السَّحَرِ فَيَقُولُ: يَاأَيُّهَا النَّاسُ! مَا يَمْنَعُكُمْ أَنْ تَخْرُجُوا إِلَى الْكَذَّابِ الْخَبِيثِ؟ فَيَقُولُونَ: هٰذَا رَجُلٌ جِنِّيٌّ فَيَنْطَلِقُونَ فَإِذَا هُمْ بِعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ فَتُقَامُ الصَّلَاةُ فَيُقَالُ لَهُ: تَقَدَّمْ يَارُوحَ اللهِ! فَيَقُولُ: لِيَتَقَدَّمْ إِمَامُكُمْ فَلْيُصَلِّ بِكُمْ فَإِذَا صَلّٰى صَلَاةَ الصُّبْحِ خَرَجُوا إِلَيْهِ قَالَ: فَحِينَ يَرَى الْكَذَّابُ يَنْمَاثُ

كَمَا يَنْمَاثُ الْمِلْحُ فِي الْمَاءِ فَيَمْشِي إِلَيْهِ فَيَقْتُلُهُ حَتّٰى أَنَّ الشَّجَرَةَ وَالْحَجَرَ يُنَادِي يَارُوحَ اللهِ! هٰذَا يَهُودِيٌّ فَلَا يَتْرُكُ مِمَّنْ كَانَ يَتْبَعُهُ أَحَدًا إِلَّا قَتَلَهُ»

''دجال اس حال میں ظاہر ہوگا کہ دین کمزور ہوگا اورعلم بھی گیا گزرا ہوگا۔ اسے چالیس راتوں کی مہلت ملے گی، اس مہلت و مدت کا پہلا دن سال کی طرح، دوسرا دن مہینے کی طرح، تیسرا دن ہفتے کی طرح ہوگا اور پھر باقی ایام تمھارے ان ایام کی طرح ہوں گے۔ اس کا ایک گدھا ہوگا جس پر وہ سواری کرے گا۔ اس کے دو کانوں کے مابین چالیس ہاتھ کا فاصلہ ہوگا۔ وہ لوگوں سے کہے گا: میں تمھارا رب ہوں جبکہ وہ کانا ہوگا۔ اور تمھارا رب کانا نہیں۔ اس دجال کی آنکھوں کے مابین کافر لکھا ہوگا اور اس کے الگ الگ ک،ف، ر ہجے لکھے ہوں گے۔ ہر پڑھا لکھا اور اَن پڑھ مومن اسے پڑھ لے گا اور وہ مکہ و مدینہ کے سوا ہر پانی اور گھاٹ پر آئے گا۔ اللہ نے مکہ اور مدینہ اس پر حرام قرار دے دیا ہے اور ان دونوں شہروں کے دروازوں پر فرشتے کھڑے ہوں گے۔ اس کے ساتھ روٹیوں کا پہاڑ ہوگا۔ اس کے پیروکاروں کے سوا باقی لوگ مشقت اور تکلیف میں ہوں گے۔ اس کے ساتھ دو نہریں ہوں گی، ان نہروں کے بارے میں اس کی نسبت میں زیادہ جانتا ہوں۔ وہ ایک نہر کے بارے میں کہے گا کہ یہ جنت ہے اور ایک کے بارے میں کہے گا کہ یہ آگ ہے، پس جو شخص اس نہر میں داخل کیا گیا جسے وہ جنت کہتا ہوگا وہ حقیقت میں آگ ہوگی اور جو اس نہر میں داخل کیا گیا جس کو وہ آگ کہتا ہوگا تو وہ حقیقت میں جنت ہوگی، فرمایا: اللہ شیاطین کو بھیجے گا وہ لوگوں سے باتیں کریں گے۔ اس کے ساتھ ایک بڑا فتنہ یہ ہوگا کہ وہ آسمان کو حکم دے گا

تو وہ لوگوں کی ظاہری نظر کے حساب سے بارش برسائے گا۔ وہ کسی نفس کو قتل کرے گا، پھر اسے زندہ کرے گا، اور یہ بھی ظاہری نظروں میں ہوگا(اس کے علاوہ وہ لوگوں پر مسلط نہیں کیا جائے گا۔)وہ لوگوں سے کہے گا: لوگو! کیا رب کے سوا کوئی اوراس طرح کے کام کرسکتا ہے۔فرمایا: مسلمان شام میں جبل دخان کی طرف بھاگ جائیں گے۔ دجال بھی ان کے پاس پہنچ جائے گا اوران کا سخت قسم کا محاصرہ کرے گا۔ وہ ان پر بہت سختی کرے گا، پھر عیسیٰ علیہ السلام نازل ہوں گے تو وہ سحری کے وقت آواز دے کر کہیں گے: لوگو! کذاب خبیث دجال کی طرف نکلنے میں تمھیں کون سی چیز مانع ہے؟ تو وہ مسلمان کہیں گے: یہ تو کوئی جن ہے۔لوگ (آواز کی طرف) چلیں گے تو وہاں عیسیٰ علیہ السلام ہوں گے۔نماز کے لیے اقامت کہی جائے گی اور ان سے عرض کی جائے گی: روح اللہ! آگے تشریف لائیں، تو وہ فرمائیں گے: تمھارا امام ہی آگے آئے اور تمھیں نماز پڑھائے، پس جب وہ نماز صبح پڑھ لیں گے تو وہ اس دجال کی طرف روانہ ہوں گے۔فرمایا: جب وہ کذاب عیسیٰ علیہ السلام کو دیکھے گا تو وہ اس طرح گھل جائے گا جس طرح نمک پانی میں گھل جاتا ہے، پس وہ اس کی طرف جائیں گے اور اسے قتل کریں گے، حتی کہ شجر و حجر آواز دیں گے: روح اللہ! یہ یہودی ہے، پس وہ اس کے تمام پیروکاروں کو قتل کردیں گے کسی ایک کو بھی نہیں چھوڑیں گے۔"[1]

❁ ابن عباس رضی اللہ عنہما اللہ تعالیٰ کے فرمان:

﴿ وَإِنَّهُ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ فَلَا تَمْتَرُنَّ بِهَا ﴾

"بے شک وہ قیامت کی ایک علامت ہیں، پس تم اس کے بارے میں شک نہ کرو۔"[2]

① مسند أحمد: 3/368,367. ② الزخرف 61:43.

کے بارے میں نبی ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا:

«نُزُولُ عِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ مِنْ قَبْلِ يَوْمِ الْقِيَامَةِ»

''(اس علامت سے مراد) قیامت سے پہلے عیسیٰ علیہ السلام کا نزول ہے۔''[1]

❀ رسول اللہ ﷺ کے آزاد کردہ غلام ثوبان رضی اللہ عنہ نبی ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا:

«عِصَابَتَانِ مِنْ أُمَّتِي أَحْرَزَهُمُ اللهُ مِنَ النَّارِ، عِصَابَةٌ تَغْزُو الْهِنْدَ، وَعِصَابَةٌ تَكُونُ مَعَ عِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ عَلَيْهِ السَّلَامُ»

''میری امت کی دو جماعتیں ہیں جنھیں اللہ نے آگ سے بچا لیا ہے۔ ایک جماعت وہ ہے جو ہندوستان سے جہاد کرے گی اور دوسری جماعت وہ ہے جو عیسیٰ ابن مریم علیہما السلام کے ساتھ ہوگی۔''[2]

❀ عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«مَا أَهْبَطَ اللهُ إِلَى الْأَرْضِ مُنْذُ خَلَقَ (اللهُ) آدَمَ إِلَى أَنْ تَقُومَ السَّاعَةُ فِتْنَةً أَعْظَمُ مِنْ فِتْنَةِ الدَّجَّالِ وَقَدْ قُلْتُ فِيهِ قَوْلًا لَّمْ يَقُلْهُ أَحَدٌ قَبْلِي، إِنَّهُ آدَمُ جَعْدٌ مَّمْسُوحُ عَيْنِ الْيَسَارِ عَلَى عَيْنِهِ ظَفْرَةٌ غَلِيظَةٌ وَّإِنَّهُ يُبْرِىءُ الْأَكْمَهَ وَالْأَبْرَصَ وَيَقُولُ: أَنَا رَبُّكُمْ فَمَنْ قَالَ: رَبِّيَ اللهُ فَلَا فِتْنَةَ عَلَيْهِ وَمَنْ قَالَ: أَنْتَ رَبِّي فَقَدِ افْتُتِنَ يَلْبَثُ فِيكُمْ مَّاشَاءَ اللهُ ثُمَّ يَنْزِلُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ مُصَدِّقًا لِّمُحَمَّدٍ ﷺ وَعَلَى مِلَّتِهِ إِمَامًا مَّهْدِيًّا وَّحَكَمًا عَدْلًا فَيَقْتُلُ الدَّجَّالَ»

[1] صحيح ابن حبان: 228/15، حديث: 6817و6778. [2] مسند أحمد: 278/5.

’’اللہ نے جب سے آدم علیہ السلام کو پیدا کیا ہے اس وقت سے لے کر قیام قیامت تک دجال سے بڑھ کر کوئی فتنہ آسمان سے زمین کی طرف نہیں اتارا۔ میں نے اس کے بارے میں ایسی بات کی ہے جو مجھ سے پہلے کسی نے نہیں کی۔ وہ گندمی رنگ، گھونگریالے بالوں والا ہے اور اس کی بائیں آنکھ مسخ شدہ ہے۔ اس کی آنکھ پر موٹے ناخنہ کی بیماری ہے۔ بے شک وہ مادر زاد اندھے اور برص کے مریض کو صحیح کردے گا۔ وہ کہے گا: میں تمھارا رب ہوں۔ جس نے کہا: میرا رب اللہ ہے تو اس کے لیے کوئی فتنہ نہیں اور جس نے کہا: تو میرا رب ہے تو وہ فتنے کا شکار ہو گیا۔ وہ تم میں اس قدر رہے گا جتنا اللہ چاہے گا، پھر عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام نازل ہوں گے، وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کرنے والے اور ان کی ملت پر ہوں گے۔ وہ امام و راہنما اور عادل حاکم بن کر نازل ہوں گے اور دجال کو قتل کریں گے۔‘‘[1]

✽ اوس بن اوس رضی اللہ عنہما نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا:

«يَنْزِلُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ عِنْدَ الْمَنَارَةِ الْبَيْضَاءِ شَرْقِيِّ دِمَشْقَ»

’’عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام دمشق کے مشرقی سفید منارے کے پاس نازل ہوں گے۔‘‘[2]

✽ عمران بن حصین رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«لَا تَزَالُ طَائِفَةٌ مِّنْ أُمَّتِي عَلَى الْحَقِّ ظَاهِرِينَ عَلٰى مَنْ نَاوَاهُمْ حَتّٰى يَأْتِيَ أَمْرُ اللهِ تَبَارَكَ وَتَعَالٰى وَيَنْزِلَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ عَلَيْهِمَا السَّلَامُ»

’’میری امت کا ایک گروہ ہمیشہ حق پر قائم رہے گا اور جو ان سے دشمنی رکھے گا

[1] المعجم الأوسط للطبراني: 293/5، حديث: 4577. [2] المعجم الكبير للطبراني: 217/1، حديث: 590، وتاريخ دمشق: 168/1.

اس پر غالب رہے گا حتی کہ اللہ کا حکم آجائے گا اور عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام نازل ہوجائیں گے۔“[1]

یہ وہ احادیث تھیں جو نزول عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق بیان کی گئی ہیں جو قابل استدلال، صحیح، حسن مقبول مرفوع، متصل حدیثیں ہیں یہ حدیثیں درج ذیل صحابۂ کرام سے مروی ہیں۔

ابو ہریرہ، کیسان، عبداللہ بن عمرو، مجمع بن جاریہ، عائشہ، نواس بن سمعان، حذیفہ بن اسید الغفاری، حذیفہ بن یمان، عبداللہ بن مسعود، سمرہ بن جندب، جابر بن عبداللہ، عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن مغفل، اوس بن اوس، مالک، عمران بن حصین رضی اللہ عنہم اجمعین۔

ان حدیثوں کے علاوہ ان صحابہ سے اس معنی کی اور بھی احادیث مروی ہیں، نیز ان کے علاوہ دیگر صحابہ سے بھی اس معنی کی احادیث مروی ہیں لیکن ہم نے انھیں پر اکتفا کیا ہے۔ اصول حدیث کی بنا پر یہ روایات لفظاً اور معناً متواتر ہیں کیونکہ پھر انھی صحابۂ کرام سے سینکڑوں تابعین اور پھر اتباع تابعین نے یہ روایات نقل کی ہیں۔

اگر ایک حدیث صحیح ہو تو اثبات اور عمل کے لیے وہ ایک ہی کافی ہوتی ہے لیکن جب صحابۂ کرام کی اتنی کثیر تعداد اسے روایت کرے تو پھر کوئی عقل مند شخص اس حدیث کو رد نہیں کرسکتا۔

احادیث عیسیٰ علیہ السلام کے متواتر ہونے کے متعلق علماء کی تصریحات

عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کے متعلق احادیث کے بارے میں علمائے کرام کی تصریح موجود ہے کہ یہ احادیث متواتر ہیں جو کہ مندرجہ ذیل ہیں:

1 امام کتانی فرماتے ہیں:

[1] مسند أحمد: 429/4.

«اَلْحَاصِلُ أَنَّ الْأَحَادِيثَ الْوَارِدَةَ فِي الْمَهْدِيِّ الْمُنْتَظَرِ مُتَوَاتِرَةٌ وَّكَذَا الْوَارِدَةُ فِي الدَّجَّالِ وَفِي نُزُولِ سَيِّدِنَا عِيسٰى عَلَيْهِ السَّلَامُ»

''حاصل یہ ہے کہ مہدی منتظر اوراسی طرح دجال اور سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کے بارے میں واردشدہ احادیث متواتر ہیں۔''[1]

2 ابن کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا:

«ثُمَّ إِنَّهُ رَفَعَهُ إِلَيْهِ وَأَنَّهُ بَاقٍ حَيٌّ وَّأَنَّهُ سَيَنْزِلُ قَبْلَ يَوْمِ الْقِيَامَةِ كَمَا دَلَّتْ عَلَيْهِ الْأَحَادِيثُ الْمُتَوَاتِرَةُ الَّتِي سَنُورِدُهَا إِنْ شَاءَ اللّٰهُ قَرِيبًا»

''اللہ تعالیٰ کا اس (عیسیٰ علیہ السلام) کو اپنی طرف اٹھانے، ان کے باقی اور زندہ رہنے، اور قیامت کے دن سے پہلے اترنے پر متواتر احادیث دلالت کرتی ہیں۔ ہم ان شاء اللہ قریب ہی ان کا ذکر کریں گے۔''[2]

3 امام ابن عطیہ اندلسی فرماتے ہیں:

«وَأَجْمَعَتِ الْأُمَّةُ عَلٰى مَا تَضَمَّنَهُ الْحَدِيثُ الْمُتَوَاتِرُ مِنْ أَنَّ عِيسٰى عَلَيْهِ السَّلَامُ فِي السَّمَاءِ حَيٌّ وَّأَنَّهُ يَنْزِلُ فِي آخِرِ الزَّمَانِ»

''امت کا اس متواتر حدیث پر اجماع ہے جو اس بات کو متضمن ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام آسمان پر زندہ ہیں اور وہ آخری زمانے میں نازل ہوں گے۔''[3]

[1] نظم المتناثر من الحدیث المتواتر، ص: 241، حدیث: 291. [2] تفسیر ابن کثیر: 791/1، النسآء 159:4. [3] المحرر الوجیز: 105/2.

④ ابن حجر رحمہ اللہ نے فرمایا:

«تَوَاتَرَتِ الْأَخْبَارُ بِأَنَّ الْمَهْدِيَّ مِنْ هٰذِهِ الْأُمَّةِ وَأَنَّ عِيسٰى عَلَيْهِ السَّلَامُ يُصَلِّي خَلْفَهُ»

''متواتر احادیث سے ثابت ہے کہ مہدی اس امت سے ہیں اور عیسیٰ علیہ السلام ان کے پیچھے نماز پڑھیں گے۔''[1]

اسی طرح امام ابن جریر،[2] سنوسی،[3] انورشاہ کاشمیری[4] اور دیگر متعدد ائمۂ مفسرین اورائمۂ محدثین کی تصریحات اس بات پر شاہد ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کے متعلق احادیث متواتر ہیں۔ علمائے کرام نے اس بات کی تصریح کی ہے کہ متواتر حدیث کا انکار کفر ہے۔

متواتر احادیث سے ثابت امر کے انکار کا حکم

امام ذہبی رحمہ اللہ نے فرمایا:

«وَلَا نُكَفِّرُ أَهْلَ الْقِبْلَةِ إِلَّا بِإِنْكَارِ الْمُتَوَاتِرِ مِنَ الشَّرِيعَةِ»

''ہم اہل قبلہ کی تکفیر صرف اسی صورت میں کرتے ہیں جب وہ شریعت کے متواتر حکم سے انکار کریں۔''[5]

انورشاہ کشمیری رحمہ اللہ نے بھی اسی طرح بیان کیا ہے[6] اورشیخ طاہر دمشقی رحمہ اللہ نے فرمایا:

''جب حدیث حدتواتر کو پہنچ جائے تو اس حدیث کے متعلق اس کے راویوں پر بحث نہیں کی جاتی بلکہ بحث کیے بغیر اس پرعمل کرنا واجب ہوجاتا ہے۔''[7]

① فتح الباري : 494,493/6. ② جامع البيان : 389/3. ③ إكمال الإكمال : 445/1.
④ إكفار الملحدين، ص : 8. ⑤ الموقظة ، ص : 86. ⑥ إكفار الملحدين ، مقدمة. ⑦ توجيه النظر، ص : 139/1.

احادیث عیسیٰ علیہ السلام کے راویوں پر جرح کا حکم

❀ امام بخاری اور دیگر محدثین رحمہم اللہ نے عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کے متعلق احادیث کو بڑے بڑے محدثین سے نقل کیا ہے۔ جیسے: یعقوب بن ابراہیم، ابن شہاب زہری، سعید بن مسیّب، لیث، یونس، نافع، ہشام، قتادہ، شعبہ، محمد بن زیاد، ابو زناد اور اعرج رحمہم اللہ۔ ان حضرات کے متعلق بعض اشخاص نے جرح کی ہے جیسا کہ رسالے کے مؤلف محمد ہادی نے بھی ان کی اندھی تقلید کی ہے۔ اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ جرح تعدیل پر مقدم ہے۔ ان کے اس قاعدہ وقانون کے بارے میں کچھ وضاحت کی جاچکی ہے لیکن یہاں کچھ تفصیل بیان کی جائے گی تاکہ اس قانون وقاعدہ کے لوگ اپنی تلبیس سے عوام الناس کو گمراہ نہ کرسکیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ جرح تعدیل پر مقدم ہوتی ہے لیکن یہ قاعدہ مطلقاً نہیں ہے بلکہ جرح اس وقت تعدیل پر مقدم ہوگی جب وہ مفسر ہو چنانچہ امام نووی صحیح مسلم کے بعض راویوں پر ضعف کا حکم لگانے والوں کی تردید کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

«لِأَنَّ ذٰلِكَ فِيمَا إِذَا كَانَ الْجَرْحُ ثَابِتًا مُفَسَّرُ السَّبَبِ وَّإِلَّا فَلَا يُقْبَلُ الْجَرْحُ إِذَا لَمْ يَكُنْ كَذَا»

”(یہ نہیں کہا جاسکتا کہ جرح تعدیل پر مقدم ہے) کیونکہ یہ تو اس وقت ہے جب جرح ثابت اور مفسر ہو، ورنہ تو جرح قبول ہی نہیں ہوگی۔ جب تک وہ ثابت اور مفسر نہ ہو۔“ [1]

امیر صنعانی رحمہ اللہ نے فرمایا:

«وَهٰذِهِ الْقَاعِدَةُ لَوْ أُخِذَتْ كُلِّيَّةً لَمْ يَبْقَ لَنَا عَدْلٌ إِلَّا الرُّسُلَ

[1] شرح مسلم للنووي: 47/1.

فَإِنَّهُ مَا سَلِمَ فَاضِلٌ مِّنْ طَاعِنٍ، مِنْ ذٰلِكَ لَا مِنَ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِينَ وَلَا أَحَدٌ مِّنْ أَئِمَّةِ الدِّينِ»

''اگر اس قاعدے کو مطلق طور پر لے لیا جائے تو پھر صرف رسول ہی باقی رہ جاتے ہیں جن پر کوئی جرح نہ ہو کیونکہ کوئی فاضل شخص طعن کرنے والے کے نشتر سے نہیں بچ سکا۔ یہاں تک کہ خلفائے راشدین میں سے کوئی بچا نہ ائمۂ دین میں سے۔''[1]

لکھنوی رحمہ اللہ نے فرمایا:

«قَدْ زَلَّ قَدَمُ كَثِيرٍ مِّنْ عُلَمَاءِ عَصْرِنَا بِمَا تُحَقِّقُ عِنْدَ الْمُحَقِّقِينَ أَنَّ الْجَرْحَ مُقَدَّمٌ عَلَى التَّعْدِيلِ لِغَفْلَتِهِمْ عَنِ التَّقْيِيدِ وَالتَّفْصِيلِ تَوَهُّمًا مِّنْهُمْ أَنَّ الْجَرْحَ مُطْلَقًا أَيُّ جَرْحٍ كَانَ مِنْ أَيِّ مُعَدِّلٍ كَانَ فِي شَأْنِ أَيِّ رَاوٍ كَانَ وَلَيْسَ الْأَمْرُ كَمَا ظَنُّوا»

''ہمارے دور کے بہت سے علماء اس بارے میں لغزش کا شکار ہوگئے کہ جرح تعدیل پر مقدم ہے۔ انھوں نے ایسا اس لیے کہا کہ وہ اس معاملے میں لگائی گئی چند قیود اور تقیید و تفصیل سے غافل رہے اور انھیں وہم ہوا کہ جرح مطلق طور پر مقدم ہے، یعنی جرح جیسی بھی ہو، کسی بھی معدل سے ہو، جس حالت میں ہو اور جس راوی پر ہو، ہر صورت میں جرح تعدیل پر مقدم ہوگی، حالانکہ معاملہ ایسے نہیں جیسے انھوں نے سمجھ رکھا ہے۔''[2]

انھوں نے مزید لکھا ہے: ''بعض اہل جرح و تعدیل کی کسی راوی پر جرح کرنے کی

[1] إرشاد النقاد إلى تيسير الاجتهاد، ص: 46. [2] الرفع والتكميل، ص: 117.

وجہ سے آپ پر واجب ہے کہ آپ اس راوی پر جرح کا حکم لگانے میں جلد بازی کا مظاہرہ نہ کریں بلکہ آپ پر لازم ہے کہ آپ اس معاملے میں تنقیح کریں کیونکہ یہ معاملہ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ آپ کے لیے جائز نہیں کہ آپ ہر جرح کرنے والے کی بات قبول کریں، خواہ وہ کسی بھی راوی کے بارے میں ہو اگرچہ وہ جرح کرنے والا ائمہ میں سے ہی کیوں نہ ہو کیونکہ بسا اوقات ایسے ہوا ہے کہ جرح قبول کرنے سے کوئی مانع پایا جاتا ہے۔ تب جرح کو رد کرنے کے بارے میں حکم دیا جاتا ہے اور اس کی بہت سی صورتیں ہیں جو کتبِ شریعہ کے ماہرین پر مخفی نہیں۔“[1]

سبکی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”آپ یہ بات قبول کرنے سے مکمل طور پر احتیاط کریں کہ ان کا قاعدہ، جرح تعدیل پر مطلق طور پر مقدم ہے بلکہ درست بات یہ ہے کہ جس کی امامت اور عدالت ثابت ہو، اس کی مدح کرنے والے زیادہ اور جرح کرنے والے نادر ہوں اور وہاں یہ قرینہ بھی موجود ہو کہ جرح کا سبب مذہبی عصبیت وغیرہ ہو سکتا ہے تو پھر اس کی جرح کی طرف نہیں دیکھا جائے گا۔ ہم آپ کو بتا چکے ہیں کہ جارح کی جرح ایسے شخص کے بارے میں قبول نہیں ہوگی اگرچہ وہ جرح مفسر ہی کیوں نہ ہو جس کی نیکیاں اس کی معصیت پر، اس کی مدح کرنے والے اس کی مذمت کرنے والوں پر اور اس کا تزکیہ بیان کرنے والے اس کی جرح کرنے والوں پر غالب ہوں، جبکہ وہاں یہ ثبوت بھی ہو کہ عقل اسے تسلیم کرتی ہو کہ صرف مذہبی تعصب یا دنیوی منافست اس کی جرح کا باعث ہے جیسا کہ ہم عصروں میں ایسے ہوتا ہے تو پھر ہم کسی کے بارے میں ایسی جرح کی طرف التفات نہیں کریں گے بلکہ اس کے بارے میں عدالت پر عمل کریں گے۔ اگر ہم نے ایسے نہ کیا اور اس بات کو کھول دیا یا ہم نے مطلق طور پر جرح کو مقدم کر دیا تو پھر ہمارے لیے کوئی

[1] الرفع والتکمیل، ص: 265,264.

امام (جرح سے) سلامت نہیں رہتا کیونکہ ایسا کوئی امام نہیں جس کے بارے میں طعن کرنے والوں نے طعن نہ کیا ہواور ہلاک ہونے والے اس میں ہلاک نہ ہوئے ہوں۔''[1]

امام محمد بن نصر مروزی رحمہ اللہ نے فرمایا:

«كُلُّ رَجُلٍ ثَبَتَتْ عَدَالَتُهُ لَمْ يُقْبَلْ فِيهِ تَجْرِيحُ أَحَدٍ حَتّٰى يُبَيِّنَ ذٰلِكَ عَلَيْهِ بِأَمْرٍ لَّا يُحْتَمَلُ غَيْرُ جَرْحِهِ»

''ہر شخص جس کی عدالت ثابت ہوجائے تو اس کے بارے میں کسی کی جرح قبول نہیں ہوگی حتی کہ اس کے بارے میں تجھے واضح ہوجائے کہ اس کے بارے میں جرح کے علاوہ کوئی اور احتمال نہیں۔''[2]

ڈاکٹر عبدالعزیز نے کہا: ''جب ناقد کے کلام اور امام بخاری و امام مسلم رحمہما اللہ کے کلام میں، کسی بدعتی شخص کے بارے میں کہ جس سے انھوں نے روایت لی ہے، تعارض آ جائے تو اس راوی کے متعلق ان دونوں (امام بخاری اور امام مسلم رحمہما اللہ) کے کلام کو دیگر لوگوں کے کلام پر مقدم کیا جائے گا اوران دونوں کا کلام معتبر ہوگا کیونکہ وہ راویوں کے بارے میں دوسروں سے بہتر جانتے ہیں۔''[3]

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے فرمایا:

«إِذَا كَانَ الْجَارِحُ وَالْمُعَدِّلُ مِنَ الْأَئِمَّةِ لَمْ يُقْبَلِ الْجَرْحُ إِلَّا مُفَسَّرًا فَيَكُونُ التَّعْدِيلُ مُقَدَّمًا عَلَى الْجَرْحِ الْمُطْلَقِ»

''جب اس طرح کی صورت حال ہوتو کہا جائے گا کہ جب جرح کرنے والے اور تعدیل کرنے والے ائمہ میں سے ہوں تو پھر صرف جرح مفسر ہی قبول کی

[1] طبقات الشافعية الكبرىٰ: 188/1، وقاعدة في الجرح والتعديل، ص: 18. [2] تهذيب التهذيب: 241/7. [3] ضوابط الجرح والتعديل، ص: 103.

جائے گی اور تعدیل مطلق جرح پر مقدم ہوگی۔"[1]

زیلعی رحمہ اللہ نے فرمایا:

«وَمُجَرَّدُ الْكَلَامِ فِي الرَّجُلِ لَا يُسْقِطُ حَدِيثَهُ وَلَوِ اعْتَبَرْنَا ذٰلِكَ لَذَهَبَ مُعَظَّمُ السُّنَّةِ إِذْ لَمْ يَسْلَمْ مِنْ كَلَامِ النَّاسِ إِلَّا مَنْ عَصَمَهُ اللهُ تَعَالٰى»

"کسی آدمی پر مجرد کلام اس کی حدیث کو ساقط نہیں کر دیتا۔ اگر ہم اس طرح کریں گے تو پھر سنت کا بہت سا حصہ جاتا رہے گا کیونکہ لوگوں کے کلام سے صرف وہی بچا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے بچایا ہو۔"[2]

امام ابن عبدالبر فرماتے ہیں: "پس ایسی صورت میں اسے اس شرط پر وقف کرنا چاہیے جو ہم نے بیان کی ہے کہ اسے ایسے شخص کے بارے میں کسی کی بات قبول نہیں کرنی چاہیے جس کا عادل ہونا صحیح ثابت ہو، عالم ہونے کے حوالے سے مشہور ہو، کبیرہ گناہوں سے محفوظ ہو، مروت وتعاون کا التزام کرتا ہو، اس کی نیکی و بھلائی غالب ہو، تو ایسے شخص کے بارے میں کسی شخص کا بلا دلیل قول قبول نہیں کیا جائے گا، پس یہی حق اور ان شاء اللہ اس کے علاوہ اور کوئی چیز صحیح نہیں۔"[3]

یہ ساری تفصیل اس لیے بیان کی گئی ہے کہ بعض جاہل لوگ اپنا باطل نظریہ ثابت کرنے کے لیے اور صحیح حدیث کو ضعیف قرار دینے کے لیے اس کلیے کو استعمال کرتے ہیں کہ جرح تعدیل پر مقدم ہے، پس ایسا راوی جو مشہور امام اور محدث ہو تو یہ لوگ اس مذکورہ کلیے کی رو سے حدیث پر تنقید کر کے اس کو ساقط الاستدلال بنا دیتے ہیں جیسا کہ رسالے

① مجموع الفتاوٰی لابن تیمیة: 351/24. ② نصب الرایة: 341/1. ③ جامع بیان العلم: 118/2.

کے مؤلف نے امام بخاری رحمہ اللہ کی سند سے نزول عیسیٰ علیہ السلام کی حدیث کو ضعیف قرار دینے کی کوشش کی ہے۔ درحقیقت یہ لوگ خواہشات نفس کے اتباع کی وجہ سے مسلمانوں کے مسلمہ عقائد میں شکوک و شبہات ڈال کر تفرقہ پیدا کر رہے ہیں۔ نعوذ باللّٰہ من شرورھم.

وَصَلَّى اللهُ تَعَالٰى عَلٰى نَبِيِّنَا مُحَمَّدٍ وَعَلٰى آلِهٖ وَصَحْبِهٖ أَجْمَعِيْنَ.

انکارِ حدیث سے انکارِ قرآن تک

قرآن کریم اور احادیث مقدسہ اسلامی تعلیمات کا سرچشمہ ہیں۔ انگریزوں نے ہندوستان پر قبضہ جمایا تو انھوں نے اپنے سامراجی مقاصد کی تکمیل کے لیے مسلمانوں کے عقائد کو متزلزل کرنے کی کوشش کی۔ اس سلسلے میں انھوں نے جن نام نہاد سکالروں کی کاشت کی، انھوں نے فتنۂ انکارِ حدیث برپا کرنے کی مہم شروع کر دی۔ الحمد للہ! علمائے حق آگے بڑھے۔ انھوں نے قرآن وسنت کے روشن دلائل و براہین سے انگریزوں اور ان کے لے پالک دانشوروں کے سارے حربے بیکار کر دیے اور یوں مسلمانوں کی متاعِ ایمان کو تباہ ہونے سے بچایا۔ ایسے علمائے کبار کی کہکشاں میں فاضل اجل مولانا عبدالسلام رستمی ﷫ کا نام ایک نادر اضافہ ہے۔ انھوں نے اس کتاب میں قرآن و حدیث اور تعامل صحابہ کی روشنی میں سرسید، اسلم جیراج پوری اور غلام احمد پرویز جیسے قلمکاروں کی گمراہ کن تحریروں اور دُور از کار تاویلوں کے بخیے اُدھیڑ دیے ہیں اور یہ حقیقت اچھی طرح اُجاگر کر دی ہے کہ حدیث کا انکار درحقیقت قرآن کا انکار ہے۔ اسلام اطیعو اللّٰہ واطیعوا الرسول کا نام ہے۔ قرآن کے ساتھ ساتھ جب تک صحیح احادیث پر پوری طرح یقین اور عمل نہیں ہوگا، اس وقت تک ایمان کی لذت شناسی نصیب نہیں ہوگی۔ یہ کتاب اسی حقیقت کی ایمان افروز تفسیر اور حجیتِ حدیث کی دل آویز دستاویز ہے۔

ISBN 969574092-8

ریاض • جدہ • شارجہ • لاہور • کراچی
اسلام آباد • لندن • ہیوسٹن • نیو یارک